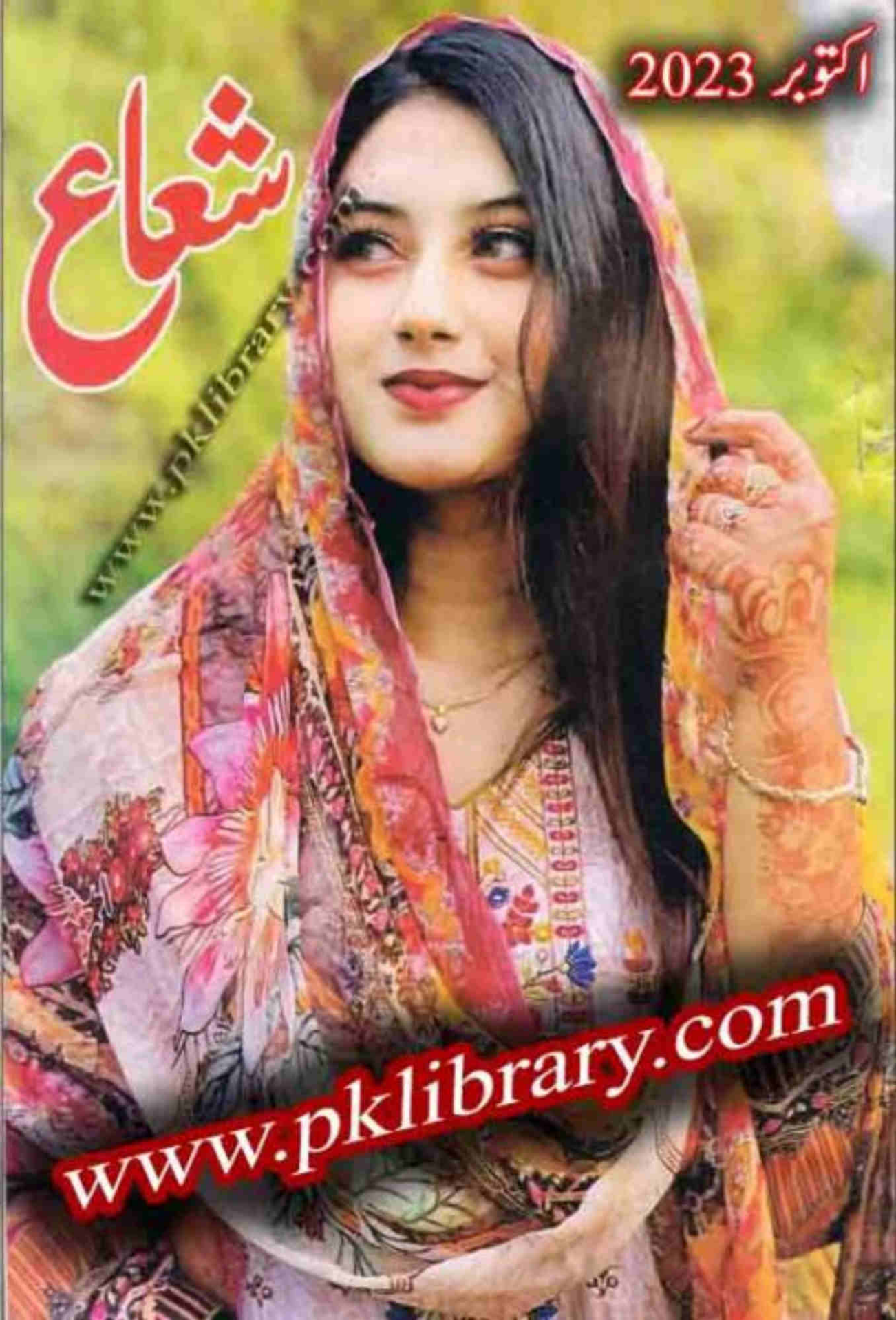
اکتوبر 2023
شعاع
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی — محمود ریاض
مدیر اعلیٰ — آسیہ ریاض
مدیرہ — رخسانہ جمیل
مدیر خصوصی — امت الصبور
فلم/کلچر — شاہین رشید
قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

پہلی شعاع	مدیرہ	6
حمد	حزیں صدیقی	7
نعت	محمد یعقوب غزنوی	7
نبی ﷺ کی باتیں	ادارہ	8

انٹرویو

ثاقب سمیر سے ملاقات	شاہین رشید	18
دستک	شاہین رشید	16
جب تجھ سے نانا	ا۔ب۔ج	13

ناول

والعصر	امت العزیز شہزاد	32

مکمل ناول

شہر شام ہجر	فرح بخاری	121
ماء الملوک	نگہت سیما	150
آپ کا شکریہ	شازیہ جمال طارق	72

ناولٹ

خشک آنکھوں کے آنسو	عنبرین ابدال	197

افسانے

شاہی کوفتے	سنیعہ عمیر	58
خواہش آقا	قرۃ العین خرم ہاشمی	62
کبھی کبھی	حمیرا شفیع	69
صابر اور عطیہ	ریحانہ وقاص	117

pklibrary.com

سبق	رضیہ سید	148
بات ہے گھر کی	جویریہ مریم	52

نفیس غزلیں

غزل	نصیر ترابی	197
نظم	پیر نصیر الدین	197

مستقل سلسلے

خط آپ کے	ادارہ	23
یادوں سے خوشبو آئے	شگفتہ چاہ	200
کھلتا کسی پہ	حبیبہ خان	203
تاریخ کے جھروکے	امۃ الصبور	204
مسکراہٹیں	ادارہ	198
موسم کے پکوان	واصفہ سہیل	208
خوبصورت بنیے	ادارہ	210

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اکتوبر 2023
جلد 37 شمارہ 02
قیمت 150 روپے

واٹس ایپ
03172266944

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے
امریکہ کینیڈا آسٹریلیا یورپ — 25000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

پہلی بات

اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اسلامی سال کے مہینے ربیع الاوّل کا آغاز ہو چکا ہے۔ وہ مبارک ماہ جس میں شافع محشر، باعث تخلیق کائنات خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت نے انسانیت کو شرف عطا کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر فضیلت عطا کی۔ آپ قیامت تک انسانیت کی رہبری کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر دین مکمل کر دیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ محفوظ ہے۔ اور جس رُخ سے بھی دیکھیں تابناک، روشن اور کامل نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خود آپ کے اعلیٰ ترین اخلاق کی تعریف فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ اہل ایمان کے دل آپ کی عقیدت و محبت سے سرشار ہیں۔ ربیع الاوّل کا چاند نظر آتے ہی شہر روشنیوں سے جگمگانے لگتے ہیں۔ گلی، کوچے سج جاتے ہیں، گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں۔ میڈیا پر خصوصی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت کا اظہار ہے لیکن یہ اظہار کافی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت کا صحیح حق اس وقت ادا ہوگا جب اس عقیدت و محبت کا عملی نمونہ پیش کریں گے۔ آپ جس عظیم مقصد کے تحت دُنیا میں تشریف لائے، جو پیغام آپ نے اپنی سیرت طیبہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کی پیروی کریں گے۔

خواتین پر اس سلسلے میں بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ماں کی آغوش اولاد کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اور نبی پاک کے بتائے راستے پر چلنے کی تلقین کریں۔ جس میں سب سے پہلے حقوق العباد کی تلقین کی گئی ہے۔ یہی اصل محبت ہے۔ دُنیا میں سربلندی کا ذریعہ — اور آخرت میں نجات کا راستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- شازیہ جمال طارق کا مکمل ناول۔ آپ کا شکریہ،
- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ ماہ الملوک، ، فرح بخاری کا مکمل ناول۔ شہر شامِ ہجر،
- خشک آنکھوں کے آنسو۔ عنبرین ایدال کا ناولٹ،
- سنیعہ عمیر، قرۃ العین خرم ہاشمی، جویریہ مریم، ریحانہ وقاص اور راضیہ سید کے افسانے،
- معروف فنکار ثاقب سمیر سے ملاقات، ، دستک۔ معروف شخصیات سے گفتگو،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے، جب بچوں سے ناتا جوڑلے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

ادراک کی حد میں ہے نہ محدودِ گماں ہے
محسوس کرے کوئی تو رگ رگ میں رواں ہے

ہاتھوں میں کسی کے تو عناصر کی عناں ہے
کیا خود ہی رواں قافلۂ عمرِ رواں ہے

قائم ہے یہ پانی پہ زمیں کس کے سہارے
یہ زیرِ اثر کس کے جہانِ گزراں ہے

ہے کوہِ گراں کس کی جلالت کی نشانی
یہ جلوۂ گل کس کی لطافت کا نشاں ہے

معلوم نہیں، مجھ کو قضا کیا ہے قدر کیا
ہر سانس مرا تیرے اشارے پہ رواں ہے

کچھ تیرے سوا مجھ کو دکھائی نہیں دیتا
میں ہوں نہ زمیں ہے نہ زماں ہے نہ مکاں ہے

حزیں صدیقی

نعت رسول مقبولؐ

دربارِ مصطفیٰؐ میں جو لے جائے گا خدا
نعتِ رسولِ پاکؐ کا مل جائے گا صلہ

راحت نصیب ہوگی کبھی غم نہ آئے گا
رکھو زباں پہ ورد رسالت مآبؐ کا

روضے پہ اُن کے آکے ملائک پڑھیں درود
بندوں کا یہ شرف کہ ہوئے ان کے ہمنوا

اُن کی عطائے خاص ہے میری سخنوری
حرفوں کے بعد حرف مجھے کر دیئے عطا

کیا ہے مری بساط مگر شان دیکھیے
کہتے ہیں لوگ مجھ کو ثنا خوانِ مصطفیٰؐ

ہم ذکرِ مصطفیٰؐ میں قلم کے غلام ہیں
ذریعہ یہی بنے گا ہماری نجات کا

محمد یعقوب غزنوی

pklibrary.com

امید اور اجل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہ ابن آدم ہے اور یہ اس کی اجل ہے، گدی کے قریب۔'' پھر آگے کو ہاتھ بڑھا کر فرمایا۔ ''اور وہاں تک اس کی امیدیں ہیں.....'' (ترمذی)

فائدہ: انسان کی امیدوں کے مقابلے میں اس کی اجل بہت قریب ہے، لہٰذا اس کے استقبال کی تیاری ضروری ہے۔ دنیا میں مشغول ہو کر آخرت سے غفلت انتہائی نادانی ہے۔

معمولی گناہ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''اے عائشہ! معمولی سمجھے جانے والے گناہوں سے بچنا، اللہ کے ہاں ان کا بھی مواخذہ ہوگا۔'' (احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ بعض گناہ عام لوگوں کی نظر میں معمولی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے ہوتے ہیں مثلاً گالی گلوچ، ہنسی مذاق میں جھوٹ بولنا، مرد کا اپنی شلوار، تہ بند اور پاجامہ، وغیرہ سے ٹخنوں کو چھپا لینا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنا تہ بند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھنا، اگر یہ نہ ہو سکے تو ٹخنوں تک ضرور اونچا رکھنا اور تہ بند کو (ٹخنوں سے نیچے تک) لٹکانے سے بچنا کیونکہ یہ تکبر ہے۔'' (سنن ابی داؤد..... حدیث ۴۸۰۴)

2۔ جو گناہ معاشرے میں عام ہو جائے، عوام کی نظر میں وہ گناہ نہیں رہتا، خواہ کبیرہ ہی ہو۔ علماء کو چاہیے کہ ایسے گناہوں سے خاص طور پر منع کریں اور ان کے بارے میں اسلامی احکام کی وضاحت کریں۔

3۔ جو گناہ واقعتاً صغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی احتیاط ضروری ہے کیونکہ صغیرہ گناہ بہ کثرت کرنے سے مجموعی طور پر گناہوں کی مقدار بہت زیادہ ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صغیرہ گناہوں کی پروانہ کرنے سے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی جرات پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے ان سے بھی اجتناب ہی بہتر ہے۔

توبہ میں جلدی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے، باز آجائے اور (اللہ سے) بخشش کی درخواست کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر مزید گناہ کرے تو سیاہی کا نقطہ زیادہ ہو جاتا ہے (حتیٰ کہ ہوتے ہوتے دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔) یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (اس فرمان میں) کیا ہے۔

ترجمہ: یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے

pklibrary.com

اعمال کی وجہ سے زنگ پڑ گیا ہے۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ گناہ ہو جائے تو جلد سے جلد توبہ کرنی چاہیے تاکہ دل پاک صاف ہو جائے۔

2۔ گناہوں کی وجہ سے دل سیاہ ہو جانے کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ نیکی سے محبت اور گناہ سے نفرت ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔

3۔ روحانی بیماریوں کا علاج اللہ کی یاد، قرآن کی تلاوت، توبہ و استغفار اور موت کی یاد ہے۔

نیکیاں غبار میں تبدیل

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں اپنی امت کے ان افراد کو ضرور پہچان لوں گا جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید (روشن) نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ عزوجل ان (نیکیوں) کو بکھرے ہوئے غبار میں تبدیل کر دے گا۔" (طبرانی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "اللہ کے رسول ان کی صفات بیان فرما دیجیے۔ ان (کی خرابیوں) کو ہمارے لیے واضح کر دیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں شامل ہو جائیں اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔" آپ نے فرمایا۔

"وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہاری جنس سے ہیں اور رات کی عبادت کا حصہ حاصل کرتے ہیں جس طرح تم کرتے ہو۔ لیکن وہ ایسے لوگ ہیں کہ انہیں جب تنہائی میں اللہ کے حرام کردہ گناہوں کا موقع ملتا ہے تو ان کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ بہت سے گناہ نیکیوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔

2۔ لوگوں کے سامنے نیک بنے رہنا اور تنہائی میں گناہ کا ارتکاب بے تکلف کر لینا، یہ بھی ایک قسم کی منافقت ہے جس کی وجہ سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

3۔ تہجد پڑھنا بڑی نیکی ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری تنہائی میں تقویٰ پر قائم رہنا ہے۔

4۔ اصل تقویٰ یہی ہے کہ انسان اس وقت بھی گناہ سے باز رہے جب اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔

5۔ نیکیوں کو غبار میں تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول نہیں فرمائے گا، اس لیے وہ بے وزن ہو جائیں گی اگرچہ دیکھنے میں وہ پہاڑوں جیسی عظیم اور سفید ہوں۔

تقویٰ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"کون سا عمل سب سے زیادہ (لوگوں کو) جنت میں داخل کرے گا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے فرمایا۔ "تقویٰ اور خوش اخلاقی۔"

سوال کیا گیا "کون سی چیز سب سے زیادہ (لوگوں کو) جہنم میں لے جائے گی؟"

فرمایا "دو کھوکھلی چیزیں منہ اور شرم گاہ۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ تقویٰ اللہ سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے کا نام ہے اور خوش اخلاقی انسانوں پر ظلم و زیادتی کرنے سے اور برا سلوک کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اس طرح تقویٰ سے حقوق اللہ صحیح ادا ہوتے ہیں اور خوش اخلاقی سے حقوق العباد۔ ان دونوں کی ادائیگی یقیناً جنت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

2۔ منہ کے گناہوں میں حرام رزق کھانا بھی ہے جس کی وجہ سے نیکیاں قبول نہیں ہوتیں اور زبان کے گناہ بھی، مثلاً جھوٹ، غیبت، گالی گلوچ

pklibrary.com

وغیرہ جن سے لوگوں میں فساد پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے گناہ بڑے گناہ ہیں۔

3۔ شرم گاہ کا گناہ زنا ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور معاشرے میں بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہے۔ زبان کے گناہ (غیر محرم سے ناجائز بات چیت وغیرہ) آنکھ کے گناہ (نامحرم کو دیکھنا) ہاتھ کے گناہ (نامحرم کو چھونا، یا خط وغیرہ لکھنا اور فون کرنا) وغیرہ سب اسی بڑے گناہ کے لیے کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

4۔ منہ اور شرم گاہ کے گناہوں سے بچنے والے کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسرے گناہوں سے بھی بچ جائے گا اور جنت میں چلا جائے گا۔

توبہ کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی اپنی گم شدہ سواری پا کر خوش ہوتا ہے۔''

فوائد و مسائل:۔

1۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2۔ بندے کو جب احساس ہو جائے کہ اس نے گناہ کیا ہے، خواہ وہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، براہ راست اللہ کے آگے توبہ کرے، یعنی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے آئندہ کے لیے یہ عزم اور وعدہ کرے کہ وہ اس گناہ سے بچ کر رہے گا۔

3۔ توبہ اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہیں، البتہ کسی نیک عالم آدمی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے نیکی کا عزم کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان اس عالم کی شرم سے گناہ سے بچتا ہے، پھر براہ راست اللہ کی شرم سے گناہ سے بچنے کی توفیق مل جاتی ہے، تاہم یہ ضروری نہیں۔ تنہائی میں توبہ کر کے اللہ سے استقامت کی دعا کرے تو کافی ہے۔

4۔ جس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس کے ارتکاب کی صورت میں وہ حق ادا کرنا یا صاحب حق سے معاف کروانا ضروری ہے ورنہ توبہ مکمل نہیں ہوگی۔

توبہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں، پھر توبہ کرو تو (پھر بھی اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔)''

فوائد و مسائل:۔

1۔ یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کر لے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں، وہ معاف نہیں ہوں گے، البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

ندامت

حضرت عبداللہ بن معقل رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ ''میں اپنے والد (حضرت معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے انہیں سنا، وہ کہہ رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ندامت توبہ ہے۔''

میرے والد صاحب نے ان سے کہا۔ ''کیا آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ

pklibrary.com

راست) سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ندامت توبہ ہے؟''
انہوں نے کہا۔ ''ہاں۔''
فوائد و مسائل:۔
1۔ندامت توبہ کا اہم جزو ہے۔
2۔عالی سند کی طلب مستحسن ہے۔
3۔اگر کسی چیز میں شک ہو تو استاد سے دریافت کر لینا احترام کے منافی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''بے شک اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا رہتا ہے جب تک نزع کا عالم طاری نہ ہو۔'' (ترمذی)
فوائد و مسائل:۔
1۔نزع سے مراد روح قبض کرنے کا عمل شروع ہونا ہے۔
2۔جب موت کے فرشتے ظاہر ہو جاتے ہیں تو عالم آخرت سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس لیے توبہ کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔
3۔بندے کو چاہیے کہ جلد از جلد توبہ کرلے، معلوم نہیں کب آخری وقت آ جائے۔

گناہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ اس نے ایک (اجنبی) عورت کا بوسہ لے لیا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس گناہ کا کفارہ دریافت کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔

ترجمہ: ''دن کے کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز قائم کیجیے۔ بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں..... یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔''
اس آدمی نے کہا۔
''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ (رعایت) میرے (ہی) لیے ہے؟''
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''یہ میری امت کے ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس پر عمل کرے۔''

فوائد و مسائل:۔
1۔بعض گناہ دوسرے گناہوں سے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا گناہ ہوگا اس کی معافی کے لیے اتنی بڑی نیکی کی ضرورت ہے۔
2۔وہ شخص اپنے گناہ پر نادم تھا اور اس کی معافی کے لیے ہر کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا، اس وجہ سے وہ گناہ نماز کی برکت سے معاف ہو گیا۔ جو شخص نادم نہ ہو، گناہ کو معمولی سمجھے، اس کا چھوٹا گناہ بھی بڑا ہو جاتا ہے۔
3۔آیت کی شان نزول سے اس کا مطلب اور مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت میں مذکورہ حکم امت کے سب افراد کے لیے ہوتا ہے۔
4۔گناہ ہو جائے تو فوراً کوئی نیکی کرنی چاہیے، مثلاً نفل نماز پڑھ کر گناہ کی معافی کی دعا کرے، یا صدقہ خیرات کرے یا کوئی اور نیکی کرے جو اس گناہ کی معافی سے مناسبت رکھتی ہو، مثلاً ذکر اذکار تلاوت اور نفلی روزہ وغیرہ۔

اللہ کا خوف

امام زہری رحمۃ اللہ نے اپنے شاگرد معمر سے فرمایا ''کیا میں تجھے دو عجیب حدیثیں نہ سناؤں؟''
(پہلی حدیث یہ ہے جو) حمید بن عبدالرحمن نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''ایک آدمی نے اپنی جان پر زیادتی کی (اور زندگی میں بہت گناہ کیے) جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے

ہوئے کہا۔ جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر مجھے (میری لاش کو) پیس کر مجھے (میری راکھ کو) ہوا میں اڑا دینا اور سمندر میں بہا دینا۔ قسم ہے اللہ کی! اگر اللہ نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہیں دیا ہوگا۔"

ان بیٹوں نے ایسے ہی کیا۔

اللہ نے زمین سے کہا۔ "جو تو نے لے لیا ہے حاضر کر دے (ایسے ہی سمندر سے بھی اس کی راکھ کے ذرات جمع کر کے اسے زندہ کر دیا) اچانک وہ (زندہ سلامت) کھڑا تھا۔

اللہ نے اس سے فرمایا۔ "تو نے جو کام کیا ہے، اس پر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا۔"

اس نے کہا۔ "میرے رب! تیرے خوف نے۔"

"اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے اسے معاف کر دیا۔"

جانوروں سے سلوک

امام زہری رحمۃ اللہ نے (دوسری حدیث بیان کرتے ہوئے) فرمایا اور مجھے حمید بن عبدالرحمٰن نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں چلی گئی۔ اس نے اسے باندھ دیا تھا، نہ اسے کچھ کھانے کو دیا، نہ اسے چھوڑا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی حتیٰ کہ وہ (بھوک سے) مر گئی۔"

امام زہری رحمۃ اللہ نے فرمایا (میں نے یہ دو حدیثیں اس لیے سنائی ہیں) تاکہ کوئی (اپنی نیکیوں پر) بھروسا نہ کرے اور کوئی (اللہ کی رحمت سے) مایوس نہ ہو۔

فوائد و مسائل:۔

1۔ انسان کو اللہ کی رحمت کی امید کے ساتھ ساتھ اللہ کے عذاب سے خوف بھی رکھنا چاہیے۔

2۔ محدثین کی فقاہت صرف اختلافی فروعی مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ ایمان، اخلاق اور عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

3۔ اپنی لاش جلانے اور اس کی راکھ اڑانے کی وصیت کرنے کی وجہ موت کے وقت خشیت کی کیفیت کا غلبہ تھی، اس لیے اس کی یہ غلطی بھی معاف ہوگئی کہ اس نے نامناسب وصیت کی۔

4۔ اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو زندہ کیے بغیر روح سے بھی سوال کر سکتا تھا لیکن اس کو اللہ نے اپنی قدرت اور سطوت کا مشاہدہ کروا دیا۔

5۔ قبر کے عذاب اور نعمت سے مراد وہ تمام حالات ہیں جو موت کے بعد قیامت تک پیش آئیں گے۔ یہ حالات ہر شخص کو پیش آتے ہیں، خواہ اسے دفن کیا جائے یا اسے جنگلی جانور یا مچھلیاں کھا جائیں یا اس کی خاک سیاہ کر کے اس کے ذرے بکھیر دیے جائیں یا اس کی راکھ کو کسی برتن میں محفوظ کر لیا جائے یا اس کی لاش محفوظ ہو جسے لوگ دیکھ رہے ہوں۔

6۔ عذاب قبر کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس لیے زندہ انسان اس کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔

7۔ کسی بھی جان دار چیز پر ظلم کرنا بہت بڑا گناہ ہے، خاص طور پر ایسا ظلم جس سے جان دار ایک ہی بار مر جانے کے بجائے تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مرے۔

8۔ پالتو جانوروں کی ضروریات کا خیال رکھنا فرض ہے بلکہ ایسے جانور جو کسی کے پالتو نہیں، ان پر رحم کرنے سے بھی اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے، جیسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے گناہ گار انسان کی مغفرت ہوگئی تھی۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ا، ب، ج

بہر حال شکریہ کہ ایسا موقع دیا کہ ہم بھی خود کو تلاش کرنے نکلے تو آیئے ہم بھی حال دل کچھ سنائیں کہ کوئی سننے والا عرصے بعد ملا ہے۔

جو اک بار تم آ جاؤ
تو اپنے سب آنسو
تم سے مل کر
بہا دوں گی
اور پھر بالکل اس طرح ہو جاؤں گی جس طرح
اپنے جنم کے دن
تمہارے بازوؤں میں تھی

س:۔ شادی کب ہوئی؟

ج:۔ شادی کب ہوئی۔ ہک ہاہ کوئی زیادہ پرانی بات تو نہیں مگر لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئیں اب تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔ 2010ء میں ہم مس سے مسز ہو گئے۔

س:۔ شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

ج:۔ شادی سے پہلے کیونکہ فرصت کے لمحات تھے اور ہم تھے موج مستی اور ڈھیر ساری خوشیاں، ہر ذمہ داری سے آزاد، کیونکہ گھر میں سب سے چھوٹے تھے تو مطالعہ، ریڈیو، ٹی وی شام میں پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کے ساتھ مختلف گیم کھیلنا بلکہ باجی (جیٹھانی) مذاق اڑاتی ہیں کہ شہلا جب جاؤ ریڈیو لگا کر ڈائجسٹ پڑھتی ہوئی ملتی تھی۔ بس یہی زندگی اور اس کی خوب صورتی تھی، اب تو سب کچھ قصہ پارینہ لگتا ہے۔

س:۔ شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی؟

ج:۔ ہم لوگ گاؤں میں رہتے ہیں جہاں مرضی وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے، لڑکوں سے کوئی نہیں پوچھتا ہم تو خیر سے لڑکیاں ہیں۔ دوسرے ہم خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے، اس لیے یہ پوری ارینج میرج تھی، بزرگ اس لیے نہیں کہہ رہی کہ میرے گھر میں بزرگ کوئی نہیں۔ ابو نہیں ہیں اور امی کو اس دن پتا چلا جس دن وہ لوگ تاریخ لینے آئے، بلکہ مزے کی بات میری امی کو شادی والے دن تک، پتا ہی نہیں تھا کہ ان کا داماد کون ہے، جبکہ پھپھو اور ماموں کو بزرگ کہنا ہی عجیب ہے۔ میری پھپھو (ساس) اور ماموں (سسر) ہم سے زیادہ جوان لگتے ہیں تو بات فیصلے کی تھی۔ بھائی لوگوں نے کہا کہ ابو نہیں ہیں تم لوگ اپنے گھر کی ہو جاؤ ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں۔ اس لیے ہم نے سر جھکا دیا۔

س:۔ ذہن میں جیون ساتھی کے بارے میں کیا تصور تھا؟

ج:۔ ارے یار! کچھ بھی نہیں، سچ کہیں تو ہم اپنی زندگی سے اتنے مطمئن اور خوش تھے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور ہم اس گھر کو چھوڑ دیں گے، اس میں سارا کریڈٹ ہماری امی کو جاتا ہے۔ ابو کی ڈیتھ میرے پیدائش کے سال بعد ہوگئی تھی۔ میری امی اتنی سخت تھیں کہ کبھی کسی کزن کا ہمارے گھر آنا ہوا ہی نہیں، نہ عام ماؤں کی طرح انہوں نے شادی کے لیے واویلا مچایا، اس لیے ہم نے یہ ساری خوبیاں خامیوں والا تصور نہ کیا، نہ ہی ایسی بات سوچی لہٰذا راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

س:۔ منگنی کتنا عرصہ رہی؟ فون پر کوئی بات، ملاقات وغیرہ؟

ج:۔ میں نے بتایا نا کہ گاؤں کا ماحول، سو منگنی وغیرہ کچھ نہیں بس ڈائریکٹ شادی، پندرہ دن کے اندر اندر شاپنگ، شادی، ولیمہ سب کچھ دی اینڈ۔ رہی بات فون یا ملاقات کی تو میرے میاں صاحب شادی سے پہلے، ہم سے بہت ڈرتے تھے (بھئی خوب غصہ والے مشہور تھے ہم) اتنی جرات تو کر نہیں سکتے تھے (آہم)

س:۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

ج:۔ کچھ عجیب سا ریلیشن شپ، آپ تن من وار دو تو بھی اپنے نہیں، بڑی باجی کی شادی ماموں کے گھر ہوئی تھی۔ ماموں، مامی اور کزنوں کے رویے آئے دن کے

pklibrary.com

جھگڑے، باجی کا روتے ہوئے آنا۔ سونے پر سہاگہ بہنوئی ملک سے باہر تھے تو باجی کافی مشکل حالات میں رہیں اور بالآخر، دو سال بعد الگ ہوگئیں۔ مختصر ایک جن ہے سسرال جو بہت ہی خوف ناک ہے۔

س:۔ شادی کے لیے تعلیم کی یا اپنے خوابوں کی قربانی دینا پڑی؟

ج:۔ تعلیم تو نہیں مگر مجھے میری بہن چھوڑنی پڑی۔ میری دونوں باجیاں دیورانی، جیٹھانی ہیں مجھے جنم میری ماں نے دیا تھا لیکن پالا باجیوں نے تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں ان کے بغیر رہوں گی۔ میری شادی سے تین ماہ پہلے غزالہ باجی کی شادی ہوئی تھی اور وہ تین ماہ، میں نے دن رات روتے گزارے کہ بھائی اور بھابیاں پریشان ہوگئے اور میں شدید بیمار اور آج یہ حال ہے کہ ایک ہی گاؤں میں ہوتے ہوئے، مہینے سے اوپر ہو جاتا ہے ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے، میرے سسر اور ان کے سسر بھائی ہیں۔ ان کے آپس میں اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے۔ فرصت ملے تو امی کے گھر آ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ حقیقت میں میرے لیے سب سے بڑا اور مشکل کام یہی ہے جس میں ہر لمحہ اپنی بہنوں اور بھانجے، بھانجیوں کو یاد کرتی ہوں اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھیں۔ (آمین)

س:۔ شادی بخیر و خوبی ہوئی یا کوئی بدمزگی؟

ج:۔ ایسا کچھ نہیں ہوا مہندی، مایوں کی رسم مجھے پسند ہی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے یہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ باجی نے بھائیوں سے کہا۔ شکر کرو شادی کے لیے مان گئی ہے۔ اس لیے باقی کی اس کی مان لو حالانکہ امی نے کافی شور کیا۔ کنواری لڑکی کی مہندی ضرور ہونی ہے مگر میری ضد کے آگے، سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے جبکہ بارات والے دن، چونکہ سب اپنے ہی تھے تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا بدمزگی والا جسے لکھا یا یاد رکھا جائے۔

س:۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج:۔ ارے دوستوں! مت پوچھو۔ کچھ بھی رومانٹک نہیں تھا۔ بقول پھپھو (ساس) کہ پورا گھنٹہ میری منت کی کہ میرے ساتھ کمرے میں چلیں (ہاہاہا) جب پھپھو نے مذاق اڑایا تو کہنے لگے "امی! وہ غصے میں ہے۔"

بہر حال اپنے گھر اور ہمارے گھر کے حالات کا لمبا چوڑا موازنہ کرنے کے بعد بولے۔

"یہ کیا فضول سا رنگ پہنا ہے۔ آئندہ مت پہنیے گا۔"

اور جناب! ہم جنہوں نے پوری زندگی میں پہلی دفعہ سرخ رنگ پہنا تھا۔ ہونق ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگے اب مت پوچھیے کیا کیا تائیں گے۔

س:۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

ج:۔ کچھ خاص نہیں، ہم آج تین بچوں کی اماں جان بن کر بھی اتنے ہی اسمارٹ ہیں جتنے پہلے تھے۔ مذاق کے علاوہ غصے کو کنٹرول کر رہے ہیں برداشت کا مادہ آ گیا۔ کچھ ذمہ دار ہو گئے ہیں اور بہت بہت زیادہ کنٹرول کرنے کی عادت ڈال رہے ہیں۔ یہ سب کچھ شعاع اور خواتین کی وجہ سے ممکن ہے شکریہ شعاع و خواتین۔

س:۔ شادی کے کتنے عرصہ بعد کام سنبھالا؟

ج:۔ دوسرے دن ولیمہ تھا اور تیسرے دن صبح کے ناشتے کے بعد، میں نے اور باجی نے جو مشین لگائی تو شام سات بجے بند کی۔ ساتھ صفائی، دوپہر کا کھانا اور باقی کام بھی جاری رہے۔ اصل میں ہماری ننداکلوتی تھی، چار بھائیوں کی اک واک بہن اور ان لوگوں نے تین شادیاں کی تھیں، دو بھائی اور ایک بہن۔ ایک دن پہلے بڑے بھائی کی بارات، دوسرے دن ہماری اور اگلے دن ولیمہ اور نند کی رخصتی۔ لہٰذا ولیمہ کے بعد خود بخود سارے کام کرنا شروع کر دیتے تھے کہ پھپھو کو بیٹی کی کمی محسوس نہ ہو۔

س:۔ میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

ج:۔ ارے نہیں مابدولت کو کنگ ایکسپرٹ تھے۔ لہٰذا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ہاں مگر یہ لوگ صرف گوشت کھاتے ہیں تو کبھی کبھی میں چڑ جاتی ہوں پکا پکا کر، اس لیے ان سے الجھ پڑتی ہوں۔ کچھ خاص نہیں

کیونکہ پھپھو، ماموں کا گھر تھا اس لیے سب خاصے فرینک تھے۔ خاص طور پر عادل (چھوٹا دیور) اللہ اسے کامیاب کرے اور زندگی دے) سیٹ ہونے اور میکے کو بھولنے میں بہت ساتھ دیا، ورنہ مجھ جیسی لڑکی جو اپنے گھر والوں کے بغیر سانس بھی نہیں لیتی تھی کے لیے شکریہ میرے بھائی (عادل) خوش رہو۔

س:۔ سسرال میں کس بات پر تعریف ہوئی۔

ج:۔ ہر کام بہت جلد اور تیزی سے کرتی ہو اور کوکنگ اچھی اور جلدی کر لیتی ہو جبکہ میاں جی یا پھپھو کسی بات پر کچھ کہہ دیں تو موڈ آف اور کھانا پینا چھوڑ دیا اس بات پر بہت تنقید ہوتی ہے، غلطی میری بھی نہیں ہے اصل میں گھر کی چھوٹی لاڈلی بیٹی تھی ہر ضد ہر فرمائش پوری ہو اس لیے تھوڑی موڈی تھی۔ چھوٹی سی بات برداشت کرنا مشکل ہے لہٰذا گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

تعریف:۔ میری بھانجی ہر کام پانچ منٹ میں مکمل کر لیتی ہے بیٹر تھی (تیز کام کرنے والی)

تنقید:۔ توبہ تم میں برداشت نام کی نہیں۔

س:۔ سسرال میں آپ کو وہ مقام ملا جو آپ کا حق تھا؟

ج:۔ شاید دیا ہے ہم لڑکیاں کبھی خوش نہیں ہوتیں میرے خیال میں سب کچھ پرفیکٹ نہیں ہوتا لہٰذا کچھ نہ کچھ کمپرومائز تو کرنا پڑتا ہے نا۔ جہاں تک رائے کا تعلق ہے میری کوشش ہوتی ہے میں کسی معاملے میں نہ بولو اور نہ ہی رائے دوں لہٰذا اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہوں گی۔

س:۔ سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج:۔ شاید ففٹی ففٹی پرسنٹ، میں نے کہا نا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کمپرومائز کرنا پڑتا ہے تو اچھی گزر رہی ہے۔

س:۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج:۔ عبیرہ میری بڑی بیٹی شادی کے 9 ماہ بعد پیدا ہوئی کیونکہ بہت ینگ ایج تھی تو کوئی مشکل، کوئی تکلیف محسوس نہیں کی، بلکہ چوتھے مہینے میں عمرہ بھی کر آئے لیکن ابھی ایک ماہ پہلے چھوٹی بیٹی، ایصال کی پیدائش پر کمزوری، اوپر سے دیور کی شادی تب جانا کہ واقعی ماں بننا مشکل اور تکلیف دہ عمل ہے، اللہ ہر ایک کی مشکل آسان کرے اور میاں میرے اللہ کے بندے بقول ان کے "ہر عورت ماں بنتی ہے۔ تم کوئی انوکھا کام کر رہی ہو" پہلے تو نہیں مگر اس دفعہ کافی حساس ہو گئی تھی لہٰذا رونا شروع کر دیتی۔ ہاں سسرال والے کافی کوآپریٹو رہے خاص طور پر ماموں (سسر) اور عادل (دیور) اتنا خیال رکھتے ہیں کہ شرمندگی ہونے لگی ہے۔ میرے بچے کیونکہ اپنے ددھیال کے پہلے بچے تھے اس لیے سب کی ہتھیلی کا چھالہ بنے رہے۔ میں نے بھی اتنی پرواہ کی اس معاملے میں سب کا بہت شکریہ ویسے بھی عبیرہ تو ہمیشہ دادی اور ابو (عادل) کا دم چھلہ بنی رہی۔

س:۔ جوائنٹ فیملی سسٹم یا علیحدہ رہنا چاہیے؟

ج:۔ چونکہ میں خود جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں اس لیے میں تو اس کی فیور کروں گی۔ ہماری تنہا الگ ہے تو وہ کافی تنگ ہے۔ دو چھوٹے بچے، گھر کا کام ہمارے ہاں ایک بچے سنبھالتا تو دوسرا کام کرتا ہے۔ ہاں کچھ پرابلم بھی ہوتی ہیں مگر کہتے ہیں کہ ماں بیٹیاں بھی آپس میں الجھ پڑتی ہیں تو سسرال پھر سسرال ہے۔ بندہ اپنا ظرف تھوڑا بڑا کر لے تو زندگی میں ایک اسٹیج پر آپ خود بخود ہی الگ ہو جاتے ہیں تو بہتر یہی ہیں کہ آپ خوش گوار یادوں کے ساتھ ایسا کریں اور بڑوں کی دعاؤں کے ساتھ، باقی ہر اک کی اپنی سوچ ہے میں ایک رائے دے رہی ہوں کسی کو اختلاف ہے تو سوری۔

س:۔ سسرال اور میکے کے ماحول میں فرق؟

ج:۔ اس سوال پر تھوڑا سوچنا پڑا کیونکہ سچ میں سگی پھپھو اور ماموں کا گھر ہونے کے باوجود میرے خیال میں، اپنی شادی سے سات سال پہلے تک میں ان کے گھر نہیں آئی۔ یہی وجہ تھی کہ بارات سے اگلے دن جب میں کمرے سے باہر نکلی تو سمجھ ہی میں نہ آئے کہ کدھر کو جاؤں، کیونکہ ہمارا گھر کافی بڑا تھا۔ پہلے ایک پورشن، اب ہماری شادی پر مزید دو پورشن کا اضافہ ہوا جو میری غیر موجودگی میں بنے۔ یہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے گھر کا ماحول مجھے معلوم نہیں میری کوشش کا تو پتا نہیں، ہاں مگر سچ یہ ہے کہ ہمارا گھرانہ بہت خوش گوار اور پرسکون گھرانہ ہے، اللہ نظر بد سے بچائے۔ (آمین)

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ماہ نور ملک

"کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کہاں غائب ہو ڈرامہ سیریل میسنی کے بعد اسکرین پر نظر ہی نہیں آتیں؟"

"بس اتفاق ہے اور اتفاق بھی یوں کہ ڈراموں کی شوٹ چل رہی ہیں۔ اب وہ مکمل ہوں گے تو نظر آؤں گی۔"

"اور وہ مکمل کب ہوں گے؟"

"بہت جلد ..... لیکن ان کے بارے میں بتاؤں گی نہیں کہ کچھ پتا نہیں کہ کب مکمل ہوں کب آن ایئر ہوں۔ نام بھی بدلتے رہتے ہیں تو بس آپ انتظار کریں۔"

"اب تک کتنے ڈرامے کر چکی ہو تم؟"

"زیادہ نہیں کیے ابھی نئی ہوں، اس فیلڈ میں بس دو چار ڈرامے کیے ہیں اور ایک فلم کی ہے۔ فلم کا نام تو "تھوڑی سینگ تھوڑا پیار" ہے اور ڈرامے تین کیے ہیں کچھ اب آنے والے ہیں۔"

"شہرت تو تمہیں ڈرامہ سیریل میسنی نے دی..... ایسا ہی ہے نا؟"

"جی ..... جی بالکل ایسا ہی ہے۔ اس سیریل نے مجھے بہت زیادہ پہچان دی۔ اب اگرچہ سیریل ختم ہوئے تقریباً آٹھ ماہ ہو گئے ہیں پھر بھی لوگوں کو میں یاد ہوں۔ مجھے تو امید بھی نہیں تھی کہ مجھے اس سیریل سے اتنی پہچان مل جائے گی۔"

"پرانے زمانے میں خواتین آرٹسٹ اپنے اصلی نام سے فلم اور ٹی وی انڈسٹری میں نہیں آتی تھیں۔ تم آج کل کی آرٹسٹ ہو۔ تم کیوں نام بدل کر آئیں؟"

"میرا اصلی نام تو کشف نور ہے۔ اور اس فیلڈ کے لیے نام نہیں بدلا بلکہ سب مجھے ماہ نور کے نام سے بلاتے تھے اور ہیں تو بس پھر یہی نام کا من ہو گیا۔ اس فیلڈ میں بھی یہی نام لکھوایا۔"

"بہت چھوٹی لگتی ہو۔ کیا عمر ہو گی تمہاری؟"

"جی، میں 10 جون 2000ء میں پیدا ہوئی اب آپ خود سوچ لیں کہ کتنے سال کی ہوں۔ ویسے یہ تو ہے کہ میں اصل میں کم لگتی ہوں۔ اچھی بات ہے نا۔"

"ہاں ..... کیوں نہیں بہت اچھی بات ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

"میں آپ کو بتاؤں کہ ہم تین بہنیں ہیں اور میں گھر میں چھوٹی ہوں۔ کسی کو بھی شوق نہیں اس فیلڈ میں آنے کا صرف میرا شوق تھا۔ اور میں آ گئی

pklibrary.com

-میری امی کی بھی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی یعنی میں اس فیلڈ میں آؤں۔ چنانچہ اپنے شوق اور امی کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس فیلڈ میں آئی۔ میری شہرت سے اور میرے کام سے میری امی بہت خوش ہیں۔"

"میسنی میں تو تمہارا رول تھوڑا پوزیٹو، تھوڑا نگیٹو تھا۔ تو اس طرح کے رول چلیں گے؟"

"مجھے ہر طرح کے رول کرنے ہیں خواہ وہ فل پوزیٹو ہوں یا فل نگیٹو مجھے تو کام کرنا ہے اور بہت اچھا اچھا کام کرنا ہے۔ تا کہ جب لوگ مجھے دیکھیں تو ضرور کہیں کہ اب کچھ اچھا دیکھنے کو ملے گا۔"

"اگر اس فیلڈ میں کامیاب نہ ہوتیں تو دوسرا آپشن کیا ہوتا؟"

"مجھے کوکنگ سے بہت لگاؤ ہے تو پھر دوسرا آپشن شیف بننا ہوتا...... کیونکہ مجھ سے بے کار نہیں بیٹھا جاتا۔"

سید عارض الدین احمد

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"آج کل اسکرین پر نظر نہیں آ رہے؟ آرام کر رہے ہیں کیا؟"

"ارے نہیں کام سے ہی تو زندگی ہے۔ آپ ایک نجی چینل دیکھیں اس میں میرا ڈرامہ "شناس" دیکھیں۔ میں آپ کو نظر آ جاؤں گا۔"

"آج کل ایک نئے چینل کے بڑے چرچے ہیں۔ سب ہی کا رخ اس طرف ہے؟ کیا پے منٹ اچھی ملتی ہے؟"

"اس لیے وہاں سب کا رجحان ہے کہ ایک تو ان کی کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ پھر یہ بھی سچ ہے کہ وہ پے منٹ بھی اچھی کرتے ہیں۔"

"نئے چینل سے "شناس" آن ایر ہے...... اور دیگر چینلز سے؟"

"دیگر چینلز سے فی الحال کچھ نہیں آ رہا۔ البتہ ایک اور چینل کے کچھ پروجیکٹس پر کام ہو رہا ہے۔

لیکن ان کی تیاری میں ابھی تھوڑا ٹائم لگے گا۔"

"عارض آپ کا رنگ خواتین کی طرح گورا چٹا ہے۔ عجیب سا تو لگتا ہوگا؟"

ہنستے ہوئے۔ "اصل میں مجھے یورپ میں پیدا ہونا چاہیے تھا مگر میں یہاں پیدا ہو گیا اور یہاں مردوں کے سانولے رنگ کو پسند کیا جاتا ہے۔ میرے تو ہونٹ بھی اتنے گلابی ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ آپ نے ہی کہا تھا کہ لگتا ہے میں شوٹ کے وقت لپ اسٹک لگاتا ہوں۔ جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"ٹی وی میں آمد کیسے ہوئی تھی؟"

"صرف ٹی وی کی بات نہ کریں۔ میری فنی زندگی کا آغاز "تھیٹر" سے ہوا تھا۔ تھیٹر شروع کیا کالج کے زمانے سے اور جب واہ واہ ملی تو سوچا کہ اس کام کو کیوں نہ مستقل بنیادوں پر کیا جائے۔ چنانچہ تھیٹر کے بارے میں پڑھا، میڈیا کے بارے معلومات حاصل کیں، آڈیشن دیے اور کامیابیاں ملتی چلی گئیں۔"

"گھر والے خوش ہوئے؟ پہلا ڈرامہ / شہرت؟"

"جی بہت زیادہ خوش ہوئے اور قدم قدم پر مجھے سپورٹ کیا۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ میرا پہلا ڈرامہ وجود زن تھا اور شہرت ملی ڈرامہ سیریل "بھولی بانو" سے جو کہ ایک نجی چینل سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔"

☆☆

pklibrary.com

معروف فنکار

ثاقب سمیر سے ملاقات

شاہین رشید

"جھوک سرکار، جیون نگر، احرام جنون اور کابلی پلاؤ۔" یہ چار سیریل آج کل آن ایئر ہیں اور ان چاروں میں ایک چہرہ نمایاں ہے اور وہ چہرہ "ثاقب سمیر" کا ہے...... جو متعدد ڈراموں میں کام کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ بہترین فنکار، ہر کردار میں منفرد، ہر کردار میں چھا جانے والے فنکار ثاقب سمیر سے ایک چھوٹی سی ملاقات۔ ثاقب سمیر کا شمار آج کے مقبول ترین فنکاروں میں ہوتا ہے انہوں نے انٹرویو کے لیے وقت دیا ان کا شکریہ۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"الحمدللہ۔"

"بڑے معروف آرٹسٹ ہیں، "سہیل سمیر" آپ کا ان سے کیا تعلق ہے...... بھائی ہیں آپ کے؟"

"سہیل سمیر میرے بڑے بھائیوں جیسے ہیں۔ میرا ان کا احترام کا رشتہ ہے۔ خون کا رشتہ نہیں ہے۔"

"اپنے بارے میں کچھ بتایئے؟"

"میرا تعلق بہاول پور سے ہے، وہیں میری پیدائش ہوئی۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا ہوں۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ یعنی ہم پانچ بہن بھائی ہیں، جب میں تین سال کا تھا تو میرے والدین کا انتقال ہوگیا۔ پہلے ابو کا انتقال ہوا اور ایک سال کے بعد امی کا...... تو دونوں بھائی میرے باپ جیسے ہیں اور دونوں بہنیں ماں جیسی ہیں۔

میری شادی ہوئی 2015ء میں اور الحمدللہ میرے تین بچے ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ آپ نے کہا کہ سنا ہے آپ اپنی بیگم سے بہت پیار کرتے ہیں تو ہاں میں نے کہا تھا کیونکہ اپنی بیوی سے پیار کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ دوسرے کی بیوی سے پیار کرنا بری بات ہے۔

"آپ کے بارے میں پڑھا ہے کہ آپ "ایم بی اے" کرنے کراچی آئے اور شوبز کی راہ پکڑ لی...... کیسے؟"

"2006ء میں، میں کراچی آیا اپنے بھائی کے پاس "ایم بی اے" کرنے کے ارادے سے۔ اداکاری کا شوق تھا مگر اظہار نہیں کیا تھا...... تو جب کراچی آیا "ناپا" اکیڈمی کا پتا چلا تو میں نے وہاں کسی کو بتائے بغیر آڈیشن دے آیا اور اکیڈمی میں داخلہ بھی لے لیا۔ جیسے جیسے پڑھتا گیا اداکاری سے اور آرٹ سے پیار بڑھتا چلا گیا۔

اور "ناپا" ایک تھیٹر اکیڈمی ہے تو یہاں تین

pklibrary.com

سال پڑھنے کے بعد میں نے تھیٹر میں پرفارم کیا اور شیکسپیئر ان تھیٹر" کے تحت انگریزی اور اردو ڈرامے ہوتے تھے ان میں پرفارم کیا..... پانچ سال تھیٹر کرنے کے بعد 2015ء میں، میں باقاعدہ ٹی وی کی طرف آیا۔"

"ڈائریکشن بھی کی ہے آپ نے؟..... ڈرامہ رائٹنگ بھی کی ہے آپ نے؟"

"ڈائریکشن میں نے ابھی تک نہیں کی اور نہ ہی فیوچر میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔ البتہ رائٹنگ ضرور کی ہے، میں نے تھیٹر کے لیے بھی ڈرامے لکھے ہیں اور ٹی وی کے لیے بھی، میں نے رائٹنگ ہی کی ہے۔ ڈراموں کی صورت میں اور فلم کی کہانی بھی لکھی۔ "مہر النساء وی لو یو" جسے یاسر نواز نے ڈائریکٹ کیا تھا اور اس میں، میں نے پرفارم بھی کیا، میرا ڈبل رول تھا۔ اس کے علاوہ بھی تین فلموں میں کام کر چکا ہوں۔ لیکن "مہر النساء وی لو یو" سے میں نے بہت سیکھا کیونکہ اس فلم کی تیاری سے لے کر ریلیز تک میں ساتھ ساتھ رہا..... تو مجھے بہت مزہ آیا اس کو لکھ کر پرفارم کر کے اور اس کی ایڈیٹنگ اور ڈبنگ میں حصہ لے کر۔"

"ان دنوں آپ کے چار ڈرامے آن ایئر ہیں۔ چاروں کا رسپانس کیسا ہے اور آپ کو خود کس میں پرفارم کر کے مزہ آیا؟"

"جھوک سرکار، احرام جنوں، کابلی پلاؤ اور جیون نگر، سب ہی اچھے ہیں سب کا ہی رسپانس اچھا ملا۔ کسی کو کوئی روپ پسند آیا تو کسی کو کوئی لیکن مجھے "جیون نگر" اور "کابلی پلاؤ" میں پرفارم کر کے زیادہ اچھا لگا۔ اس لیے کہ ان دونوں کی اسٹوری بہت اچھی تھی۔ ایسے ڈرامے آج کل بہت کم بنتے ہیں بلکہ بنتے ہی نہیں ہیں..... لکھتا ہی کوئی نہیں ہے۔"

"کیا یہ درست ہے کہ ایک ہی سیٹ پر (لوکیشن) مختلف اقساط کے سین فلم بند کرا لیے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو موڈ کو کس طرح تبدیل

کرتے ہوں گے، مشکل تو ہوتی ہوگی؟

"جی بالکل درست ہے یہ بات کہ ایک لوکیشن پر مختلف اقساط کے سین ریکارڈ کر لیے جاتے ہیں اور پھر قسط کے حساب سے انہیں ایڈجسٹ کر لیا جاتا ہے۔ حقیقت اور ڈراما میں یہی دو فرق ہیں کہ ہم جو ایکٹ کر رہے ہوتے ہیں ہم اصل میں وہ نہیں ہوتے بلکہ ہم نے روپ دھارا ہوا ہوتا ہے اور اصل زندگی میں ہم اپنے حساب سے جی رہے ہوتے ہیں.....

آپ نے موڈ کی بات کی تو ہمیں پیسے ہی اس چیز کے ملتے ہیں اور اسی کو ہم کام کہتے ہیں۔ آرٹ کہتے ہیں اداکاری کہتے ہیں۔ اداکاری روزانہ سیکھنے والا کام ہے کیونکہ جب آپ کو کوئی کردار ملتا ہے۔ تو وہ پہلے کردار سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک نیا روپ ہوتا ہے۔ اور اسی کو ہم انجوائے بھی کرتے ہیں۔ یہ ٹائن ٹو فائیو والا کام نہیں ہے۔ یہ کوئی جاب نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کو انجوائے کرتے ہیں۔ یہ زبردستی والا کام نہیں ہے۔ اس کا سادہ سا پیمانہ ہے کہ اگر مجھے پرفارم کرنے میں مزہ آ رہا ہے تب پھر دیکھنے والے کو بھی مزہ آئے گا۔ ہر سین میں

مجھے بھی مزہ آنا چاہیے۔"

"آپ نے زیادہ تر نیگیٹو رول کیے..... لوگوں کی باتیں سن کر کیسا لگتا ہے؟"

"نیگیٹو کردار میں نے کچھ عرصہ پہلے ہی کرنا شروع کیے ہیں۔ اس سے پہلے تو میں نے زیادہ تر کامیڈی رول کیے ہیں۔ تھیٹر میں بھی اور ٹی وی میں بھی۔ اور باتیں سننا اچھا لگتا ہے۔ اگر برا کہا جا رہا ہوتا ہے تو اس کردار کو کہا جا رہا ہوتا ہے۔ جو ہم لوگ ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ثاقب سمیر کو کوئی برا بھلا نہیں کہتا۔ اور یہی فرق ہے اداکاری اور حقیقت میں..... اب ڈرامے میں روز شادیاں ہو رہی ہوتی ہیں تو وہ کوئی حقیقت تو نہیں ہوتی..... تو برا مجھے نہیں کہا جاتا برا کردار کہلاتا ہے۔ اور یہ ہماری کامیابی ہے کہ اداکاری پر حقیقت کا گمان ہو رہا ہوتا ہے۔"

"آپ کے ہر کردار میں ورائٹی ہوتی ہے۔ تو رول کا مشاہدہ کرتے ہیں یا ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں آپ کے کردار؟"

"یہ کام جو ہم کرتے ہیں۔ آسان نہیں، سیکھنا پڑتا ہے، وہ اساتذہ جن سے ہم نے سیکھا۔ طلعت حسین صاحب، راحت کاظمی صاحب، خالد احمد صاحب، انجم ایاز صاحب، انور سجاد صاحب، زین صاحب..... ضیاء محی الدین صاحب (جنہیں مرحوم کہتے ہوئے دل عجیب سا ہوتا ہے) سے میں نے سب سے زیادہ سیکھا۔ تھیٹر میں شاہ شرجیل کے ساتھ بہت کام کیا اور سیکھا بھی۔

اسی طرح ٹی وی میں آیا تو جس جس ڈائریکٹر کے ساتھ کام کیا بہت کچھ سیکھا بھی۔ مثلاً ندیم بیگ صاحب، احتشام الدین صاحب، احسن طالش صاحب، وجاہت حسین صاحب، شاہد شفاعت صاحب اور..... معذرت کہ کسی کا نام بھول گیا ہوں تو..... ان سب سے بہت سیکھا اور خاص طور پر کاشف نثار صاحب سے میں نے بہت زیادہ سیکھا اور سب سے زیادہ کام بھی ان ہی کے ساتھ کیا۔ چار ڈرامے جو آن ایئر ہیں ان میں دو ڈرامے کاشف نثار صاحب کے ہیں..... یہ الگ قسم کے انسان اور ڈائریکٹر ہیں اور میرے پسندیدہ ہیں۔"

"کوئی کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"

"بہت سے ایسے کردار ہیں جو میں نے ابھی تک کیے ہی نہیں ہیں، انہیں کرنے کی خواہش ہے۔ لیکن ایک کردار جسے کرنے کی بہت زیادہ خواہش ہے وہ "جوکر" کا کردار ہے۔ اس کے بارے میں سوچ بھی رہا ہوں اور لکھ بھی رہا ہوں۔ ہم نے "بالی....." کا جوکر بھی دیکھا ہے اور "بالی ووڈ" کا بھی۔ ہمارا جوکر کیا ہے کتنا پوزیٹو ہے، کتنا نیگیٹو وہ میں دکھانا چاہتا ہوں بذریعہ اسکرین تو بس دعا کریں کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"تھیٹر سے آپ نے شروعات کی..... پھر ٹی وی کی جانب اور فلم کی طرف آئے۔ تو آسان کیا ہے۔"

"جی..... میں نے تھیٹر سے شروعات کی۔ "نا پا" درحقیقت تھیٹر کا ہی ادارہ ہے اور یہاں صرف تھیٹر ہوتا ہے۔ اگر کسی کو سیکھنا ہے تو وہ تھیٹر ضرور کرے۔ اس کے بعد ٹی وی اور فلم کی طرف جائے..... تھیٹر ذرا لاؤڈ ہے۔ آواز بھی آپ کی اپنی، آپ دور نزدیک سے نظر بھی آ رہے ہوتے ہیں۔ اور ایکسپریشن بھی دے رہے ہوتے ہیں۔

ٹی وی بہت قریب کا میڈیم ہے۔ اس کی الگ ٹون ہے، تھیٹر ایکٹر کا میڈیم ہے اور ٹی وی رائٹر کا میڈیم ہے، جو رائٹر لکھے گا وہ ہی آپ کو پرفارم کرنا ہے..... تھیٹر کا رائٹر تو ہوتا ہے مگر کامیابی کا یا ناکامی کا دارومدار ایکٹر پر ہوتا ہے اور فلم ڈائریکٹر کا میڈیم ہے کہ وہ جو دکھانا چاہتا ہے وہ ہی دکھایا جاتا ہے میں نے تینوں میڈیم میں کام کیا ہے۔ تو سچ پوچھیں تو مجھے تو تینوں میں ہی کام کرنے میں مزہ آتا ہے اور اگر آپ کو کچھ آتا ہے تو پھر سب کچھ آسان ہے۔"

"فیلڈ سے متعلق تو باتیں ہو رہی ہیں۔ ساتھ

pklibrary.com

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2023
کے شمارے کی ایک جھلک

- "مالا" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "احد" صوفیہ بٹ کا مکمل ناول،
- "بخیہ گر" آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول،
- "خولہ خالہ ماموں ماموں" راشدہ رفعت کا ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، حمیرا شفیع، شبانہ اسلم، تہنیت بیگ اور نظیر فاطمہ کے افسانے،
- "انگنا پھول کھلیں گے" راحت جبیں کا ناول،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ بشریٰ احمد سے ملاقات،
- معروف آرٹسٹ "کبریٰ خان" سے باتیں،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،
- ہمارے نام، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر 2023 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

pklibrary.com

ساتھ آپ اپنے بارے میں بھی بتائیں کہ آپ مزاج کے کیسے ہیں؟ اور دیگر باتیں۔"

"مزاج میں اگر آپ پوچھیں تو نہ مجھے جلدی غصہ آتا ہے اور نہ ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آتا ہے...... کسی بڑی بات پر غصہ آئے تو پھر وہ بہت خطرناک غصہ ہوتا ہے...... ردعمل کے طور پر میں چیزیں نہیں توڑتا، جس پر غصہ ہے اسے برا بھلا نہیں کہتا۔ لڑتا نہیں ہوں۔ بس خاموش ہو جاتا ہوں۔ یا پھر اسے خدا حافظ کہہ دیتا ہوں کہ میری لائف میں آپ کی جگہ نہیں ہے۔ یہ وہ شخصیت ہوتی ہے جو "غیر" ہوتی ہے اگر گھر میں کسی شخصیت پر غصہ ہے تو کچھ عرصہ کے لیے میں بات چیت چھوڑ دیتا ہوں۔

شروع شروع میں گھر والوں کو تھوڑا اعتراض تھا مگر اب سب بہت پراؤڈ فیل کرتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں اداکاری صرف دیکھنے کی چیز تھی۔ کبھی کسی نے اس کو اپنانے کا نہیں سوچا تھا کہ تھوڑے سے مسئلے مسائل ہوئے تھے۔ اب سب ٹھیک ہے۔

اب سب دعائیں بھی دیتے ہیں حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور خاندان کے ان لوگوں کے بھی فون آتے ہیں جن کو میں جانتا بھی نہیں تو جب وہ لوگ مجھے فون کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

"فارغ وقت میری لغت میں نہیں ہے۔"

جب شوٹ پر نہیں ہوتا تو بچوں گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ ٹائم گزارتا ہوں...... سیاحت کا بہت شوق ہے مگر گھومنے پھرنے کا وقت کم ہی ملتا ہے......

سیاست سے لگاؤ نہیں ہے زندگی میں ایک بار ووٹ دیا تھا اور اس پر بھی میں شرمندہ ہوں۔ کرکٹ کھیلنے کا بھی اور دیکھنے کا بھی شوق ہے گھر کے کاموں کی بات کی تو میں دس سال فیملی کے بغیر رہا ہوں اپنے کام کی وجہ سے۔ اس لیے ہر کام کر لیتا ہوں۔ بیوی کے ساتھ بھی کام کروا لیتا ہوں، اکثر اوقات ناشتہ بھی اپنا بنا لیتا ہوں سالن روٹی نہیں بنا سکتا البتہ سوئٹ ڈش ضرور بنا لیتا ہوں۔"

"تنقید کتنی ضروری ہے؟...... برداشت کر لیتے ہیں؟"

"تنقید بہت ضروری ہے تصحیح کے لیے، تنقید کھلے دل کے ساتھ قبول کرنی چاہیے تاکہ آپ کے کام میں مزید نکھار آئے۔ ویسے تو لوگ میرے کام کو تعریفی اور تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن "نور الحسن" (آرٹسٹ) جو میرے بڑے بھائیوں جیسے ہیں میرے کام کو بہت گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور میرے کام کو نکھارنے کے لیے مشورے بھی دیتے ہیں۔"

"آج کل کیا آن ایئر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"آن ایئر جو ہیں ان کا ذکر تو آپ نے کر دیا ہے وہی بس آن ایئر ہیں چار عدد...... باقی انڈر پروڈکشن ہیں۔ دو سیریل ایک جی ٹی وی کے ہیں اور ایک دوسرے چینل کے لیے ہے۔ باقی کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔

"اور چلتے چلتے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"بالکل...... میں سب سے کہتا ہوں کہ پوزیٹو رہیں۔ جو ہمارا اور آپ کا دماغ ہے یہ انتہائی پاورفل بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے، اس کو پوزیٹو چیزوں میں استعمال کریں۔ آپ جو سوچتے ہیں وہ ہونا شروع ہو جاتا ہے یہ بات سائنس پروف کر چکی ہے کہ انسان جو سوچتا ہے، وہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

جیسے ہم دعا مانگتے ہیں، تبھی ہم سوچتے ہیں کہ یہ بات ہو جائے، اللہ قبول کر لے تو دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ بس اس کے لیے ٹائم مقرر ہے اور جو باتیں ہم نیگیٹو انداز میں سوچیں گے، وہ پلٹ کر ہمارے ساتھ بھی ہونا شروع ہو جائے گا...... بس مجھے یہی کہنا ہے کہ آج سے اچھا سوچنا شروع کریں آپ کے ساتھ اچھا ہی ہوگا۔ ان شاءاللہ۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ثاقب کیسر صاحب سے شکریہ کے ساتھ اجازت چاہی۔

☆☆

pklibrary.com

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

ہماری پیاری سی مصنفہ زینب نور نے جہانیاں سے شرکت کی ہے

ٹائٹل گرل کی جیولری پسند آئی۔ ڈریس تو نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ اور ہاں...... شعاع...... تمہیں سالگرہ مبارک (شعاع ڈیئر باسی سالگرہ پر برا نہ ماننا) حمد و نعت دیکھنے کے بعد سیدھی جمپ، "شہر شام ہجر" پر لگائی۔ ایلیا اور مومن کم دکھائے گئے اب کی بار۔ تانیہ کے کردار کو بھی ذرا سرکا دیں۔ منصب ایلیا اور تحریم کا بھائی ہے اس کا مطلب شہناز بیگم کے ناحق بدلے کا شکار انسان، دراصل منشی کی بیٹی ہے۔

"والعصر" خوب مگر الجھی الجھی سی تحریر ہے۔ امت العزیز نے ابھی تک ایک گرہ بھی نہیں کھولی۔

خولہ تو پکا بدر الوری ہے۔ اور شرر...... شاید عیسٰی ہے۔ اور میرے اندازے کہانیوں کے حوالے سے پچانوے فیصد درست نکلتے ہیں۔ (اب چھوڑ تو دی ہے، آگے اللہ سنبھالے...... ہاہاہا)

فرزانہ کھرل...... ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورت احساس کے ساتھ آئیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کے نوک قلم سے کمال الفاظ نکلے۔ لیکن اس کے باوجود بھی...... اس کہانی میں کچھ ادھورا پن سا تھا۔

امر حسنی نے کارڈ پہ لکھی تحریر کے نیچے جو اپنی تحریر لکھی تھی وہ کیا تھی؟

سنان کے کندھے پر جو گومڑ تھا، جو زخم تھا۔ وہ کس بیماری کی علامت تھی؟

امر حسنی کی ماں کا امر کے ساتھ رویہ...... ذہن سے بالاتر بات ہے۔ کالونی کے چند گنے چنے گھروں میں سے انعام اللہ کو کس گھر کے مالک نے اغوا کیا؟

مجھے لگتا ہے مجھے یہ ناول دوبارہ پڑھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ناول پڑھتے ہوئے دسیوں بار تو اٹھ کر باہر گئی۔ کبھی امی نے آواز لگائی۔ کبھی امی کے کمرے میں آجانے کا ڈر۔ پھر دونوں آپیاں آئی ہوئی ہیں ان کے تین تین بچے۔ ظہر کے بعد...... چھ بچے، بہن بھائی، سب کے درمیان اتنے شور وغل میں میں نے افسانہ کیسے لکھا۔ شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

دوبار پانی پینے گئی تو بچوں نے صفحات کا بیڑا غرق کیا۔ میں نے دہائی دی کہ کبھی کوئی رائٹر ایسے لکھتا دیکھا ہے جیسے میں لکھ رہی ہوں۔

چارپائی پہ بیٹھ کے دیوار سے ٹیک لگا کر، گھٹنے پہ کلپ بورڈ میں صفحات، دائیں طرف تحریر شدہ صفحات اور بائیں طرف رف مسودہ، دوبار کہا۔

"کسی اونچے گھرانے کی رائٹر ہوتی تو تین بار ملازمہ سے کڑک چائے بنوا کر پی چکی ہوتی۔"

مگر مجال ہے جو کسی نے میری خواہش کو سمجھا ہو۔ گھنٹے بھر بعد خود ہی اٹھی، کٹوری میں میٹھے چاول ڈالے۔ اوپر پھیکا دودھ ڈالا، کھا کر، فریش ہو کر پھر لکھنے بیٹھ گئی۔ صبح کا سارا کام نبٹا دیا تھا اور امی کی منتیں کر کے کہا تھا۔ مجھے کچھ گھنٹوں تک کوئی کام مت کہیے گا۔ صرف آج کا دن دے دیں لکھنے کے لیے۔

اب آپ خود سوچیں، ایسی افراتفری، بے ہنگم اوقات میں فرزانہ کھرل جیسی رائٹر کی اسٹوری مکمل طور پر سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔

"آسیب"، فکرو پریشانیوں، الجھنوں میں سے امید اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لمحے چراتی تحریر۔

pklibrary.com

صائمہ نور کی "زندگی فرض ہے" درس دیتی تحریر زبردست تھی۔

"خط آپ کے" زوہا خان آپ سے مل کرنا قابل بیان خوشی ہوئی۔ سب بہنوں کو اٹھا کر دکھایا خط کہ دیکھیں ہماری ہمسائی کا خط آیا ہے۔ جہانیاں کے کس گوشے کو رونق بخشتی ہیں آپ؟؟؟

انس تو واقعی ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اس رسالے کی دنیا میں میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو عدنان شوز، عرش میچنگ سینٹر، یجی ہٹی اور غلام رسول کی برفی کو جانتی ہے (ہاہاہا) باقی سب بہنوں سے مل کر بھی مزہ آیا۔

(فرحانہ مہتاز...... آجائیں آپ، بھی میں بھی آگئی ہوں۔)

پیاری زینب! آپ کا دلچسپ خط خود اپنی جگہ ایک کہانی ہے۔ یہ واقعی کمال کی بات ہے کہ آپ اتنے شور شرابے میں کہانیاں لکھتی ہیں لیکن ایک بات بتائیں آپ کو، اگر یہ شور شرابا، ہنگامہ، بے ترتیبی نہ ہو تو شاید لکھ بھی نہ سکیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ بہت زیادہ سکون آرام مل جائے تو وہ ڈل ہو جاتا ہے۔ رفعت سراج کا سب سے بہترین ناول دل، دیا، دہلیز ہے اور یہ انہوں نے انتہائی ناساعد حالات میں لکھا۔ اس کے بعد بھی انہوں نے اچھا لکھا، مگر دل، دیا، دہلیز کی علیحدہ ہی بات ہے۔ آپ کی بہن کے مسائل کا حل "خوب صورت بنیے" میں دیں گے۔

آپ کے سوالات کے جواب تو فرزانہ کھرل ہی دے سکتی ہیں۔

سونیا بانی...... قاضیاں محلہ ہالا

کافی ٹائم کے بعد مجھے ٹائٹل ضرورت سے زیادہ اچھا لگا۔ ہمارے افسانے مجبوری تھی، کو جگہ مل گئی۔ اور اس افسانے کو پڑھ کر سونی (مبین کی کزن) نے کہا کہ بھابھی اتنا ہی مزہ آیا۔ جتنا مزہ آپ کے منہ سے سن کر آیا تھا (اصل میں جب میں سسرال گئی تو ہم ایک ساتھ بکریاں لے گئے تھے تو میں راستے میں نے کہانی سنائی تھی) اس بار تو اٹلی سے تعریف کے لیے کال آئی تھی۔ عاصم مشتاق جو کہ ہماری سسرال کا حصہ ہیں اور بڑی ہی اعلا شخصیت ہیں خیر سب لڑکوں سے چھوٹے ہیں اور خاندان کے سارے بچوں کے تایا بنے بیٹھے ہیں) مجھے کال کر کے تعریف کی اور فرمائش کی بھابھی مجھ پر بھی کوئی افسانہ لکھو ناں۔ (ضرور ان شاء اللہ)

اس بار ہم نے سارا شعاع پڑھ لیا اور ساتھ ساتھ ایک ناولٹ اور افسانہ بھی لکھ لیا۔

مکمل ناول فرح بخاری نے وسیلہ کو بھی گلناز جیسا نہ سہی۔ مگر تھوڑا بہت تو دماغی طور پر بیمار کر دیا۔ "آسیب" پڑھ کر لگا کہ وہ بشریٰ نہیں بلکہ میں ہوں۔ میرے ساتھ یہی سب ہوتا۔ جو اگر مبین دیوار بن کر درمیان میں کھڑے نہ ہوتے کیونکہ میرے سارے سسرال والے یہی کہہ رہے تھے کہ اسے سایہ ہے۔ میرے سسر نے مجھے کئی بار کسی بابا کے پاس لے جانے کا پروگرام بنایا بھی تھا مگر مبین نے انکار کر دیا کہ اسے دماغی مسئلہ ہے اور یہ صرف ڈاکٹر کے پاس ہی جائے گی۔

جب مجھے دورہ پڑتا تھا تو چاروں مرد مل کر قابو نہیں کر پاتے تھے، اسی بات کو دیکھ کر ان کو لگتا کہ سایہ ہے۔ اور بقول ڈاکٹر دماغی مسئلوں میں یہ باتیں عام ہیں اور ان ہی باتوں کی وجہ سے عاملوں کی عیدیں ہو جاتی ہیں۔

آسیہ رئیس خان، مجھے پسند ہیں۔ ناول اچھا تھا مگر آسیہ نے فہد کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔

ناولٹ گھروندا، میری پیاری حمیرا شفیع، میری دل سے دعا ہے جلد مکمل ناول کے آگے تمہارا نام ہو، میرے لیے بھی دعا کرنا۔ میں نے بھی اک ناولٹ لکھ ڈالا ہے۔

کس کے گھر پر، آسیہ رزاقی نام تو جانا ہی پہچانا تھا مگر تحریر کچھ اور تھی۔

افسانے سارے ہی اعلا تھے۔ اور پہلے نمبر پر خوابوں کے پر، رہا میری نظر میں۔ ٹھنڈا تو ابھی اچھی تحریر تھی۔

وسیلہ رزق، ثوبیہ کی بات بھی ٹھیک ہے کھلانے والا اللہ ہے۔ گوشہ عافیت، جی بالکل میرے خیالات بھی بالکل ہی ہیں۔ مشکل، رمشا روشن کو بھی ٹائم ملا، بہت اچھے رمشا۔

اور آخر میں میرا اپنا مجبوری تھی۔ تو جی بہت اعلا تھا ہاہاہا تو جناب اعلا اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ سب میری صحت کے بارے میں جانتی ہی ہو۔ دو سال ہونے کو آئے۔ میرا علاج چل رہا ہے۔ گولیاں تین ٹائم کی تھیں۔ اب صرف ایک رہ گئی ہے رات کو لیتی ہوں۔ میری صحت کے ٹھیک ہونے میں لکھنے سے بہت فرق پڑا ہے۔

اور 4 دسمبر کے بعد میں یوں آپ سب کے سامنے ہوں تو بہت سارے لوگوں کا ہاتھ اور ساتھ ہے۔ آپ کے

pklibrary.com

ادارے کا بھی کہ آپ نے میرے خط سے پہچان کر مجھے جگہ دی۔ بہت بہت شکریہ۔ پھر ڈاکٹر فوزیہ، صبا، جویریہ (جس سے کہانی شیئر کرتی ہوں) فاخرہ بتول (جو کراروں کے نام دیتی ہے) اور میرا عزیز بھیا جس نے مجھے کہا تھا کہ تم لکھو تم لکھ سکتی ہو۔ سب کا دل سے شکریہ

پیاری سونیا! یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ آپ لکھنے پڑھنے سے تعلق نہ توڑیے گا۔ ذہنی مصروفیت بہت ضروری ہے آپ کے لیے، 14 گولیوں سے اب ایک گولی رہ گئی ہے۔ یہ بھی ان شاء اللہ بہت جلد چھوٹ جائے گی۔ اس کا کریڈٹ آپ کے شوہر کو بھی جاتا ہے۔ ایک محبت کرنے والا، سمجھ دار شریک حیات بہت بڑی نعمت ہے۔

آپ کی تحریروں پر بھی نکھار آرہا ہے پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہیں۔ ناولٹ اور افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ لکھنے کے لیے پنسل کے بجائے پین کا استعمال کریں پنسل سے لکھا پڑھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

آسیہ رئیس خان نے فہد کو اس وجہ سے ایسے ہی چھوڑا کہ وہ بھی نارمل نہیں تھا۔ اس طرح کے لوگوں کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہو جائے۔ تو ان کی سوئی وہیں اٹک جاتی ہے۔ زندگی میں کسی بھی خواہش کو ضد نہیں بنانا چاہیے۔ ورنہ انسان مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

ثمرہ احمد سعید چوکی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

خواتین شعاع ہر باشعور لڑکی، عورت، نانی، دادی، خالہ غرض کہ جو بھی ہماری خواتین کے رشتے ہیں، ان کا عمر بھر ساتھی رہتا ہے حتیٰ کہ موت ان رشتوں کو آن ملتی ہے۔ بہت سے لوگ محبت بکھیرتے رہے ادارے میں بھی۔ چلے گئے۔ میں پڑھتی رہی اپنی خالہ نزہت کے ساتھ۔ وہ بھی چلی گئیں۔

ہمارے ننھیال کا ماحول شروع سے ذہنی طور پر آزاد تھا جبکہ ددھیال ذہنی طور پر قید میں تھا۔ شعاع، خواتین، کرن، آنچل، اخبار خواتین، زیب النساء، جاسوسی ڈائجسٹ ہمارے ساتھی رہے۔ ایک سے بڑھ کے ایک لاجواب کہانیاں، ناول، افسانے اور ان کو لکھنے والے۔ آپ انہیں سمیٹنے والے، جیسے باغ میں جائیں تو چن چن کر رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ تیار کیا جائے ہر رنگ ہر خوشبو خوب صورت اور سمیت کران پھولوں کو خواتین، شعاع کے ربن میں باندھ کر پوری دنیا میں پہنچانے والے تیسرے کونے کو مکمل کرنے والے قارئین کرام۔ کتنی پیاری ڈور ہے جس میں ہم بندھے ہیں۔ یہ سب کریڈٹ ہے آپ کا، ٹوٹل ادارے کا ادارے کو محبتوں بھرا اسلام۔ محبت بانٹتے رہنے کا اعزاز بانی خواتین، شعاع کو جاتا ہے جو آج ہم میں نہیں لیکن نہ صرف پاکستان کے کروڑوں عوام بلکہ دنیا کے تمام ممالک میں جہاں جہاں شعاع، خواتین بہت سا سفر کر کے پہنچتے ہیں ان سب کے ساتھ حروف و الفاظ میں زندہ ہیں جب تک ادارہ ہے تب تک یہ رشتے ہیں کتنے پیارے؟ اتنے پیارے کہ جیسے جھیل میں [illegible] کا عکس، پھولوں [illegible] پہاڑوں پر ہے ان چھوٹے پھول ان کی چوٹیوں پہ چمکتا سورج۔

پیاری ثمرہ! آپ کا خط بلکہ خط کی صورت میں شاعری پڑھی۔ ایک طویل عرصہ بعد آپ نے ہماری محفل میں قدم رکھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ وہ زمانے یاد آگئے جب آپ ہر ماہ باقاعدگی سے سب سلسلوں میں شرکت کرتی تھیں۔ آپ کی خالہ نزہت کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

اب آپ ہم سے رابطہ رکھیے گا۔

ارم نعیم نے بحریہ ٹاؤن، راولپنڈی سے لکھا ہے

تین بجے [illegible] ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا۔ سب سے پہلے افسانہ پڑھا، "شذرا تو؟" کچھ سمجھ آیا اور کچھ سمجھ میں نہیں بھی آیا۔ عجیب تھا...... پھر پڑھا "خوابوں کے پر" بہت اچھا لکھا ریحانہ چوہدری نے رمشا روشن نے "مشکل" افسانہ لکھ کر اچھی نصیحت دی۔ "گوشہ عافیت" سرور فاطمہ نے بھی اچھا لکھا۔ "مجبوری تھی" افسانہ دل کو چھو گیا۔ سونیا ربانی نے بہت اچھا افسانہ لکھا تھا۔ ان کے سارے افسانے دل کو چھو جانے والے ہوتے ہیں۔ "میں ایک سسر ہوں" کمال کا تھا۔ مجھے لگا تھا حمیرا شفیع جیسا ہوگا جس طرح انہوں نے لکھا تھا مگر یہاں پر انہوں نے بہو کا پوزیٹو کردار بنایا تھا جبکہ ساس کا نیگیٹو کردار۔ یہ سب پڑھنے کے بعد آخر میں حمیرا شفیع کا ناولٹ "گھروندا" پڑھا۔ زبردست رہا۔

pklibrary.com

پیاری ارم! آپ کا پچھلا خط بہت اچھا تھا۔ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل نہ ہوسکا۔ لیکن اس خط میں ایک غلطی آپ سے ہوئی کہ آپ خط پر اپنا نام لکھنا بھول گئیں۔ چلیں شکر ہے کہ آپ نے اس بار یہ بھول نہیں کی۔

افسانہ پڑھ لیا ہے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور یقینی بات ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے آپ یہ افسانہ دوبارہ لکھیں اس میں بہتری کی گنجائش ہے۔

عدینہ لغاری جھمرہ سے شرکت کر رہی ہیں لکھتی ہیں

پہلی شعاع پڑھ کر دل پرسکون ہوجاتا ہے۔

پیارے نبی کی باتیں اس دفعہ بہت ہی معلوماتی تھیں۔ خط آپ کے "میرا پیارا اسا [illegible] رمشا روشن اور زینب نور کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ سونیا ربانی نے میرا شکریہ کہا۔ سونیا جی آپ کی کہانی میں ایک سبق ہوتا ہے "مجبوری" بھی خوب تھا۔ فرح بخاری کا ناول ادھر پڑھا اور انتظار پھر شروع، "آسیب" بہت ہی خوب تھا، ایسا تو میری بہن کے ساتھ ہوچکا ہے ہم نے بھی آسیب ہی سمجھا تھا، دماغی امراض کے ڈاکٹر کو دکھانے سے وہ اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگئی ہے اس دفعہ امت الصبور تاریخ کے جھروکوں میں ابلیس کو لائیں، بہت ہی زبردست معلومات تھیں، میں اپنے بچوں کو ضرور پڑھ کر سناؤں گی۔ زرینہ خانم کی معلومات بھی اچھی تھیں۔

پیاری عدینہ! آپ لوگوں نے بہت سمجھداری سے کام لیا اور اپنی بہن کو ڈاکٹر کو دکھایا۔ ورنہ عام طور پر لوگ اس کو سمجھ نہیں پاتے اور الٹے سیدھے عاملوں اور فراڈ پیروں کے چکر میں پڑ کر مریض کا حال مزید خراب کر دیتے ہیں۔

شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اچھی اور مثبت تحریریں بھی ذہن پر خوش گوار اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اپنی بہن کو ذہنی طور پر مصروف رکھیں۔ اچھی تحریروں کا مطالعہ ان کے ذہن پر خوش گوار اثر ڈالے گا۔

ریحانہ چوہدری نے مدوکے سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

2 ستمبر ہمارا یوم پیدائش ہے۔ رات بارہ بجے میری بھتیجی نادیہ جو اب ارسلان کی منگیتر بھی ہے اس نے وش کیا، اسکول گئی تو آفس میں داخل ہوتے ہی پورے اسٹاف نے بھرپور تالیوں کے ساتھ استقبال کیا۔ گھر آئی تو ماہ نور نے لنچ بنایا ہوا تھا۔ ارسلان کیمپ پال گیا ہوا تھا۔ اسے کال کی اگر شعاع آیا ہوا تو لے آنا۔ خیر جی رات ہوئی تو ارسلان صاحب پیزا۔ لیگ پیس اور فرائز وغیرہ لے کر آئے تو ساتھ ہی شعاع والا شاپر بھی تھا۔

فارغ ہو کے ڈائجسٹ پکڑا، سرورق پر نکھری نکھری خوب صورت مسکراہٹ اور حنائی ہاتھوں سے آنچل کو پکڑے ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھی۔

اب کچھ تحریر کی طرف آتے ہیں۔ بے بی باجی کے مصنف منصور احمد خان سے ملاقات بہت خوب رہی۔ کمال مصنف ہیں۔

بات ناول والعصر کی کریں تو اجل عزیز شہزاد نے بہت سی گتھیاں سلجھانی شروع کردی ہیں شکر ہے احتشام اور نورین کو جلد ہی سمجھ آگئی۔ تیرا [illegible] بہت اچھی تحریر تھا۔ کر بھلا سو بھلا عون کی خالہ کا کردار بہت پاورفل اور پازیٹو تھا۔

سونیا ربانی کی مجبوری تھی۔ معاشرتی رویوں کی عکاس تحریر تھی۔ سحر نہایت سمجھدار بہو ثابت ہوئی۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول آسیب ان کا مخصوص انداز تحریر انہیں ایک بار پھر ایک ممتاز مقام سے سرفراز کر گیا۔ سرور فاطمہ جی کا گوشہ عافیت کو بچانے کے لیے دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہی چاہیے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل سے لگانے کے بجائے درگزر کرنا چاہیے۔

رمشا روشن کا مشکل خوب صورت الفاظ میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ریحانہ چوہدری کے خوابوں کے پر کے لیے تو ایک ہی تبصرہ ایسا ملا کہ مجھے یقین ہی نہ آیا کہ کوئی میری تحریر کو پڑھ کر اس طرح کا بھی تبصرہ کرسکتا ہے اور وہ تبصرہ میری نور کی دوست صباحت نے مجھے واٹس ایپ کیا تھا۔ صباحت بہت بہت شکریہ۔

پیاری ریحانہ! جنم دن مبارک ہوا، رسلان بیٹے کی منگنی کی بھی دلی مبارک باد اور دعائیں اور یہ کیا بھئی، پہلے بیٹی کی شادی اب بیٹے کی منگنی اور ہمارا منہ بھی میٹھا نہیں کرایا۔ کوئی میٹھا سا، ہلکا پھلکا افسانہ لکھ کر بھجوائیں جسے پڑھ کر ذہن بوجھل نہ ہو۔ خط تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ام ہادیہ نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت پسند آیا، دوپٹے میں ماڈل بہت اچھی

لگ رہی ہے۔ پچھلے ماہ میرا خط شائع نہیں ہوا۔ ایسا لگا شمارے میں رونق ہی نہیں ہے ہاہاہا۔

اب شعاع کی طرف تو جناب پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں۔۔ بہت کچھ معلوم ہوا جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے بہت پسند آیا بہت چٹ پٹی سی ہیں یہ بہن، مزہ آیا پڑھ کر ،آسیب بھی اچھا ہی تھا، بس مسافتیں سمیٹ لو ایسی بہت کہانیاں پڑھی ہیں میرا اور میری بہن کا فیورٹ شہر شام ہجر ہے بہت ہی انٹرسٹنگ ہو گیا ہے۔ والعصر گھوم پھر کے پھر وہیں آجاتا ہے پلیز تھوڑی سی تیز کریں۔ گھروندا اچھا تھا۔ اور یہ سونیا ربانی صاحبہ آپ کیا میرے ہمسائے میں رہتی تھیں کیونکہ سحر کے ساتھ جو اس کے سسرال والوں نے کیا میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ خیر میں نے تو دل میں پکا ارادہ کیا کہ جو جتنی عزت کرنے کے قابل ہے اس کی اتنی ہی عزت کرنی چاہیے۔ ایک بات میری چھوٹی بیٹی کہتی ہے ماما آپ اپنا نام لکھتی ہیں میرا نام لکھ کر یہ چھپا کریں آپ کی کہانی بھی شائع ہو جائے گی۔

ام ہادیہ! آپ کی کہانیوں کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ آپ میں صلاحیت تو ہے لیکن ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ کوشش کرتی رہیں۔ ان شاء اللہ کامیاب ہوں گی۔ ہادیہ کو ہماری طرف سے پیار۔ پیاری بہن! برائی کا جواب برائی سے دیا جائے تو یہ زمین نفرتوں سے بھر جائے گی۔ آپ سب کی عزت کریں۔ برائی کرنے والوں کو اللہ پہ چھوڑ دیں۔

عائشہ انتظار نے تحصیل ساہیوال ضلع سرگودھا سے شرکت کی ہے

نعت بہت پسند آئی۔ منصور احمد خان کا انٹرویو۔ ہم نے ان کا ڈرامہ بے بی باجی دیکھا تھا۔ افسانے جتنے بھی پڑھے ہیں سارے اچھے ہیں۔ شہر شام ہجر میں فرح بخاری نے کیا ٹوئسٹ دیا ہے "آسیب" اختتام اچھا رہا۔ میرا خیال ہے اس کا علاج دونوں طریقوں سے ہونا چاہیے اور دماغی بیماری بھی دیگر بیماریوں کی طرح ہوتی ہے۔ پاگل کا لیبل لگا دینا غلط ہے۔

غزلیں اس بار کچھ خاص پسند نہیں آئیں ہاں لیکن گزشتہ شمارے میں پروین شاکر کی نظم نے دل موہ لیا تھا۔ فرزانہ کھرل کا "محبت سر درستہ ہے" اچھا تھا اور آل لیکن کچھ قارئین سے میں اتفاق بھی کرتی ہوں کہ الفاظ کا چناؤ بہت مشکل تھا۔ اکثر لائنیں دو بار پڑھنے سے سمجھ میں آئیں۔

ج: پیاری عائشہ! آپ کا خط لیٹ ملا، اس لیے ستمبر کے شمارے میں شامل نہ ہو سکا۔ اس ماہ شامل کر رہے ہیں۔ آپ کی بہن کی مہندی کے ڈیزائن کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی۔

فیصل آباد سے اسماء کشف نے لکھا ہے

میں نے کافی بار خط اور افسانے مختلف سلسلوں کے لیے بھی تحاریر بھیجی ہیں۔ پر کوئی بھی جواب نہیں آتا۔ پھر بھی شعاع اور خواتین ضرور پڑھتی ہوں جن میں زندگی کی حقیقت ہوتی ہے، بہت سے اپنوں نے دکھ بھی دیے، ساتھ بھی چھوڑا ...... پر خواتین اور شعاع ہمدرد بن کر ہمیشہ ساتھ رہا۔

دعا ہے کہ یوں ہی ورق ورق سنورتا رہے لفظ لفظ بکھرتا رہے اور سب رائٹرز اور قارئین دور ہو کر بھی اک دوسرے کے ساتھ چلتے رہیں۔

عمیرہ احمد کا انٹرویو کیس میں ان کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری اسماء! آپ کی تحریریں ہم نے پڑھی ہیں۔ بلاشبہ آپ میں صلاحیت ہے۔ آپ لکھ سکتی ہیں لیکن آپ کے افسانوں میں کہانی پر توجہ نہیں دی گئی۔ آپ کہانی پر توجہ دیں۔ خواتین اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

اچھی تحریروں کا مطالعہ آپ کی شخصیت کو مضبوط بناتا ہے اور آپ کو زندگی کے دکھوں اور غموں کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔

انیسہ عائش نے کوٹ رادھا کشن قصور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہمارے شوق کا یہ عالم ہے کہ سات آٹھ تاریخ کو ایک بار اسکول سے واپسی پر اپنی پاکٹ منی سے شعاع خرید کر لاتے ہیں اور دوسری بار خط پوسٹ کرا کے آتے ہیں۔ خیر اب ہم چلتے ہیں تبصرے کی طرف تو سب سے پہلے ہم نیمہ ناز کے آسیب پر پہنچے۔ قسط پڑھ کر ہم تو رو چلے تھے کہ اختتام نے ہمیں رلا سا دیا۔ بہت معلوماتی اور مفید رہی۔ پھر شام شہر ہجر پڑھا۔ مومن اور ایلیا والے مناظر مزہ دے گئے مگر وسیلہ کے ساتھ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟ امت العزیز شہزاد کے والعصر

pklibrary.com

میں کردار کھلنے میں ہی نہیں آرہے ناول طویل ہوتا جارہا ہے بس۔ آسیہ رئیس خان کا مسافتیں سمیٹ لو ایک نیا پہلو لیے ہوئے تھا جس میں اصیلہ نے سبق سیکھ لیا ورنہ ولن کے ساتھ برا ہی دکھایا جاتا ہے اکثر۔ اس کے بعد آسیہ رزاقی کا ناولٹ کس کے گھر پر، پڑھا مزاح کی کمی پوری کر دی آسیہ جی نے۔ افسانوں میں سے بہترین رمشا روشن کا مشکل اور ریحانہ چوہدری کا خوابوں کے پر رہے۔ وسیلہ رزق پرانی طرز پرانا موضوع مجبوری تھی اشک بار کر گیا۔ بس ٹھنڈا تو ہماری سمجھ میں کچھ خاص نہیں آیا۔ ارے یہ کیا حمیرا شفیع کا گھروندا تو ہم بھول بیٹھے۔ عون اور فرینہ کا منفرد گھروندا دل میں گھر کر گیا۔ ہمیں پڑھ کر لطف آیا۔ مزاح کی چاشنی میں ڈوبا منفرد سا ناولٹ۔ ''خط آپ کے'' میں بہار اتری ہوئی تھی۔

ج: پیاری ہیبہ! شعاع اور خواتین کی آپ کی محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ آپ کے افسانے پڑھ لیے ہیں۔ آپ اسکول میں پڑھتی ہیں یا پڑھاتی ہیں؟ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سمجھ دار اور باصلاحیت ہیں۔ آپ کو لکھنا آتا ہے۔ بس تھوڑا کہانی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے افسانے قابل غور ہیں۔

صدف ناصر گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

کیا بات ہے ستمبر کے ''سرورق'' کی۔ بے حد پیاری لڑکی، سر پہ دوپٹہ اور خوب صورت مسکراہٹ۔ واہ شاندار۔ ''پہلی شعاع'' میں بیک وقت آنے والے بدترین حالات اور امید کی کرن دکھائی۔

''پیارے نبی کی باتیں'' پسندیدہ ترین موضوعات تھے سب۔ چھوٹے چھوٹے اور اچھے اچھے۔ سبحان اللہ ''حمد'' اور ''نعت شریف'' نے دل خوش کر دیا۔ ساغر صدیقی کو ''شاعر صدیقی'' غلطی سے لکھ ڈالا۔

''خط آپ کے'' میں ڈرتے ڈرتے ہی قدم رکھا۔ کیونکہ پچھلے پانچ ماہ میں ایک ہی تبصرہ شامل ہوا باقی ردی کی نذر۔ تو وہی ہوا ناں اب پھر تبصرہ غائب۔ جبکہ پچھلے ساڑھے چار سال سے ایک ماہ بھی غیر حاضری نہیں ہوئی پوسٹ کرنے سے۔ شکر ہے ''رمشا روشن'' محفل میں لوٹ آئیں۔ خط پڑھ کر شکر کیا کہ روایتی سسرال کی نذر نہیں ہوئیں۔ ''سعدیہ کنول'' کی تجویز اچھی ہے پرانی کہانیاں ضرور لگائیں۔

''صائمہ گل'' فرمائش پہلی دفعہ ہم تک آئی۔ (شکریہ)

''والعصر'' سے تحریروں کا آغاز کیا، لیس جی رمشا روشن کا اندازہ درست رہا۔ ورنی ہی اصل میں بی ذی نکلی۔

''شہر شام ہجر'' خاصی برق رفتاری سے تحریر بڑھی اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ تحریر بے جا طوالت میں پڑ جائے تو دل تنگ پڑ جاتا ہے۔ ''مومن'' اور ''منصب'' کی کارکردگی سپر رہی۔ ''آسیب'' کی دوسری اور آخری قسط بھی بہترین رہی۔

''مسافتیں سمیٹ لو'' آئیسہ رئیس خان کے جادوئی قلم سے نکلا ایک اور بہترین سبق سکھاتا ہوا ناول، ''ناولٹ'' کی طرف بڑھے۔ ''آسیہ رزاقی'' کا نام دیکھ کر دل باغ باغ ہوا۔ بے حد حرے کی تحریر ''حرے کی شادی اور آسیہ کے برجستہ فقرات۔ ایسی تحریریں بس وہی لکھتی تھیں۔ شازیہ چوہدری کو بھی یاد فرمائیں۔ ''گھروندا'' حمیرا شفیع نے بیک وقت دلچسپ اور سبق آموز تحریر لکھی۔ شکر ہے تحریر ہر طرح کی گھریلو سیاست سے پاک رہی۔ ''عون'' کا فیصلہ بہت اچھا لگا۔ یہ شمارہ ''افسانہ نمبر'' ہوتا تو ٹھیک رہتا۔ ماشاء اللہ سے سات افسانے جگمگا رہے ہیں۔

''وسیلہ رزق'' حرف بہ حرف سچی تحریر۔ بہنوں اور بیٹیوں کو دینے سے رزق بڑھتا ہی ہے گھٹتا نہیں۔ یہ بات مجھے میری دادی ساس نے سکھائی تو میں سختی سے عمل پیرا ہوں تو اللہ بھی مجھے بھر بھر کے نوازتا ہے۔ ''مجبوری تھی'' ہماری قاری دوست ''سونیا ربانی'' کا ایک اور پیارا افسانہ۔

''گوشہ عافیت'' سرور فاطمہ جی سے ہرگز متفق نہیں کہ لڑکیاں میکے جا کر بھی دکھ سکھ نہ کریں تو پھر اندر ہی اندر گھٹ کر مر جائیں۔ البتہ یہ ہے کہ جتنی بات ہو۔ اتنی ہی کرنی چاہیے۔ بے جا جھوٹ، بڑھاوا اور رائی کا پہاڑ بنا کر جھوٹے رونے رونا واقعی غلط بات ہے۔

''خوابوں کے پر'' ایک موٹیویشنل اسٹوری ''ماسٹر آصف'' کا بے جا غصہ انہیں نا قابل تلافی نقصان تو دے ہی گیا۔ ہاں البتہ ''بریانی'' ہمیں بھی ستاتی رہی وہ کہاں گئی۔ (ہاہاہا) گوجرانوالہ کے لوگ خواب میں بھی کھانے ہی دیکھتے ہیں۔

''مستقل سلسلے'' ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

ج۔ پیاری صدف......! سب سے پہلے تو معذرت

pklibrary.com

عذرا آصف نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ٹائٹل پر گوگلوسی ماڈل اچھی لگی...... پہلی شعاع ہم پاکستانیوں اور مسلمانوں کے حالات کی عکاسی کرتے الفاظ حمد ونعت دلوں اور روحوں پر اثر انداز ہونے والا کلام، پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں، زندگی کو بہترین بنانے کے اصول، اور باتیں، جب تجھ سے ناتا جوڑا، اپنا ہی ناتا پڑھا اچھا لگا، ایمن حبیب سے ملاقات بھی اچھی رہی...... خط آپ کے، اپنا بے نامی خط پڑھ کے بہت اچھا لگا، وسیلہ رزق...... ثوبیہ زمان نے بالکل ٹھیک لکھا، پتا نہیں کس کی قسمت کا رزق کس کے ذریعہ زمین پر اترتا ہے۔ اور حدیث نبویؐ ہے کہ تمہیں رزق ہمیشہ تمہارے کمزور لوگوں کی دعاؤں کی وجہ سے ملتا ہے۔ اور میرا تو پکا یقین ہے ان الفاظ پر۔

لمحٰی آصف...... میں ایک سسر ہوں بہت ساری بہوؤں کو یہ افسانہ بہت پسند آئے گا۔ گھروندہ حمیرا اشفیع نے بہترین موضوع پر لکھا۔ آسیب۔ نعیمہ ناز نے بہت ہی نازک موضوع پر بہترین لکھا۔ مریضوں کو بھی جادو جن، چڑیلوں سے ملا دیتے ہیں۔

مسافتیں سمیٹ لو...... آسیہ رئیس خان...... شام شہر ہجراں فرح بخاری کی مہربانی کہ انہیں وسیلہ پر ترس آ ہی گیا۔ کس کے گھر پر آسیہ رزاقی جی کا جس بھی بہن نے یہ فرمائش کی تھی میرے دل کی بات لے اڑیں۔ (سعدیہ کنول) نے فرمائش کی تھی...... بہت اچھا لگا یہ سلسلہ۔ ہر طرح کا کردار لیے یہ ناولٹ بہترین تھا۔ ''خوابوں کے پر'' ریحانہ چوہدری نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ آخر میں شاہد نے اپنے باپ کو الزام دینے کی بجائے انہیں عزت دی تو بہت اچھا لگا......

ج۔ پیاری عذرا! تفصیلی تبصرہ کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ایچ ایس ایچ تحصیل سموٹیال سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے بات ہو جائے شہر شام ہجر کی تو یہ کیا وسیلہ کی یادداشت اتنی متاثر ہوئی کہ اسے یہ تو یاد ہے کہ وہ میاندم میں رہتی ہے اور اس کی امی بیمار ہیں لیکن اسے شکل یاد نہیں ایلیا اور مومن نے تو چار چاند لگا دیے ناول کو، آسیہ رئیس خان اور آسیہ رزاقی کے ناول میں سے سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ پہلے کون سا پڑھیں پھر آسیہ رزاقی کا ناول پڑھا ہلکی پھلکی اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد مسافتیں سمیٹ لو کی طرف دوڑ لگائی اور ہمیشہ کی طرح سپر ڈپر کہانی، نعیمہ ناز کے ناول نے تو دشت جنوں کی یاد دلا دی تھی، اس ماہ کی قسط پسند آئی ویلڈن، حمیرا اشفیع کا گھروندا بھی شاندار کہانی تھی، ناول تو سارے مزے کے تھے باقی اس دفعہ افسانوں کا کیا کہنا ایک سے بڑھ کر ایک کہانی۔ سب سے پہلے تو رمشا روشن کا افسانہ پڑھا۔ ہم ایسا ہی تو کرتے ہیں دوسرے کی چاہت کو بھلا کر صرف غلطی کو یاد رکھتے ہیں۔ میں ایک سسر ہوں دیکھ کر پہلے تو کوفت ہوئی پھر یہ سوچا ہو سکتا ہے یہ منفرد ہو ایسے ہی تو نہیں دوسری دفعہ شائع کر دی تھی ادارے نے اور ہمیں اس دفعہ بہت بھایا۔ باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے اور خط تو لاجواب تھے۔ افشین نعیم سے شکایت ہے کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ حسنہ حسین کو کہیں کہ جنت اور فارس کی طرح کے کردار لے کر آئیں۔ بہت شدت سے ان کی کسی تحریر کا انتظار ہے۔

ج۔ عزیز بہن! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ...... آپ کی شکایت افشین نعیم تک اور فرمائش حسنہ حسین تک ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

عارفہ فضل شاہ نے گاؤں حمید سے لکھا ہے

موسم کی تبدیلی کی وجہ سے گلا خراب اور بخار تھا لیکن شعاع ہاتھ میں ہو اور پورا نہ پڑھوں یہ بھلا ممکن ہے۔ سلسلے تو سارے ہی بہترین ہیں سوائے تجھ سے ناتا جوڑا کے۔ کیونکہ جس سسرال میں ہم دنیا جہاں کی خرابیاں جمع کرتے ہیں وہ بھی کسی پیاری کا مہکتا میکا ہوتا ہے اور جس میکے کو جنت ارضی بنا کر پیش کرتے ہیں وہ کسی لڑکی کا سسرال ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خود ساختہ مظلومیت سے نکلیں تو ہمیں پتا چلے کہ سسرال ہی برا نہیں، بہوویں بھی ناکوں چنے چبواتی ہیں۔ سب سے پہلے بات کروں گی اپنی فیورٹ رائٹر آسیہ رئیس کی۔ ہمیشہ کی طرح چھا گئیں لیکن اس ناول کا اختتام ایسا لگا جیسے جلدی میں کیا گیا ہے۔ یا آپ نے ایڈٹ کر دیا آخری صفحے پہ پہنچی تو لگا باقی آئندہ لکھا ہوگا لیکن یہ کیا...... ختم شد

آسیب اچھی تحریر تھی لیکن علاج اور بیماری کو کھول کے بیان کیا جاتا تو اچھا تھا بہت سی باتیں مبہم تھیں۔ ویسے

pklibrary.com

کہ پچھلے ماہ ہم آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ آپ کا خط موصول ہوا تو پرچا پریس جا چکا تھا۔ اس لیے آپ کے پچھلے خط کا جواب بھی اس ماہ دے رہے ہیں آپ کے تبصرے کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں سوائے تعریف کے۔ جس طرح آپ ہر تحریر اور ہر سلسلے پر تبصرہ کرتی ہیں، اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پرچے کی ہر تحریر پوری توجہ سے پڑھی گئی ہے۔

مزاحیہ تحریروں کی کمی تو ہمیں بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔ شاید ملک کے حالات تحریروں پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں پچھلے چند سالوں میں جو بدترین مہنگائی ہوئی ہے اس نے سب کے ہوش گم کر دیے ہیں۔ 14 اگست کے حوالے سے ہم تحریریں ضرور لکھوائیں گے، آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔

موسم کے پکوان کے بارے میں آپ کا اندازہ درست ہے کھاؤسے، کراچی میں آباد میمن برادری کی خاص ڈش ہے۔

یہ واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہے کہ آپ ہر ماہ خط لکھتی ہیں اور آپ کا خط شامل نہیں ہو پاتا لیکن کیا ہمیں پچھلے چار پانچ سال کے عرصہ میں ملک میں ایسے ہنگامی حالات رہے کہ سب ہی کچھ الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا ہر ادارہ ناقص کارکردگی کا شاہکار ہے محکمہ ڈاک کا تو بہت ہی برا حال ہے، آپ کا پچھلا خط اگر لیٹ نہ ملتا تو ہم ضرور شامل کرتے۔

زرینہ خانم لغاری نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے

سر پر دوپٹہ اوڑھے مہندی سے بازو سجائے حسینہ سرورق پر بیٹھی، مسکرا رہی تھی۔ آگے بڑھے حمد و نعت سے فیض یاب ہوئے، پیاری باتوں سے دل کو خوشبودار کیا، ناتا جوڑا کا مطالعہ کیا، مثبت ناتا تھا۔ ظالم سسرال نہ تھا، ایمن منیب خان پیارا کپل لگا۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ منصور احمد بھی مسکراتے ہوئے اچھے لگے۔ شعاع کے ساتھ دونوں بہنوں نے خوب لکھا۔ میرا خیال ہے وسیلہ اور منصب، بہن بھائی نہیں ہیں اگر نہیں ہیں تو ان کی جوڑی بنا دیں باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں تو تبصرہ بھی نہیں ہوگا...... مسکراہٹوں نے خوب ہنسایا۔ باتوں سے خوشبو۔ تربیت کا تعلق عمل سے ہے بہترین۔ کھتا کسی یہ دل کا معاملہ ریحانہ چوہدری کا شعر تھاہ کر کے دل کو لگا۔ بہنو مہنگائی آ گئی ہے اب گوشت کے بجائے دال کے کباب بنیں گے۔ اس کالی مسور کے جسے کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔

ج۔ زرینہ بہن! مہنگائی کا تو وہ حال ہے کہ کالی مسور کے بھی کباب مل جائیں تو غنیمت ہے، دالوں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں اچھے حکمران نصیب کرے آمین۔

شعاع آپ کو پسند آیا یہ جان کر ہمیں بھی بے حد خوشی ہوئی۔ تہہ دل سے شکریہ۔

مہوش خولہ راؤ...... ٹنڈو الہ یار (سندھ) سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے فرح بخاری کا ناول شہر شام ہجر پڑھا۔ ناول اچھا جا رہا ہے وسیلہ کے معاملے میں گھر والوں کا رویہ اس کی سسرال پر اندھا بھروسا حیران کن اور فلمی سچویشن ہی لگ رہی ہے۔ اصل میں ایسا ممکن نہیں۔ میں اپنی پسندیدہ مصنفات کے رائٹنگ اسٹائل کو اتنا پہچانتی ہوں کہ ان کی کسی بھی تحریر کی دو لائنز پڑھ کر بتا سکتی ہوں کہ یہ فلاں رائٹر کی تحریر ہے لیکن حیرت کی بات ہے فرح کا یہ ناول اچھا ہونے کے باوجود فرح کے بن پاکھی سے مختلف ہے۔ بن پاکھی جیسا اسٹائل اور انفرادیت پھر فرح کے کسی ناول میں نہیں آئی کیوں؟؟

اس کے بعد افسانے پڑھے حمیرا شفیع کا افسانہ آغاز میں اوپس لگا لیکن اینڈ مختلف اور اچھا تھا۔ قرۃ العین خرم ہاشمی لکھتی تو اچھا لیکن اس مرتبہ ان کا افسانہ سہو تھا۔ ہاجرہ ریحان میری پسندیدہ افسانہ نگار بہت باریک سے خیال پر قلم اٹھایا۔ افسانے کا نام بھی پاس گزار اچھوتا تھا۔ اس سے قبل اس نام کا ناول بھی نگاہ سے گزرا، البتہ مطالعے میں نہیں آیا۔

اصل العزیز کا والعصر بھی اچھا جا رہا ہے۔ تجھ سے ناتا جوڑا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اسے بند نہیں کیجیے گا۔ خط آپ کے اور سروے ہر سلسلہ پڑھا اور اچھا لگا۔

ج۔ پیاری مہوش! آپ کا خط تاخیر سے ملا، اس لیے ہم پچھلے ماہ شامل نہ کر سکے۔ اس ماہ شامل کر رہے ہیں۔

فرح بخاری کا اسٹائل آپ کو مختلف اس لیے لگ رہا ہے کہ اس ناول کا موضوع "بن پاکھی" سے یکسر مختلف ہے۔ موضوع کے مطابق ہی لکھا جاتا ہے چینا کی ہنڈکلیا ہمیں زیادہ پسند نہیں آئی۔

اس تحریر کو مزید بہتر بنایا جا سکتا کچھ اور لکھیں۔

بیماریاں اپنی جگہ آسیب کے معاملات بھی ہوتے ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ ''کس کے گھر پر'' ہنستی کھیلتی تحریر اچھی لگی۔ اللہ پاک آسیہ رزاقی کے درجات بلند فرمائیں آمین۔

وسیلہ رزق شروع کرتے ہی اختتام پتا تھا۔

گوشۂ عافیت۔ کمال تحریر، بہترین میسج۔ واقعی ایسا ہوتا ہے۔ لڑکیاں دل کا بوجھ ہلکا کرکے سسرال کی مصروفیات میں مگن ہوجاتی ہیں مائیں پریشان رہتی ہیں۔ اس لیے کوشش کریں ماں کا دل مطمئن ہی رہے۔

خوابوں کے پر شروع میں عام سی تحریر لگی مگر اختتام اچھا لگا۔ خاص طور پہ باپ کے بارے میں پازیٹو ریمارکس مشکل اور مجبوری بھی اچھے افسانے تھے۔

ج۔ پیاری عارفہ...... آپ کی تحریریں ''زیرغور'' کی لسٹ میں شامل ہیں۔

آپ کی یہ بات درست ہے کہ ماں باپ کو اپنی پریشانیاں یا تکلیفیں سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن شادی کے ابتدائی دور میں لڑکیاں نئی زندگی نئے ماحول سے سمجھوتا نہیں کرپاتیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہوجاتی ہیں۔ ایسے میں ماں سمجھ دار ہوتو وہ اپنی بیٹی کو سمجھاتی ہے۔ اسے حوصلہ دیتی ہے۔ لڑکیاں بھی دل کا بوجھ ہلکا کرکے خوش ہوجاتی ہیں کم عمری میں جوش زیادہ ہوش کم ہوتا ہے۔ جو ناعاقبت اندیش مائیں لڑکیوں کو سمجھانے کے بجائے بڑھاوا دیتی ہیں تو کبھی کبھی حالات اتنے بگڑ جاتے ہیں کہ علیحدگی کی نوبت آجاتی ہے۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

جی پیاری بہن اس بار شعاع 31 تاریخ کو ملا اور ماشاء اللہ اپنی خوب صورت اور دلکشی کے ساتھ دل میں سما گیا۔ تمام ناولز افسانے اتنے عمدہ لگے ہیں کہ تعریف کے لیے الفاظوں کا چناؤ مشکل ہوگیا ہے اب فرح بخاری کے شان دار ناول شام شہر ہجر جو کہ ہمارا دل پسند ناول ہوگیا ہے۔ بے حد لائق تعریف ہے تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ مصنفہ سے ایک ملاقات یا انٹرویو تو ضرور ہوجائے اور جناب نعیمہ ناز کے آسیب کی بھی کیا بات ہے۔ بہترین ناولز کی صف میں اس کا نام ہے اور مسافتیں سمیٹ لو ماشاء اللہ آسیہ رئیس خان نے زبردست لکھا ہمیں تو بہت بہت پسند آیا اس کے علاوہ آسیہ رزاقی کی کہانی کس کے گھر پر اچھی لگی مگر بھئی یہ راز تو راز ہی رہا کہ فون کس نے کیا تھا۔ لگتا ہے یہ کارروائی سمانہ نے انجام دی ہوگی آپ کا کیا خیال ہے۔ میں ایک سر ہوں لبنیٰ آصف کی داستان بس مناسب تھی۔ بھئی بہت ہوگئے یہ دکھڑے لن ترانیاں سوری ویری سوری اب ذرا بات ہوجائے پیاری سی مصنفہ حمیرا شفیع کے پیارے سے ناول گھروندہ پر، بھئی بہت خوب بہت پیارا لکھا ہے ویسے بھی حمیرا کی کہانیاں ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہیں اور اسی طرح ایک اور پیاری سی رائٹر سونیا ربانی بھی کسی سے کم نہیں۔ مجبوری تھی بہت عمدہ اور ایک اچھی سی نصیحت سے بھی ان کی اسٹوری کو ہم نے دل سے پسند کیا اور گوشہ عافیت کو سرور فاطمہ ہنی نے اچھا لکھا ہم نے ان کو بھی پاس کردیا۔ ریحانہ چوہدری کے خوابوں کے، پر بھی حیرت ہوئی ایسا بھی کیا مارنا پیٹنا کہ بچے کو معذور ہی کردیا ویسے اتنا ہوتا تو نہیں ہے مگر خیر کہانی میں تو سب چلتا ہے۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں سونیا ربانی سے ملاقات اچھی لگی۔ باقی تمام سلسلے بہت اچھے رہے خاص طور پر پیارے نبی کی پیاری باتیں اور باتوں سے خوشبو آئے کا جواب نہیں یہ تو دل کو چھوتی ہیں۔ دلکش محفل خط آپ کے تو شعاع کی جان ہے بہت مزا آتا ہے سب پیاری قارئین بہنوں کے خط پڑھ کر۔

پیاری تسنیم تہہ دل سے ممنون ہیں کہ شعاع کا شمارہ آپ کو پسند آیا۔ مارنے پیٹنے پر آپ کو حیرت کیوں ہوئی۔ یہ تو عام بات ہے بچہ فیل ہوجائے یا اس کے نمبر کم آئے تو والد صاحب ڈنڈا اسنبھال لیتے ہیں اور مائیں بھی پیچھے نہیں رہتیں، یہ نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سب کی صورتیں ایک جیسی نہیں بنائیں اسی طرح ذہن بھی مختلف بنائے ہیں کچھ لوگوں کا پڑھائی میں ذہن نہیں چلتا جبکہ کچھ لوگ کتابی کیڑے ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس کا ذہن پڑھائی میں نہیں چلتا وہ زندگی میں کچھ اور کرہی نہیں پائے گا۔ بہت سے لوگ جو اچھے طالب علم نہیں ہوتے وہ عملی زندگی میں بہت کامیاب رہتے ہیں۔

☆☆

آمنۃ العزیز شہزاد

والعصر

وریٰ اپنی نانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔ جو وریٰ کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔

بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ نانی وریٰ کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آ جاتی ہے۔

پولیس کا نام سن کر بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پر سکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر فاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو تربیتی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ فاروق احمد تھوڑا تلخ ہے۔

عباد، وریٰ کو پڑھانے آتے ہیں، وریٰ بتاتی ہے کہ وہ کمپائن امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر سبجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔

شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خودسر ہے۔ وہ عیسیٰ سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسیٰ کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

وریٰ کو وسہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے عیسیٰ سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کر کے دیکھے علائنہ سے متعلق خبر آ رہی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علائنہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔

وریٰ پیپر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے مفتاح چھوڑنے جاتا ہے، واثلہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

اینا عامر سے کہتی ہے کہ عیسیٰ سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروا دے۔

سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسیٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

وریٰ جلدی سے پیپر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔

آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہے خولہ کو موقع مل

جاتا ہے کہ وہ فون کرلے وہ فون کرتی دوسری طرف فون اٹھالیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔

شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ فاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائنہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملتے ہیں۔

عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کر دیا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت سست کہتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرنل غائب ہوتا ہے۔

بی ذی اپنا پروموشنل ٹرپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائنہ خان قتل کیس کے سلسلے میں بی ذی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بی ذی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔

شاکر کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کینیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں بات کرتی ہے۔

وریٔ ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ وریٔ حامی بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے عیسیٰ آجاتے ہیں۔ وریٔ ڈر جاتی ہے۔

عامر بالی سے مل کر ماں اور عیسیٰ کی شکایت کرتا ہے۔ بالی اپنی کم عمری کی شادی اور غصیل شوہر کی وجہ سے پہلے ہی ناراض تھی۔ وریٔ بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے اجنبی لڑکی کے فون استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔

نمبر نہ نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت سست سناتا ہے۔

سہراب وریٔ کے بچ نکلنے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے فکر ہوتی ہے کہ عیسیٰ نے اپنے گھر والوں کو سب بتا نہ دیا ہو۔

pklibrary.com

وری رجا سے بات کرتی ہے۔

بائیسویں قسط

اے رب
اے سکوت وطوفان کے رب
اے ابن آدم کے رب......
کیا تو واقف ہے؟
کہ
موج حوادث میں تنکے کی مانند بہتا شخص
کتنی شدت سے تجھے پناہ کے لیے پکارتا ہے؟
لمحہ بہ لمحہ وجود جب غرق آب ہو رہا ہو،
تو زندگی کتنی آس سے تیری سمت دیکھتی ہے؟
اور سانسیں جب چند ساعتوں کی مہمان رہ جائیں،
تو ختم ہونے سے پہلے، تیرا نام لیتے سے انسان رنج کی کس کس
منزل سے گزرتا ہے؟
ہاں، تو واقف ہے!
مگر پھر اپنی مصلحت کا نام دے کر اسے پار نہیں لگاتا......
تو اے خالق بے نیاز
پھر ابن آدم کی دعا کا صلہ کیا ہے؟

☆☆☆

"ہاں بیٹی! وہ اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر بہتی آنکھوں سے بولیں، "میں نے تمہارے والد سے رابطہ کر کے تمہیں اس کے پاس بھجوانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"جی؟" تحیر کی اگر کوئی حد ہوتی تو لیاقت بیگم کی بیان کردہ تجویز سن کر اس وقت وری اس پر کھڑی تھی......

"ہاں بیٹی......" نہ صرف اس کے لہجے بلکہ اس کے من موہنے چہرے پر بھی اس سے رنج آمیز بے یقینی کا ایک ایسا تاثر ابھرا تھا جسے دیکھ کر لیاقت بیگم بے ساختہ نظریں چرانے پر خود کو مجبور پا کر آہ سے مشابہ لہجے میں بولیں۔

"یہ فیصلہ میرے لیے بھی سہل نہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ اب اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی تو نہیں۔"

"اور کوئی حل نہیں؟" ہاں درست کہ وہ اپنے "من چاہے" کو پانے کی خاطر اپنے تئیں "حکمت عملی" سے کام لے کہ بہت محتاط قدم اٹھا رہی تھی مگر اس لمحے جیسے ہر مصلحت آمیز جذبہ کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ غالب تھا تو فقط ایک احساس......

ٹھکرائے جانے کا......اپنی ذات کی نفی کا احساس......

سو وہ بے طرح بدک کر بولی۔

"اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ مجھے زہر دے دیں نانی بیگم! اگر میرے سامنے اس شخص کا نام بھی مت لیں جو میری اس آدھی ادھوری زندگی کا ذمے دار ہے۔"

اپنے نام سے جڑے اس نام نہاد رشتے کا ذکر آ جانے پر ہمیشہ ہی وہ تلخ ہو جاتی تھی پھر آج نہ جانے کیا ہوا

کہ وہ پھپھک کر رو پڑی.....

''نہ میری بچی.....'' لیاقت بیگم نے جو اسے یوں بکھرتے دیکھا تو جھٹ سے اپنے نحیف و نزار بازوؤں کے ناکافی حصار میں سمیٹ لیا۔

''ایسے مت رو..... نانی کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔''

''آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اس آدمی کے پاس چلی جاؤں گی۔''

''مجبوری سے زور آور میں نے دنیا میں اور کوئی شے نہیں دیکھی وریٰ..... اس کی طاقت سب کچھ کروا دیتی ہے۔''

''اگر ایسی ہی مجبوری ہے مجھے گوشہ عافیت سے دفع کر دینے کی تو اس کا تو ایک اور حل بھی موجود ہے۔''

''کیسا حل؟'' لیاقت بیگم کی بوڑھی پریشان نگاہوں میں امید کا ایک مدہم سا جگنو جھلملایا۔

''وہ..... جو..... سر عیسیٰ ہیں'' وہ ان کے شفیق بازوؤں کے گھیرے سے باہر نکلتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ''آپ ان سے بات کیجیے۔''

''میں اس سے کیا بات کروں؟'' لیاقت بیگم چونکیں۔

''وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے نا۔'' وہ محتاط لہجے میں مزید بولی۔ ''آپ انہیں یہ موقع دے دیجیے نانی بیگم..... میں اب تیار ہوں۔''

☆☆☆

''وہ ہم کہہ رہے تھے نے بھیا کہ اماں جو رقم آپ کو ادھار دلوائی تھیں، وہ ہمیں لوٹا دیجیے..... ہم کا بہت ضرورت ہے نے۔''

سہ پہر ساڑھے تین کا عمل تھا۔ اور وہ نا جانے کس کھوج میں چلتا گھر کے عقبی حصے میں نکل آیا تھا۔ جہاں صحن پختہ تھا پر کنارے یوں ہی کچے چھوڑ کر وہاں کیاریاں بنائی گئی تھیں۔ کسی زمانے میں یہاں طرح طرح کی خوش نما سبزیاں اگی دکھائی دیتی تھیں۔ اور آج..... یہ کیاریاں کچرے دان میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ آم کے گھنے درخت پر اب آم نہیں، بس بور آ کر جھڑ جاتا تھا۔ کپڑے دھونے کا گھرا، جو پہلے چم چماتا دکھائی دیتا تھا، اب کائی زدہ سا تھا.....

تبدیلی کے نشان جگہ جگہ ثبت تھے، وہ تبدیلی کہ جس کی ابتدا چند سال قبل ہوئی تھی اور جس کے اختتام کے آثار تا حال نہ تھے.....

وہ مضمحل سا آم کے درخت کے ساتھ دھرے بدرنگے تخت پر بیٹھ گیا..... اور تھک کر آنکھیں موند لیں۔ پلکوں کے کواڑ بند ہوتے ہی یادوں کا دریچہ خود بخود وا ہو گیا تھا۔

عامر کی شادی کے چند ہی ماہ بعد شارجہ کی نوکری میں لگ گئی تھی، سو انہوں نے اپنے خاندان سمیت وہاں منتقل ہونے میں چنداں تاخیر نہ برتی..... طاہر گریجویشن کے بعد ایک معمولی سی جاب کر رہا تھا حالانکہ فیروزہ کی خواہش تھی کہ طاہر اسے اپنے ساتھ کارخانے میں لگا لے مگر.....

وہ ان دنوں انٹر کے امتحانات دے کر فارغ ہوا تھا.....

آج اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی..... تازہ دم ہونے کے بعد جب وہ اپنے اور طاہر کے مشترکہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آیا، اس سے سرمئی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس فیروزہ، چہرے پر پریشانی لیے، اپنے بالمقابل چہرے مہرے سے بے پرواہ و من موجی دکھائی دینے والے اپنے بڑے بھائی سے مخاطب تھیں جو آج بڑے دن بعد ان کے ہاں وارد ہوئے تھے۔

''کون رقم کون سی کا بات کرتی ہو؟'' وہ آنکھیں چھوٹی کر کے پرسوچ سے انداز میں ان کی جانب دیکھ کر

بولے۔

''وہ اماں لی تھیں۔ چند برس پہلے آپ کو کاروبار کروانے کے واسطے۔''

فیروزہ نے سادہ سے لہجے میں یاددہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''اچھا آآ......'' وہ اپنے سرسوں کے تیل سے چپڑے، ماتھے پر چپکے دوچار بال پیچھے کرتے ہوئے بولے۔ ''پر ہمیں تہ ایسا کوئی رقم یاد ہی نہیں آرہا ہے نے۔''

''اماں سے پوچھیے نے جاکر۔'' فیروزہ بے چارگی سے بولیں۔ ''جب سید صاحب یہ گھر بنائے تھے، وہ تب ہی لے کر گئی تھیں نے۔''

''اماں کا کھوپڑی چوپٹ ہوگیا ہے نے۔'' وہ اب کی بار ذرا بگڑ کر بولے۔ ''انہیں کہاں کچھ یاد رہتا ہے نے۔''

''پر ہمیں تو رقم چاہیے بھیا۔'' فیروزہ روہانسی سی ہو کر بولیں۔ ''ہم بہوت پریشان ہیں۔''

''تم کا ایسا کیا پریشانی ہے۔'' وہ یقین نہ کرنے والے انداز سے بولے۔ ''اگر کوئی ہے تو اپنا بیٹا لوگ سے مانگو...... وہاں ظاہر کارخانہ لیے بیٹھا ہے، ہم سنے ہیں کہ شاکر بھی اچھا کمار ہے ہیں اوہاں...... اور آج ہم ادھر اسی لیے تو آئے ہیں تاکہ تم سے کہیں گے ہمرے ثاقب کا بھی شاکر سے کہہ سن کر وہیں کہیں نوکری لگوا دو نے۔''

''اچھا''۔ فیروزہ اپنی پریشانی بھول کر ان کے مسئلے میں دل چسپی لیتے ہوئے بولیں۔

''ثاقب پڑھائی کرلیا ہے کیا پوری؟''

''نہیں...... ابھی نہیں۔'' وہ بولے۔ ''ابھی سال چھ مہینہ رہتا ہے۔ پر تم ابھی سے بات کر دو نے شاکر سے...... پھر نوکری ملنے میں وقت بھی تو نا لگتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے نے۔'' فیروزہ متفق ہو کر بولیں۔ ''اور بڑکی (بڑی بیٹی) کیسی ہے آپ کی۔''

''شوہر کا نوکری چھوٹ گیا ہے اس کا، پریشان ہے ان دنوں۔''

''آہ...... بے چاری۔''

انہوں نے فیروزہ کے سامنے اپنے مسائل کی پٹاری کھول لی تھی...... عیسیٰ کچھ دیر تو سنتے گیا پھر جز بز ہو کر انہیں مخاطب کر بیٹھا۔

''امی...... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتہ دے دیجیے۔''

''اپنی اماں کا خیال کیا کرو بیٹا۔'' وہ اب فیروزہ کے سگے بن کر عیسیٰ کو سمجھانے لگے۔ ''یہ عمر تھوڑی نا ہے ان کا کام کرنے کی...... تم جاکر عامر وا کی بیوی کو بولو نے...... وہ بنا کر دے دے گی تم کا ناشتہ۔''

اور عامر کی بیوی نے چونکہ دوپہر سے قبل اپنے ٹھنڈے کمرے سے باہر برآمد ہونا نہیں تھا، سو وہ بنا کچھ کہے باورچی خانے میں جاکر ڈبل روٹی تلاش کرنے لگا۔

کہ پیٹ بہر حال کسی نہ کسی طور تو بھرنا ہی تھا۔

☆☆☆

''دیکھو یہ اے پلس بی اسکوائر از اکیول ٹو بی پلس۔''

عیسیٰ اس وقت اپنے شاگرد کو الجبرا کا کوئی سوال سمجھانے میں منہمک تھا کہ تب ہی پتلون کی جیب میں رکھا اس کا سیل فون بج اٹھا۔

اس کے انہماک میں خلل واقع ہوا تھا۔ سو اس نے ماتھے پر دو بل ڈالتے ہوئے قلم کھلے صفحے پر رکھ دیا۔ اور مسلسل بجتا فون، گہری نیلی جینز کی جیب سے نکال کر دیکھا...... کوئی انجان نمبر تھا...... اسے اکثر و بیشتر انجان نمبروں سے ٹیوشنز پڑھانے کے حوالے سے کالز موصول ہوتی رہتی تھیں سو وہ اس وقت وہی سمجھا۔ مگر کال یوں

pklibrary.com

نظرانداز کردی کہ اولاً سامنے منتظر نظروں سے اپنی جانب تکتے اپنے شاگرد کو یہ سوال اچھی طرح سے سمجھا دے بعد ازاں دیکھی جائے گی۔ مگر کال کرنے والا اس قدر بے صبر تھا کہ لحاتی وقفے کے بغیر ایک بار پھر فون چلا اٹھا......

"اچھا...... تم اس کی مشق کرو۔" متواتر موصول ہوتی کال نے اسے ذرا فکر مند کر دیا تھا کہ خدانخواستہ کوئی ہنگامی معاملہ ہی نہ ہو، تب ہی وہ بچے کو کام دیتے ہوئے بولا۔ "میں پھر آگے بتاتا ہوں۔"

بچہ فرماں برداری سے سرا ثبات میں ہلا کر رجسٹر پر جھک گیا تھا...... تب وہ بے قرار فون کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"السلام علیکم۔" سبز بٹن دباتے ساتھ ہی اس نے عادتاً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔"

"جی؟" دوسری جانب سے ابھرنے والی ایک نسوانی، قدرے شناسا سی آواز سن کر وہ بڑے بھرپور انداز سے چونک کر بولا۔ "کون صاحبہ بات کر رہی ہیں۔"

"میں لیاقت بیگم بات کر رہی ہوں۔" وریٰ کی رضامندی کے بعد گوشہ عافیت میں لیاقت بیگم نے آخری کوشش کے تحت ہنگامی بنیادوں پر سب بڑوں کو اپنے کمرے میں طلب کر کے وریٰ کے مسئلے کو حل کرنے کی یہ صورت سب کے سامنے رکھ دی تھی...... جس پر سب سے پہلے تو عارف احمد نے برملا ناپسندیدگی کا اظہار کر ڈالا، تب شریفہ "ابھی نہیں تو کبھی نہیں" والے انداز میں کمر ٹھونک کر میدان میں اتریں اور ظالمانہ حقیقت پسندی سے صورت حال کا وہ نقشہ کھینچا کہ سب اپنی اپنی جگہ چپ کے چپ رہ گئے۔

سونے پر سہاگہ نائن کا تازہ ترین بتایا گیا کسی عمر رسیدہ شخص کا رشتہ...... اب ایسے میں کہ جب گوشہ عافیت میں وریٰ کا کوئی جوڑ بن ہی نہیں رہا تھا تب اور کیا کیا جا سکتا تھا؟ حالانکہ عارفہ کے دل میں وریٰ کے لیے نرم گوشہ موجود تھا مگر عرصم کی خواہش، سو بے انداز مجبوری کے تحت یونہی طے ہی پایا کہ عیسیٰ کو گھر بلا کر بات کی جائے، سو شریفہ کے سیل سے اس وقت لیاقت بیگم اس سے مخاطب تھیں۔

"کون لیاقت بیگم" ۔وہ کچھ الجھ کر بولا۔ "میں پہچان نہیں سکا آپ کو۔"

"میں بدر لوریٰ کی نانی۔" وہ گمبھیرتا سے بولیں۔ "اب تو اچھی طرح پہچان گئے ہوگے؟"

"اوہ......" اس تعارف پر اس کے جبڑے بھنچ گئے...... "جی فرمائیے۔"

"تم آج شام کو گھر آؤ ہمارے۔" وہ غیر معمولی سنجیدگی سے بولیں۔ "ہمیں تم سے بات کرنی ہے۔" ان کا لہجہ تحکمانہ نہیں تھا مگر پھر بھی ان کے الفاظ اسے گراں گزر رہے تھے، تب ہی کھردرے لہجے میں بولا۔

"کیا بات کرنی ہے؟ آپ ابھی کرلیں۔"

"بات کچھ اس نوعیت کی ہے کہ فون پر نہیں کی جا سکتی، تمہیں گھر آنا پڑے گا بچے......" ان کے پست لہجے میں اس درجہ لجاجت تھی کہ اسے حیا آ گئی، تب ہی وہ کچھ نرم پڑ کر بولا۔

"ٹھیک ہے...... میں کل شام میں آتا ہوں۔"

☆☆☆

"علائنہ خان کو فلم سے نکلوایا تھا اس کی سزا...... اس کی سزا......

"اس کی سزا......"

اس وقت تو بس۔ ذی کو قابو کرنے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر ڈاکٹر امجد کو طلب کیا گیا تھا...... انہوں نے آ کر مسکن انجکشن دیا تو وہ کچھ دیر کو ہوش خرد سے بیگانہ ہو گئی۔ سہ پہر کی سوئی، رات گئے بیدار ہوئی تو وہی الفاظ گویا کوئی چیخ چیخ کر اس کے کانوں میں دہرانے لگا۔ وہ بے بسی سے بے اختیار رو پڑی۔

pklibrary.com

''نہیں، صرف اسی ایک بات کی سزا تھوڑی ملے گی مجھے۔'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔
''میں بہت گنہگار ہوں..... بہت گناہ گار ہوں۔'' وہ اب سرہانے دھرا لاکٹ ہاتھ میں لے کر اس کے پینڈنٹ پر لاشعوری طور پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسی بات کی گردان کیے چلی جا رہی تھی۔
اس سے یقیناً وہ اپنی دگرگوں حالت کے زیر اثر خولہ کی اس کمرے میں موجودگی یک سر فراموش کر چکی تھی..... مگر صوفے پر اب سے کچھ ہی دیر قبل آ کر دراز ہونے والی خولہ چونکہ اس کی خود کلامی بخوبی بھی سن چکی تھی۔ سو وہیں سے بولی۔
''انسان چاہے کتنا بھی خطا کار کیوں نہ ہو؟..... معافی کا در تو کھلا ہی رہتا ہے..... ہم چاہیں تو کبھی بھی رجوع کر سکتے ہیں۔''
اس کی آواز پر بی۔ ذی نے بے طرح چونک کر اس کی سمت یوں دیکھا گویا ابھی ابھی ہوش میں آئی ہو.....
''میں نہیں جانتی کہ تمہارا ماضی کیا ہے؟'' خولہ، مدھم ملائم لہجے میں گویا تھی۔ ''پر اتنا ضرور سمجھ گئی ہوں کہ تم اور میں جو اس چھت تلے یک جا ہیں تو اس کے پیچھے کا تب تقدیر کی کوئی حکمت تو ضرور پوشیدہ ہے۔ اور وہ حکمت ہے کیا۔ فی الوقت میں سمجھنے سے قاصر ہوں..... پر تم سے اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر تم چاہو تو اپنے دکھ درد مجھے سنا سکتی ہو..... جانتی ہو بعض اوقات کیسی سامع کا میسر ہونا بھی کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتا.....''
یہ نعمت فی الحال اسے میسر تھی سو وہ بولے چلی جا رہی تھی اور حیرت انگیز امر یہ تھا کہ بی ذی اسے خاموشی سے سن رہی تھی۔
بالکل خاموشی سے۔

☆☆☆

''یہ میں کیا سن رہا ہوں وریٰ؟''
وہ ٹیرس پر پڑے جھولے میں دونوں پاؤں اوپر کیے، گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے۔ اداسی میں گھری بیٹھی، خاموش نگاہوں سے سامنے آسمان کے فراخ سینے پر الوداعی گرنوں میں نہائی بادلوں کی اکا دکا ٹکڑیوں کو تیرتا دیکھ رہی تھی کہ تب ہی اچانک وہاں مفتاح آدھمکا اور بڑے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔
''کیوں؟'' اس نے ذرا کی ذرا چونک کر گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ ''کیا سن لیا؟''
''یہی کہ تم اس نامعقول سے رشتہ جوڑنے پر رضا ہو گئی ہو۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''کیا یہ خبر درست ہے۔''
''ہاں۔'' اس کے بپھرے انداز کے برعکس وہ بہت پرسکون لہجے میں بولی۔
''کیا واقعی؟'' وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ شوشا بھی والدہ ماجدہ ہی کا چھوڑا ہوگا مگر.....
اب وریٰ کے اقرار نے اسے اپنی جگہ ششدر کر کے رکھ دیا۔
''ہاں مفتاح۔'' وہ سنبھل کر سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''واقعی''
''مگر کیوں وریٰ۔'' وہ پریشان ہو کر احتجاجاً بولا۔ ''تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔''
''میں ایسا اس لیے کر سکتی ہوں کیونکہ میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں۔''
''آپشن ہے، بالکل ہے۔''
''کہاں ہے؟'' وریٰ نے ترنت پوچھا۔ تو وہ بھی ترنت ہی بولا۔
''وہ عبا.....'' مگر پھر ایک دم ٹھہر گیا۔ ''لیکن نہیں..... اب پانی سر سے اونچا ہو رہا تھا۔ اسے عباد سے بات کرنا ہی ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا۔
''ہاں بتاؤ نا مفتاح.....'' اسے گومگو کی کیفیت میں کھڑی دیکھ کر وریٰ استہزائیہ بولی۔ ''کہاں ہے وہ آپشن؟''

"کیسا آپشن؟" رجا، جسے یقین تھا کہ مفتاح یہیں ہوگا اور اسی لیے وہ چائے کے تین کپ ٹرے میں رکھ کر لائی تھی، ٹیرس میں داخل ہوتے ہوئے وری کی بات کا کچھ حصہ سن چکی تھی، اس لیے کچھ چونک کر خلاف عادت ایک دم سوال کر بیٹھی۔

"یہ کہہ رہا تھا کہ میرے پاس سر کے علاوہ بھی اور بہت سے آپشن موجود ہیں۔" وہ جیسے مفتاح کی بات کا مضحکہ اڑاتے ہوئے ہوئی بولی۔ "اب پوچھ رہی ہوں کہ وہ آپشن آخر ہیں کہاں تو یہ چپ کھڑا ہے۔"

"ہوں......" رجا نے جھولے کے نزدیک بڑے لکڑی کے سال خوردہ اسٹول پر ٹرے دھرتے ہوئے ایک سنجیدہ سا ہنکارا ابھرا۔ پھر یک لخط کچھ سوچ کر مشتعل مگر بے بس کھڑے مفتاح کی جانب گھومی۔

"جو کرنا چاہتے ہو۔" وہ اس کے بالمقابل کھڑی ہو کر عار دلانے والے لہجے میں بولی۔ "وہ مردوں کی طرح کھل کر کر ڈالو...... ورنہ جو ہو رہا ہے، اسے ہو جانے دو۔"

پھر ایک زخمی نگاہ اس پر ڈال کر سرعت سے ہٹ کر ٹیرس عبور کر گئی۔

"یہ...... یہ...... کیا سمجھ رہی ہے؟" پہلی بار اس کی آنکھوں کے تاثر نے مفتاح کو ٹھٹکایا تھا۔

"ایسے ہی چلی گئی...... اپنی چائے بھی نہیں پی......" مفتاح متفکر ہوا۔

جب کہ ان دونوں سے بے نیاز اپنا کپ لیے وری ٹیرس کی ریلنگ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی۔

اسی لمحے شام نے دم دے دیا اور اب سیاہ رات کا جنم ہو رہا تھا۔ اس کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے رب کا پہلا ابلا وا فضاؤں میں بکھر اتھا۔ پر اس بار بھی اس کی توجہ کا ارتکاز کہیں اور تھا۔

☆☆☆

"بچہ پیدا کرنے جا رہی ہے تو اس کا، کیا اب بھی کوئی مکان، کوئی دوکان اپنے نام نہیں لگوائے گی۔"

دانے دنکے کی تلاش میں سرگرداں ایک بھوری چڑیا، صحن میں اترنے سے قبل بس لمحے بھر کو اس کے کاندھے کی مہمان ہوئی تھی۔

ادھر اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، ادھر وہ پھر سے اڑ کر کھرے پر جا بیٹھی اور وہاں بچھی کائی میں اپنا رزق حاصل کرنے لگی۔

سو اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نہ کرتا، تب بھی اس منظر نے اس کی جان خلاصی پر آمادہ نہ ہونا تھا جو نگاہوں کا پردہ گرتے کے ساتھ ہی پلکوں کی دہلیز پر آ بیٹھا تھا۔

رینا کے ہاں عنقریب پہلی ولادت متوقع تھی۔ اور اس روز اس کی ہمشیرگان نے میکے میں جمع ہونا تھا سو وہ بھی چلی آئی تھی۔

برنس روڈ سے منگوائے گئے نمکین گوشت، چپلی کباب کی دعوت اڑانے کے بعد اب سبز قہوے کا دور چل رہا تھا اور ساتھ ہی ان سب کی زبان بھی...... اور رینا سے یہ سوال اس کی دوسرے نمبر والی بہن نے بڑے سنسناتے لہجے میں پوچھا تھا۔

"کہہ تو رہا ہے وہ کہ یہ والا گھر میرے نام کروا دے گا۔" ڈھیلے سے سرخ ٹراؤزر، شرٹ میں ملبوس، دوپٹے سے بے نیاز حال سے بے حال بیٹھی رینا تفاخر آمیز لہجے میں بولی۔

"اچھا؟" سرتاپا طلائی زیورات سے لدی پھندی صاعقہ، جس نے ان ہی دنوں ایک قریب المرگ مال دار سنار سے پانچواں عقد کیا تھا کچھ طنزیہ سے لہجے میں بولی۔ "یہ کام اتنا آسان ہے کیا؟"

"رینا چاہے تو اتنا مشکل بھی نہیں۔" ہما اسے اکسا کر بولی۔ "کیوں؟"

"ہاں تو اور کیا۔" رینا کو صاعقہ کا طنز پسند نہیں آیا تھا سو اتراہٹ سے بولی۔ "جان دیتا ہے عامر مجھ پر، میں جو کہوں گی، آرام سے کر جائے گا۔"

''چل..... چل.....'' پشاور سے ان دنوں کراچی آئی ہوئی نجمہ بے حیائی سے ٹھٹھا لگا کر بولی۔ ''بچہ ہو جانے دے ذرا، پھر پوچھیں گے کہ تیری کتنی بات مانتا ہے۔''

''مانتا تو ہے۔'' وہ تیز ہو کر بولی۔ ''اب دیکھو نا، کیسے میری فرمائش پر میری گود بھرائی کی رسم کروائی اس نے۔ حالانکہ بڑھیا کہتی بھی رہی کہ ہمارے ہاں ایسا کھلا ڈلا رسم نہیں ہوتا ہے۔'' اس نے بھونڈے پن سے فیروزہ کے لب و لہجے کی نقالی کی تو وہ ساری ہنس ہنس کر دہری ہو گئیں۔

''ان نمونوں کے ساتھ رہ کر سرسوں کے بدبودار تیل میں پکے کھانے کھانا تیرا ہی حوصلہ ہے۔'' چوتھے نمبر والی نگینہ جھرجھری لے کر بولی۔

''ہاں، پتلی دال اور چاول دیکھ کر میری تو بہت طبیعت خراب ہوتی تھی۔'' وہ نزاکت سے یوں بولی گویا کسی ریاست کی شہزادی ہو..... ''میں نے تو پہلے ہی دن عامر کو صاف کہہ دیا تھا کہ میں نہیں کھا سکتی اس طرح کا کھانا..... وہ بولا..... تو کون کہہ رہا ہے تمہیں کھانے کو..... جو دل چاہے پکا لیا کرو.....''

''ہائے، تو کیا تو اتنی گرمی میں کھڑی ہو کر کھانے پکاتی ہے۔''

رخسانہ نے اتنے تاسف سے سوال کیا تھا کہ ریتا کو اپنا آپ بہت بے چارہ سا لگا..... تب ہی منہ بسور کر بولی۔

''ہاں! کھانا تو پکانا پڑتا ہے وقت پر..... نہیں تو اس بڑھیا کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ شوگر کی مریض ہے نا۔''

''اف اللہ..... ظلم'' نجمہ افسوس کرنے لگی۔ ''تو بہانے بنا کر مت پکایا کر۔''

''میں نے تو بہانے بنانے کی بہت کوشش کی ہے مگر وہ کمینہ عیسیٰ۔'' اس نے یوں دانت پیسے گویا دانتوں کے درمیان عیسیٰ کی موجودگی کا تصور کر رہی ہو۔ ''وہ سمجھ کر میری ہر چال الٹا دیتا ہے۔''

''تو انتظار کس بات کا کر رہی ہے؟ بندوبست کر اس کا۔''

ہما معنی خیزی سے بولی..... تو ریتا پراسراریت سے مسکرا دی۔

''چھوڑ دوں گی تھوڑی اسے..... پورا پکا انتظام کروں گی اس کا۔''

☆☆☆

''وری! کیا کر رہی ہو؟''

رات جب واشلہ اپنے نیم مردہ ڈبے (ٹی وی) پر لگا ورشہ نامی کوئی قبل از مسیح زمانے کا پروگرام دیکھنے میں منہمک تھی اور رجا سلگتے دل کو راحت پہنچانے کا کوئی کارگر ٹوٹکا، شعاع کے تازہ بر بہ تازہ شمارے میں تلاش کر رہی تھی۔ تب ہی دروازے پر زور زور سے دستک دی گئی۔

مفتاح تھا..... سو سر ہانے پڑا دوپٹہ الٹا سیدھا اوڑھ کر اسے اندر آنے کی اجازت دے دی گئی جس نے کمرے میں دیوانہ وار داخل ہو کر خاصے محسوس کیے جانے والے اتاؤلے پن سے وری کو مخاطب کر کے اس سے پوچھا تھا۔

اب وہ کیا اسے یہ بتاتی کہ وہ اپنے سفید و گلابی سوتی چیک دار پاجامے کی جیب میں گونگا فون چھپائے سہراب کی کال کا انتظار کر رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ چنانچہ خاصی بے زاری سے بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''کیا آپ لوڈو کھیلنے کے لیے بلا رہے ہیں وری کو؟'' رجا تو ان دونوں سے انجان سی بن گئی تاہم واشلہ ٹی وی اسکرین سے چپکی نگاہیں ہٹا کر ذرا سی خوش ہو کر گویا ہوئی۔

''آں..... ہاں..... نہیں..... وہ یہ نہیں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا اپنا سیل وری کے سامنے کرتے ہوئے لہجے کو حتی المقدار سرسری سا بناتے ہوئے کہا۔ ''عباد بھائی ہیں فون پر..... وہ تم سب سے بات کرنا چاہ رہے

تھے۔"

اس نے کس دقت سے راضی کیا عباد کو اپنے جذبات وری تک پہنچانے کے لیے، یہ وہی جانتا تھا..... یہ اور بات کہ واثلہ اور رجا کے سامنے یہ صاف صاف کہتے کہ عباد وری سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ جھجک گیا تھا، تب ہی بات بنا کر اس قدر کہہ پایا۔

"عباد بھائی۔" واثلہ یہ سن کر اپنے بستر سے اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے دیں..... مجھے دیں۔"

وہ اتنی پرجوش ہوگئی تھی کہ چار و ناچار فون اسے دیتے ہی بنی۔ اس کے بعد رجا..... پھر جب تک وری کی باری آئی تب تک جیب میں رکھا اس کا فون تیسری مرتبہ تھرتھرا کر خاموش ہو چکا تھا۔ سو ظاہر ہے اس کا تو سارا کا سارا دھیان اس جانب تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے مفتاح کا اپنی جانب بڑھایا جانے والا فون تھام لیا۔

"ہیلو عباد بھائی۔" وہ جیسے زبردستی بولی۔

اور دوسری جانب ایک معنی خیز سی خاموشی چھا گئی کہ اتنے دن بعد راحت جاں کی شیریں آواز جیسے انہیں کیف و سرور کی کیفیت کے زیر اثر لے گئی تھی۔

"ہیلو..... ہیلو" اچانک ہی اس کے ذہن رسا نے اسے ایک تدبیر سجھائی تھی سو وہ بار بار ہیلو بولے گئی۔

"ہیلو وری....." بالآخر وہ اپنا پگل جانے والا دل بمشکل تھام کر بولے تھے۔ "کیسی ہو؟"

"ہیلو عباد بھائی۔" وہ ان کی بالکل صاف سنائی دینے والی آواز سے یک سر انجان بن کر بولی۔ "آواز نہیں آرہی آپ کی۔"

"آواز نہیں آرہی تو عینا بجو کے روم میں جا کر بات کر لو نا۔" مفتاح نے گویا اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں سگنل کلیئر آتے ہیں۔"

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں..... سو وہ بنا وقت ضائع کیے فوراً سے پیش تر عینا کے کمرے میں آگئی اور دروازہ مقفل کر لیا۔

"ہیلو وری؟ میری آواز آرہی ہے؟" عباد اب ذرا پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔ پر اس نے بنا جواب دیے بڑی سہولت سے رابطہ منقطع کر دیا اور پاجامے کی جیب سے فون نکال کر جلدی سے سہراب کو کال ملائی۔ لیکن سہراب سے اس کا رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس نے تھک کر فون رکھ دیا۔

☆☆☆

"ہیلو مسٹر شرر..... کدھر جا رہے ہیں؟"

آج کی نشست کے اختتام پر جب وہ آتش کدے سے نکلا، تب ہی عقب سے کسی نے اسے پکارا تھا۔

اس کے بے سمت قدم ٹھہر گئے اور اس نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے نیلی جینز اور سیاہ شرٹ میں ہشاش بشاش سا فاروق احمد کھڑا دوستانہ انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اسے اچھا نہیں لگا۔ تب ہی رکھائی سے بولا۔

"آپ سے مطلب؟"

"مطلب تو خیر کوئی نہیں۔" وہ پتلون کی جیب میں دونوں ہاتھ پھنساتے ہوئے کندھے اچکا کر بولا۔ "پر آپ کو پاپیادہ جاتے دیکھا تو خیال آیا کیوں نہ لفٹ آفر کر دوں۔"

"شکریہ۔" وہ کھردرے پن سے بولا۔ "مگر میں اپنا بوجھ خود اٹھانے کا عادی ہوں۔"

"یہ تو بڑی خوبی کی بات ہے۔"

"کس کے نزدیک؟" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

''میرے نزدیک۔'' فاروق احمد ترنت بولا۔ ''مجھے اپنے قوت بازو پر بھروسا کرنے والے لوگ بہت پسند ہیں۔''

''اور مجھے اپنے کام سے کام رکھنے والے۔'' وہ اسے گھور کر مڑنے لگا ہی تھا کہ تب ہی فاروق احمد جلدی سے بولا۔

''صاحب ذرا عرض سنیے تو سہی۔''

''اب کیا ہے؟'' وہ بے زار ہوا۔

''لفٹ نہ سہی۔'' وہ دو قدم بڑھ کر اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا۔ ''کچھ دیر کو ہمارے ساتھ بیٹھ کر ایک پیالی چائے پی لیجیے نہیں۔''

''تم مجھے چائے کیوں پلانا چاہتے ہو؟'' شرر نے چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ اس بار بے اختیار ہنس دیا۔

''پولیس والوں کے سے انداز میں مجھے مت دیکھیے شرر صاحب..... یہ ہمارا شعبہ ہے۔''

''یعنی تم پولیس والے ہو؟'' وہ چونکا۔

''ہاں.....'' وہ مزے سے بولا۔ ''ہوں تو سہی۔''

''اور تم میرے ساتھ یونہی بے وجہ چائے پینا چاہتے ہو؟'' وہ طنزیہ بولا۔

''یونہی نہ بے وجہ۔'' فاروق چوں کہ بھانپ گیا تھا کہ کوئی بھی چال بازی کی بات یہاں نہیں چھپے گی سو سبھاؤ سے بولا۔ ''میرے ذہن میں چند الجھنیں ہیں، جنہیں میں آپ سے بات چیت کر کے سلجھانا چاہتا ہوں۔''

''پر میں تو خود الجھا ہوا ہوں۔'' اس نے اپنے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری الجھن کیا سلجھا سکوں گا؟''

''ہو سکتا ہے، آپ کا یہ خیال باہمی گفت و شنید کے بعد باطل ثابت ہو جائے۔'' فاروق احمد بولا تو اس بار شرر نے اسے ذرا توجہ سے دیکھا۔

''آدمی تم دلچسپ معلوم ہوتے ہو۔ چلو چلیں۔'' بالآخر وہ ایک لمبی سی سانس لینے کے بعد بولا تھا۔ فاروق احمد کھل گیا تاہم ظاہر کیے بغیر معتدل لہجے میں بولا۔

''بس تو پھر آپ ادھر ہی انتظار فرمائیے۔ میں پارکنگ سے اپنی گاڑی لے کر آتا ہوں۔''

☆☆☆

''میں سمجھ نہیں پا رہا۔''

اگلی شام وہ ہلکی نیلی جینز و کاسنی شرٹ میں ملبوس، لیاقت بیگم کے بلاوے پر گوشۂ عافیت کے مہمان خانے میں اپنے ازلی بے نیاز و پر اعتماد انداز میں صوفے پر براجمان، از حد سنجیدگی سے گویا تھا۔

''کہ مجھے اس طرح آج یہاں طلب کیے جانے کا مقصد کیا ہے؟''

''دیکھو بھئی عیسیٰ۔'' آج اس سے بغرض ملاقات شریف احمد اور عارف احمد بھی بطور خاص یہیں موجود تھے کہ یہ مرحلہ واقعتاً اسی قدر حساس اور سنجیدہ تھا، تاہم لب کشائی میں پہل ہمیشہ کی طرح شریفہ ہی نے کی..... تمہیں یہاں بلوانے کا مقصد بہت صاف اور سیدھا ہے۔ اس روز تم خود ہی بہت اکڑ کر کہہ گئے تھے تاکہ وری تمہاری وجہ سے بدنام ہوئی ہے تو اب اس کا ازالہ بھی تم خود ہی کرو گے۔''

''جی ہاں۔'' وہ بہت متوازن لہجے میں بولا۔ ''یہ میں نے کہا تھا۔''

''ہاں تو اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے قول کو پورا کرو۔''

ان کے دل میں موہوم سا خوف تھا کہ اگر وہ کہیں اپنی بات سے مکر گیا تو..... جب اس کے اقرار نے یہ ڈر سرے سے غائب کر دیا تب وہ مزید شدومد سے بولیں۔

"میں اپنے قول کو ضرور پورا کروں گا۔" وہ معنی خیزی سے مدھم سا مسکرایا۔ "مگر اس کے لیے پہلے وری کا راضی ہو جانا شرط ہے۔"

"وری ہماری بچی ہے۔" عارف احمد کو اس کا انداز بہت چبھا تھا، تب ہی بہت جتاتے، گمبھیر لہجے میں بولے۔ "اس کے لیے جو فیصلہ اس کے بڑے کریں گے، وہ اسے قبول ہوگا۔"

"یہ تو آپ کی اپنی سوچ ہے۔" وہ بے تاثر سے لہجے میں بولا۔ "ممکن ہے وری کا خیال اس سے مختلف ہو۔"

"دیکھو میاں....." عارف تیز ہو کر بولے۔ "تم ہماری شرافت کو کسی طور ہماری کم زوری مت سمجھنا..... تم بخوبی واقف ہو گے کہ ایسے نازک معاملات خون خرابے تک جا پہنچتے ہیں۔"

"آپ مجھے دھمکا رہے ہیں۔" وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے اسی پرسکون لہجے میں بولا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا پر شریفہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئیں سو دیور کو جھڑکتے ہوئے بولیں۔

"عارف! یہ کیا بات کو خوامخواہ کہاں سے کہاں لیے چلے جا رہے ہو۔ آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔" لگے ہاتھوں انہوں نے گوتم بدھ بنے بیٹھے مجازی خدا کو لتاڑا۔ "جو بات کرنی ہے، آپ کیجیے نا۔"

"ہاں....." بیگم کی جھاڑ پر وہ جو بے دلی سے بیٹھے تھے، ہڑبڑا کر چوکس ہوئے۔ "بات یہ ہے بیٹا کہ ہم وری کو نمٹانا چاہ رہے ہیں، اس لیے تم اپنے گھر والوں کو لے آؤ اور نکاح کی کوئی تاریخ مقرر کر لو۔" انہوں نے بنا وقت ضائع کیے اپنا مدعا کاٹھ کی طرح سیدھا اس کے سر پر دے مارا۔

"آپ وری کو راضی کر لیں۔" اس کا اب بھی وہی جواب تھا۔ "مجھے چنداں اعتراض نہیں۔"

"وہ راضی ہے۔" جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ اتنی دیر سے بالکل خاموش چہرے پر رنج لیے براجمان لیاقت بیگم گویا عیسیٰ کی تکرار سے عاجز آ کر ایک دم بولی تھیں۔ "اور آج میں نے اسی لیے تمہیں یہاں بلوایا ہے بچے۔"

"جی؟" عیسیٰ کا سارا اطمینان ایک پل میں غارت ہوا تھا۔

"پر وری تو....." وہ بولتے بولتے ایک دم ٹھہر گیا۔ کہ جانتا تھا۔ وہ اپنی جتنی چاہے صفائیاں دے لے، وضاحتیں کر دے مگر ان لوگوں نے اس کا یقین نہیں کرنا تھا نا جانے کیا بات تھی کہ وہ اپنی ذات کا مقدمہ دوسروں کے سامنے لڑنے پر ہمیشہ ہی مات کھا جاتا تھا۔

یہ اس کی شخصیت کا کم زور ترین پہلو تھا۔ پھر اب وہ کرے تو کیا کرے؟

"ٹھیک ہے۔" چند ثانیے گہری سوچ میں مستغرق رہنے کے بعد بالآخر وہ بہت ہموار لہجے میں بولا۔ "وری اگر راضی ہے تب میں اس سے اکیلے میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

☆☆☆

"ہائے رکھی..... قسم سے پیروں میں بڑا درد ہے ٹھیک سے دبا۔" اب کی بار ہوا کے زور سے ٹوٹ کر گر جانے والے آم کے خشک پتوں نے اس کی تنہائی میں خلل ڈالا تھا۔ مگر بس لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے اپنی وا ہو جانے والی آنکھیں ایک بار پھر بند کر لی تھیں۔

رینا کے ہاں بیٹا ہوئے چار ماہ ہونے کو آئے تھے پر وہ بستر سے اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

عامر کے خرچے پر ملازمہ رکھ کر اس نے یہاں مشہور یہ کر رکھا تھا کہ اسے میری خدمت کے لیے موروے نے بھجوایا ہے۔ یوں کوئی رکھی پر سوال اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ مگر رکھی صرف اس کی ملازمہ تھی، باقی سارا گھر

یونہی اوندھا پڑا تھا کہ حقیقتاً فیروزہ کی صحت کسی کام کی اجازت دیتی ہی نہ تھی۔ شونا یا نغمی جب بھی آتیں گھر کی کچھ حالت سدھار، دو چار پکوان پکا، فریزر میں رکھ جاتی تھیں۔ جن کا بڑے استحقاق سے استعمال خود رینا ہی کر لیا کرتی تھی۔

اس گھر میں طاقت کا مرکز بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا یہ اور بات کہ ان میں سے اکثر کو احساس نہ تھا اور جسے پوری طرح اس معاملے کا ادراک ہو چکا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

اس روز وہ میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے حوالے سے کسی کوچنگ سینٹر میں معلومات لینے گیا تھا۔ واپسی پر فیروزہ کو اپنے کمرے میں نہ پا کر ان کی تلاش میں نکلا تو دیکھا۔ وہ باورچی خانے کے فرش پر گری ہوئی تھیں۔

ماں کو اس حال میں دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ کسی نہ کسی طرح انہیں اٹھا کر لاؤنج کے بڑے صوفے پر لٹایا اور انہیں ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ ان کی آنکھ ذرا سی کھلی تو جلدی سے روح افزا بنا کر تھوڑا تھوڑا کر کے انہیں پلایا۔ ان کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو وہ رونے لگیں۔

''بھوک سے بھری آنکھوں میں دائرے سے بن رہے تھے۔'' وہ معصومیت سے بتانے لگیں۔ ''اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا دلہن کا کھانا لینے آئی تھی وہ رکھی رسوئی میں۔ ہم اس کا آواز بھی دیے پر شاید وہ سنی نا ہی...... تب ہم خود کچھ کھانے کو لینے کا خاطر رسوئی میں آئے اور گر پڑے۔''

''اسے تو میں بتاتا ہوں۔'' فیروزہ کی زبانی ساری روئداد سن کر وہ بھڑک اٹھا۔

''اے کہاں جا رہے ہو بابو۔'' فیروزہ نے اسے مشتعل سے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا تو ذرا گھبرا کر پوچھا۔

''آ رہا ہوں......'' وہ کہہ کر آگے بڑھا اور بنا کچھ سوچے سمجھے رینا کا دروازہ جا کر بری طرح دھڑ دھڑا دیا۔

''زور سے دبا، زور سے۔'' رینا اس وقت اپنے بستر پر نیم دراز رکھی سے ٹانگیں دبوانے میں مصروف تھی۔ دروازے پر ہونے والی غیر معمولی دستک سن کر چونکی ہوئی۔

''کون ہے؟'' اس نے رکھی کو ٹی وی کی آواز کم کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے محتاط سے لہجے میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔'' عیسیٰ دہاڑا۔

''کیا کام ہے؟'' وہ نخوت سے بولی۔

''کھولو دروازہ نہیں تو توڑ دوں گا۔'' فیروزہ کی بے بسی بھری حالت مستزاد اس کی بے حسی...... وہ غصے میں واقعتاً اندھا ہو گیا تھا۔ تب ہی اس کا لہجہ محسوس کر کے رینا پہلی بار ذرا خائف سی ہو کر بولی۔

''رکو...... کھول رہی ہوں۔'' وہ نائٹی ہی پہنے ہوئے تھی بس اسی پر دوپٹہ پھیلا کر اوڑھتے ہوئے بستر سے اٹھی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''بولو...... کیا بات ہے؟'' اس کا لہجہ ایسا تھا گویا عیسیٰ سائل ہو اور وہ خود مہارانی۔

''بات یہ ہے کہ اس گھر میں ایک ضعیف، بیمار عورت بھی رہتی ہے، آپ کو خیال بھی ہے اس بات کا؟''

''یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟'' وہ چتون تیکھی کر کے بولی تھی۔

''میرا یہ لہجہ آپ کی بے حسی کا ردعمل ہے۔''

''کیوں؟'' وہ چیخی۔ ''کیا بے حسی دکھا دی میں نے؟''

''امی نے کھانے کے لیے آپ کی اس ملازمہ کو آواز دی تھی اور یہ سنی ان سنی کر کے اندر آ گئی۔'' وہ بھڑکتے لہجے میں بولا۔ یہ گھر اس کی ماں کی راج دھانی تھا۔ اور انہیں یہاں اس لاچاری کی حالت میں دیکھنا اس کے لیے واقعی ایک ازحد تکلیف دہ تجربہ تھا۔

pklibrary.com

''یہ ان سنی کر کے اندر آ گئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے بھئی؟'' وہ انجان سی بن کر بولی۔
''آپ کا قصور یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنا آپ کی اخلاقی ذمے داری ہے۔ جو آپ نہیں نبھا رہیں۔''
''تم مجھے کیا طعنے دے رہے ہو ہاں.....'' وہ برہمی سے بولی۔ ''اگر تمہیں اپنی ماں کا اتنا ہی خیال ہے تو تم یہ ذمے داری نبھا لو نا۔''
''اگر یہ ذمے داری بھی آپ نے نہیں پوری کرنی تو پھر آپ کا اس گھر میں کیا کام ہے؟'' وہ بولا تو اس بار رینا بے طرح سلگ گئی۔
''اس گھر میں کیا کام ہے میرا۔'' وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورتے بولی۔ ''یہ تو تمہیں میں بتاتی ہوں۔ ذرا صبر کرو۔'' شور شرابے سے گھبرا کر بچہ جاگ گیا تھا۔ سو وہ اسے اٹھانے کو مڑ گئی۔
ہاں مڑنے سے قبل وہ عیسیٰ کے منہ پر زوردار آواز سے دروازہ بند کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

''بدر الوری..... تم جانتی ہو، سچ کیا ہے پھر کیوں کر رہی ہو ایسا؟'' پچھم سے آنے والی منہ زور ہوا ناریل کے درخت کو گویا اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھی۔ طوفان باد و باراں کے آثار تھے۔ اور ایسے میں وہ چھت پر کھڑا، وری سے آج شام کو ہونے والی ملاقات کی بابت سوچ رہا تھا۔
''ایک سچ اور بھی ہے۔'' وہ ہلکے گلابی جوڑے میں، گلابی گلابی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھتی، گلابی موم سے ڈھلی انگلیاں بے طرح بے طرح مروڑتے ہوئے رندھی آواز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔
''جس سے آپ ابھی ناواقف ہیں۔ اگر جان جائیں گے تو آپ کو میرا فیصلہ درست معلوم ہوگا۔''
''اچھا؟'' وہ طنزیہ مسکرا کر بولا۔ ''ایسی کیا بات ہے، ذرا میں بھی تو سنوں؟''
اور جو اس نے سنا۔
بجلی کے پہلے ہی کڑاکے نے آسمان کو اجلا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی موٹی موٹی بوندوں نے دھرتی کا منہ دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔
''میں نے ایک بار آپ سے پوچھا تھا نا کہ آپ کا نام عیسیٰ کیوں رکھا گیا؟'' وری کی آواز اس کے ذہن میں گونجی۔
''اس کا جواب آپ نے تو دیا نہیں۔ پر میرے پاس موجود ہے۔''
''کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' وہ موسلا دھار بارش میں بھیگتا سوچے چلا جا رہا تھا۔
''صوفی صاحب سے مشورہ کرتا ہوں۔''

☆☆☆

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''
خولہ نے اب سے کچھ ہی دیر قبل حوائج ضروریہ سے فارغ کروا کر، اسے غسل کروایا تھا..... اور اب وہ خود غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ تپ ہی اس کی کل بگڑ جانے والی طبیعت پوچھنے کی غرض سے آتش چلا آیا۔
''پتا نہیں۔'' گو تازہ بہ تازہ غسل سے وہ بظاہر بہتر دکھائی دیتی تھی پر درحقیقت تھی نہیں اور اس کا بے دلی سے دیا جواب اس سچائی کا غماز تھا۔
''ہوں.....'' آتش جو اس کے پلنگ سے ذرا فاصلے پر اپنے ہاتھ پشت پر باندھے سنجیدہ سا کھڑا تھا، پرسوچ سا ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹرز پرامید ہیں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔''
''مجھے جھوٹے دلاسے مت دو آتش! میں جان چکی ہوں کہ میں اب کبھی ٹھیک نہیں ہو سکوں گی۔'' وہ مایوسی

کی انتہا پر کھڑی تھی۔
''تم نفی کیوں سوچ رہی ہو؟'' وہ بولا۔ ''کیا تمہیں میڈیکل سائنس پر بھروسا نہیں؟''
''نہیں!'' اس کا یک لفظی جواب مضطرب کر دینے والا تھا۔ سو اس نے ترنت پوچھا۔
''تو پھر کس پر بھروسا ہے؟''
اس بار وہ کچھ نہیں بولی۔ بس سرہانے پڑا وہ لاکٹ اٹھالیا اور مٹھی میں بھینچ کر سامنے دیکھنے لگی۔
''یہ......'' آتش نے الجھن بھری نظروں سے اس کی بند مٹھی کی سمت دیکھا۔ ''تمہاری مٹھی میں کیا ہے بی۔ ذی؟''
''تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ میری destiny (قسمت)'' اس نے جیسے آتش کی بات کا مضحکہ اڑایا۔
''بی۔ ذی مجھے بتاؤ۔'' یک لخت آتش کے لہجے کی ساری حلاوت غائب ہوگئی اب وہ بہت سختی سے پوچھ رہا تھا۔
''تمہارا ذہن کس سمت سفر کر رہا ہے۔''
''میرا ذہن ہی نہیں۔'' وہ اذیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میرا پورا وجود اس وقت خلا میں معلق ہے۔''
''دیکھو، میری بات دھیان سے سنو۔'' اس نے بہت محنت کی تھی بی۔ ذی پہ وہ اتنی آسانی سے اسے کیسے کھو سکتا تھا؟ سو بہت محتاط اس کی ذہنی کیفیت کے مطابق الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے گمبھیرتا سے بولا۔
''بے اندازہ پریشانی میں انسانی ذہن کبھی بت تراش کر تو کبھی ہیولے بنا کر انہیں مشکل کشا، نجات دہندہ سمجھنے لگتا ہے۔ پر تم اچھی طرح واقف ہو کہ ایسی کوئی ہستی اس پوری کائنات میں کہیں نہیں ہے۔ اگر انسان کا کوئی مشکل کشا ہے تو وہ خود انسان ہے۔ تم سن رہی ہو نا میری بات۔''
اور آتش کی یہ بات اس وقت بی۔ ذی نے سنی یا نہیں، البتہ غسل خانے میں موجود خولہ نے نہ صرف لفظ بہ لفظ سنی بلکہ ان الفاظ کا مفہوم بھانپ کر پوری جان سے کانپ گئی۔
''یعنی...... یعنی اس نظریہ کی ذہن سازی کی جاتی ہے یہاں؟''
☆☆☆
''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ عیسیٰ صاحب تشریف لائے ہیں۔ بیٹھیے بیٹھیے۔''
سفیہ براق کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر جالی دار سفید ہی ٹوپی، باریش، باشرع، خوش گفتار، حلیم الطبع...... یہ مولانا عبدالرشید المعروف صوفی صاحب تھے۔ دنیاوی امور سے کنارہ کش، عرصہ دراز سے خود کو محلے کی مسجد سے ملحقہ خانقاہ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ عیسیٰ کو ان سے نسبت تھی۔ وہ گھنٹوں ان کی مجلس درس میں بیٹھ کر اپنے جلتے بلتے دل کی راحت کا سامان کیا کرتا تھا۔
یہ سلسلہ چند سال سے جاری تھا اور اب تو صوفی صاحب اس سے خاصے مانوس ہو چکے تھے۔ وہ اپنے معاملات میں اکثر و بیشتر ان سے صلاح لے لیا کرتا تھا۔ سو آج جب وہ اپنی زندگی کے ایک عجیب و غریب موڑ پر کھڑا تھا اور سجھائی نہ دیتا تھا کہ آگے کہاں جائے؟ لہٰذا ان سے مشورہ کرنے آن پہنچا تھا۔
''السلام علیکم!'' اس نے خانقاہ میں واقع ان کے حجرے میں پڑی فرشی نشست سنبھالتے ہوئے انہیں ادب سے سلام کیا۔
''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔'' وہ اس کے بالمقابل براجمان ہوتے ہوئے بولے۔ ''کہیے کیسے آنا ہوا؟''
''جی صوفی صاحب......'' اس نے بہت محتاط اور نپے تلے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''وہ معاملہ دراصل کچھ یوں ہے کہ۔''

''ہوں۔'' اس کی پوری بات سنجیدگی سے سماعت کرنے کے بعد، وہ ہنکارا بھرتے ہوئے بولے۔ ''تو اب تم کیا کرو گے؟''

''کیا کرنا ہے۔ یہی تو سمجھ نہیں پا رہا۔'' وہ اذیت آمیز لہجے میں بولا۔

''اس لڑکی کو اپنانا چاہتے ہو؟'' صوفی صاحب نے بہت گہری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

وہ خاموش رہا کہ یہی تو وہ سوال تھا کہ جس کا جواب اسے نہیں مل پا رہا تھا۔ تب چند ثانیے چپ رہنے کے بعد بالآخر صوفی صاحب گویا ہوئے۔

''دو رکعت نفل پڑھ کر استخارہ کر لو..... ان شاء اللہ بہتری کی صورت نکل آئے گی۔''

☆☆☆

''ہم آپ کو مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کی کتاب مارکیٹ میں جانے کے لیے تیار ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ بی۔ ذی کے ہاتھ میں موجود، اس لاکٹ نے آتش کا چین و سکون تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ بی۔ ذی کو اس نے بہت محنت سے تراشا تھا۔ وہ اس کے نظریے، اس کی سوچ کا ایک چم چماتا، کامیاب چہرہ تھی۔ اور اب وہ اپنی ''راہ'' سے ''بھٹک'' رہی تھی تو وہ کیوں کر نہ منتشر ہوتا۔ سو بی۔ ذی کے کمرے سے واپسی کے بعد وہ سارا وقت مضطرب رہا۔

''اسے جلد کسی ''کام'' سے لگانا ہوگا۔ ورنہ اس کا ذہن بہک بھی سکتا ہے۔''

وہ مستقل یہی سوچے چلا جا رہا تھا۔ مگر کام کی نوعیت اسے بجھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہو گیا۔ اس کے حساب سے آج کا دن کچھ بہتر نہیں تھا۔ ہاں مگر رات.....

رات اس کی کتاب کی اشاعت کی خوش خبری جلو میں لیے آئی تھی۔ اب سے کچھ ہی دیر قبل اس کے ناشر نے اسے فون پر یہ اطلاع دی تھی۔

''ہم چاہتے ہیں کہ ایک پریس بریفنگ ارینج کر کے اس کتاب کی رونمائی کریں۔'' ناشر فرمائش کر رہا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ بہت خوش دلی سے انگریزی میں بولا۔ ''یہ ایک شان دار آئیڈیا ہے۔''

''ٹھیک ہے مسٹر آتش۔'' جواباً وہ مطمئن سے لہجے میں بولا۔ ''تو پھر آپ تیاری کیجیے یہاں اڑان بھرنے کی۔''

''بالکل۔'' وہ بولا تو دوسری جانب سے نیک خواہشات کا اظہار کر کے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اور اب وہ اپنی پانچویں، جب کہ دوسری کتب کی بہ نسبت سب سے زیادہ متنازعہ موضوع کا احاطہ کرتی کتاب پر آنے والے متوقع ردعمل کے بارے، پراسرار تبسم لبوں پر لیے، چمکتی آنکھوں سے سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

''ہائے میرے اللہ، مجھے تو یقین ہی نہیں آ پا رہا کہ وہ بلا یہاں سے دفع ہونے والی ہے۔''

شریفہ کی بے پایاں مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ جس مقصد کے حصول کی خاطر اتنے دن سے جان مار رہی تھیں بالآخر وہ کل پورا ہونے جا رہا تھا۔ اس روز انہوں نے عیسیٰ کے یہاں سے روانہ ہوتے ہی، رینا کو فون کر کے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر کے اپنا مطالبہ بڑی شدت سے دہرایا تھا۔ دوسری طرف، وہ بھی گویا منتظر ہی بیٹھی تھی سو اس نے وہی کیا کہ جو اس نے کرنا تھا۔ یعنی عامر سے بالی کو فون کروا دیا تھا۔

بالی سے بات سارے خاندان میں با آسانی پھیلی..... باتیں، تبصرے، تجزیے، یہ وہ، الختصر..... دو روز بعد وہ لوگ عیسیٰ کا باقاعدہ رشتہ لیے گوشہ عافیت چلے آئے تھے۔ بعد کے معاملات اتنی سرعت سے طے ہوئے کہ عیسیٰ خود حیران رہ گیا۔

شاید یہی مشیت ایزدی تھی۔ سو اس نے سر جھکا دیا۔ یوں اب کل اس کا اور وریٰ کا نکاح تھا..... اور رخصتی چار ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔

''اب جو اس بندھن میں بندھ رہے ہو تو پورے دل سے اسے نبا ہنا۔'' صوفی صاحب نے سمجھایا تو اس عرصے میں پہلی بار وریٰ کے تصور، پر اس کے ہمہ وقت باہم پیوست رہنے والے لبوں پر ایک کلی سی چٹکی تھی۔

دوسری جانب گوشہ عافیت میں یہ موقع تو خوشی کا تھا، پر نا جانے کیا بات تھی کہ حقیقتاً کوئی بھی دل سے شاد نہ تھا ماسوائے شریفہ کے۔ جو اس وقت کل ہونے والے وریٰ کے نکاح میں شرکت کی غرض سے ٹھہرنے آئی ہوئی اپنے بستر پر نیم دراز، سات ماہ کی حاملہ عینا سے مخاطب ہو کر بڑے پر جوش سے لہجے میں گویا تھیں۔

''ابھی کہاں دفع ہونے والی ہے۔'' سرخیاں چھلکاتی رنگت اور بھرے بھرے سے گالوں والی عینا ہنس کر بولی تھیں۔ ''ابھی تو پورے چار مہینے مزید وہ ادھر ہی رہے گی۔''

''چلو.....'' شریفہ مزے سے بولیں۔ ''جہاں اتنے سال اسے برداشت کیا، وہاں یہ چار مہینے بھی گزر جائیں گے۔ مگر اس کی جانب سے جو اک مسلسل دھڑکا تھا وہ تو ختم ہو گیا نا.....''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ نزدیک دھری طشتری میں سے انگور اٹھاتے ہوئے۔ ''بس اب آپ عباد اور واشلہ کے رشتوں پر فوکس کریں۔''

''عباد کے لیے، تو تو اپنے ہی سسرال میں رشتہ دیکھ۔'' وہ بولیں۔ ''اور واشلہ کے لیے تو خیر میں نے مفتاح کے دوست کو پسند کر رکھا ہے، اس سے کر دوں گی۔''

''پر ہے کہاں وہ آج کل۔'' عینا نے پوچھا۔ ''بہت دن سے کوئی ذکر نہیں کیا آپ نے اس کا۔''

''اس ڈائن کے مسئلہ نے کسی اور کے ذکر کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔'' وہ زہر خند سا بولیں۔ ''پر ایک بار بات ہوئی تھی میری اس سے۔ اپنے ماں باپ سے ملنے جا رہا تھا۔ اب تو وہ یہیں آ گیا ہوگا۔''

''واپس آ گیا ہوگا تو فون کر کے اسے بھی نکاح میں انوائٹ کر لیں۔'' خالی طشتری پرے کھسکاتے ہوئے عینا نے صلاح دی۔

''یہ اچھا مشورہ دیا تو نے۔'' وہ معنی خیزی سے سر اثبات میں ہلا کر بولیں۔ ''ابھی فون کرتی ہوں۔''

ادھر وہ بیٹھی اپنے منصوبے بنا رہی تھیں۔ جب کہ ٹیرس پر کھڑا مفتاح فون کی دوسری جانب موجود، عباد کے سوالات کا جواب دینے سے خود کو قاصر پاتا تھا۔ جو پوچھ رہے تھے کہ۔

''وریٰ کہاں ہے مفتاح..... میری ابھی اس سے بات کروا دو یار..... اس روز تو لائن ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے اس سے بات ہی نہ ہو پائی تھی۔''

''ہیلو..... ہیلو بھائی۔'' وہ گلوگیر سے لہجے میں بولا۔ ''آپ کی آواز نہیں آ رہی..... لائن شاید آج بھی ٹھیک نہیں۔''

☆☆☆

''یہ رکھی گواہ ہے، پوچھیے اس سے، کیسا اچھل اچھل کر مجھ سے بدتمیزی کر رہا تھا۔''

اب کی بار نہ کسی نے اسے چونکایا تھا، نہ ارتکاز میں خلل انداز ہی ہوا تھا بلکہ وہ منظر ہی کچھ ایسا گھٹن زدہ سا تھا کہ سانس لینے میں دشواری کے باعث، ایک جھٹکے سے اس کی دونوں آنکھیں خود بخود ڈھل گئی تھیں۔ اس نے دو چار گہرے گہرے سانس لے کر وہ منظر جھٹکنے کی لاکھ کوشش کی مگر بے سود.....

عیسیٰ نے رینا کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ بات اس نے سو سے ضرب دے کر عامر کو بتائی۔

نتیجتاً۔

عامر نے بہنوں کو بلا کر عدالت لگا رکھی تھی اور بطور "مجرم" وہ کٹہرے میں کھڑا تھا۔

"ہاں باجی سچ کہہ رہی ہیں۔" رکھی گواہی طلب کیے جانے پر معتبر سی بن کر بولی۔ "یہ اتنے غصے میں تھے لگتا تھا مارنے لگیں گے۔"

"سنا۔" عامر بے قابو ہو کر بولا۔ "سنا آپ لوگوں نے..... یہ حرکتیں ہیں اس کی۔"

"بے کار کا بات کاہے کر رہی ہو نے۔" سفید پھولوں والی کتھئی سوتی ساڑی میں ملبوس فیروزہ رکھی کو ناگواری سے ٹوک کر بولیں۔ "ہمری خاطر پریشان ہو گیا تھا بابو! اس لیے زیادہ بول گیا نے..... پر ایسا بدتمیز نہیں ہے کہ بڑی بھابھی کا ساتھ ایسا کرے گا۔"

"دیں..... اور شہ دیں اسے۔" عامر جلبلا کر بولا۔ "بجائے اس کے کہ آپ میری بیوی سے اتنی بدتمیزی کرنے پر اسے روکیں، ٹوکیں آپ الٹا اس کی حمایت کر رہی ہیں۔"

"ٹھیک بول رہا ہے عامر دا۔" بالی، جو آج جی جان سے رینا کے "حسن اخلاق" پر فریفتہ تھی، تائید اً بولی۔ "آخر کو یہ بھی کسی کا بیٹی ہے، بہو بن کر آ گئی ہے اس گھر میں تو کا اب اس کا ساتھ یہ سلوک ہو گا نے؟"

"بات یہ ہے، کہ یہ وقت ہم پر بھی آیا ہے۔" نغمی جو رینا کی زبانی، چھوٹے بھائی کی بدتہذیبی کا قصہ سن کر ذرا شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی تھی بالی کے خاموش ہونے پر رسانیت سے بولی۔ "اسی لیے ہم جانتے ہیں کہ بچے کے ساتھ گھر یا کی ذمے داری لے کر چلنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پر یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اگر گھر والوں کا خیال ہم نہیں رکھیں گے تو پھر اور کون رکھے گا۔"

"پر اس کی صحت ابھی ایسی کہاں ہے جو یہ سارے گھر کا خیال رکھ سکے۔" عامر منہ بنا کر بولا۔

"سارے گھر کا نہیں، پر امی کا خیال تو کرنا ہی ہو گا نا۔" شونا بردباری سے بولی۔ "وہ ضعیف ہیں اور مریض بھی۔ انہیں وقت پر کھانا اور دوائی کا دینا اشد ضروری ہے۔"

"یعنی آپ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عیسیٰ نے جو میری بیوی کے ساتھ کیا، وہ درست تھا۔" عامر شونا اور نغمی کو متوازن بات کرتا دیکھ کر بپھر گیا۔

"خدانخواستہ۔" نغمی بولی۔ "ہم یہ نہیں کہہ رہے۔ اس نے غلطی کی ہے اس سے کسے انکار ہے۔"

"غلطی کی ہے تو پھر معافی بھی مانگے۔" عامر اڑ گیا۔ تب اتنی دیر سے لب بستہ کھڑے ان سب کی باتیں سنتے عیسیٰ نے غصے بھری نگاہیں اٹھا کر عامر کو دیکھا۔

"پہلے بھابھی امی سے معافی مانگیں پھر میں بھی مانگ لوں گا۔"

"دیکھا..... دیکھا آپ لوگوں نے اس کی خودسری۔" عامر اشتعال میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کیا کیا ہے جو امی سے معافی مانگوں؟" رینا نے معصومیت سے ہونٹ لٹکا کر اپنا قصور پوچھا۔

"ناداستگی ہی میں سہی۔" شونا متانت سے بولی۔ "پر کوتاہی تو تم سے ہوئی ہے۔"

"ہاں..... ہاں ٹھیک ہے، یہ لیں۔" رینا نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک دم فیروزہ کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "ساری غلطی، سارے قصور میرے ہی ہیں۔ میں معافی مانگتی ہوں آپ سے..... اب کیا عیسیٰ بھی اسی طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑے گا؟" اس نے ایک نگاہ اپنی معافی کے انداز پر خفیف سے ہو جانے والے حاضرین پر ڈال کر، طیش دلاتی فاتحانہ نگاہ سے عیسیٰ کی سمت دیکھا۔

"چلو عیسیٰ! اب تم بھی معافی مانگ لو بھابی جی سے۔" نغمی نے تحکم سے کہا تھا۔ تب وہ ایک قدم آگے بڑھا کر رینا کے سامنے آیا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔

"آئم سوری بھابی..... پر میں آپ کے سامنے ہاتھ نہیں جوڑوں گا، کیوں کہ مجھے ڈرامے بازی کرنا نہیں

آتی۔"

☆☆☆

"میری بچی، اللہ تجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ کبھی بھی کوئی غم تیرے نزدیک سے بھی نہ گزرے۔"

وہ پارلر جانے کے لیے لیاقت بیگم کو الوداع کہنے آئی تو وہ اسے بے اختیار خود سے لپٹا کر بے طرح رو پڑیں۔

اگرچہ رخصتی تو اس کی فی الحال نہیں ہو رہی تھی، پر یہ لمحات کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں جن میں دل خود بخود ہی گداز ہو جاتا ہے اور یہاں تو دل کے بھر بھر آنے کی اور بھی کئی وجوہات موجود تھیں۔ خود اس پر ایک عجیب طرح کا خوف اور گھبراہٹ سوار تھی۔ اور اس خوف و گھبراہٹ کا ہرگز ہرگز بھی سبب وہ نہیں تھا کہ جو گوشہ عافیت کے مکین سمجھ رہے تھے۔

"پانچ بجے اسے پارلر پہنچنا ہے۔" لیاقت بیگم کو روتا نہ دیکھ کر بالآخر کمر پر ہاتھ ٹکائے، اتنی دیر سے دنیا دکھاوے کو وریٰ سے ملنے کی خاطر مارے باندھے کھڑی شریفہ کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تب ہی وہ اکتاہٹ بھری چڑچڑاہٹ سے بولیں۔ "اور ساڑھے چار تو یہیں بج چکے ہیں۔ اب بس بھی کیجیے اماں بیگم۔ آپ کی لاڈلی ابھی کہیں نہیں جا رہی۔ نکاح کے بعد بھی اس نے آپ ہی کے پاس رہنا ہے۔"

"اماں بیگم۔" عارفہ خود بھی سسک رہی تھیں تاہم شریفہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔ "بھابی بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بچیوں کو پارلر جانا ہے۔ باہر گاڑی میں مفتاح منتظر کھڑا ہے۔"

"ہاں....." ان کے کہنے پر لیاقت بیگم وریٰ سے علیحدہ تو ہو گئیں۔ پھر ایک دم نا جانے کیا ہوا کہ اس کا حوروں کو شرماتا چہرہ، اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر بے قراری سے بولیں۔

"جانتی ہوں انہیں دیر ہو رہی ہے پر نا جانے کیوں اسے بھیجنے کو دل آمادہ نہیں ہو پا رہا۔"

"آئے ہائے کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہی ہیں اماں بیگم۔" شریفہ نے توبہ کرنے والے انداز میں اپنے دونوں گال تڑاتڑ پیٹ ڈالے۔

"اتنی مشکلوں سے تو اس مصیبت..... میرا مطلب ہے کہ اللہ نے یہ دن دکھایا ہے۔ پھر آپ اسے نہ بھیجنے کی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔"

"چلو وریٰ! اٹھو شاباش۔" عارفہ نے آگے بڑھ کر اسے نرمی سے لیاقت بیگم کے نزدیک سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بالکل بھی نروس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب ہمیشہ تمہارے ساتھ تھے اور رہیں گے۔"

"مامی بیگم۔" عارفہ کا نرم پھوار برساتا لہجہ اس کے کشیدہ اعصاب کو پرسکون اور بے محابا دوڑتے دل کی رفتار کو معتدل کر گیا تھا، سو وہ بے اختیار بہت جذب سے عارفہ سے از خود لپٹ گئی۔

"خوش رہو۔" عارفہ کا دل بھر آیا۔ وہ چار برس کی تھی کہ جب زہرہ اس دیار فانی سے رخصت ہوئی۔ انہوں نے اپنے طور پر اسے کسی طور رجا سے کبھی کم نہیں سمجھا، پھر بھی نہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے۔ یہاں بھی رہ گئی ہوگی۔ تب ہی اس کے دونوں ہاتھ تھام کر معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولیں۔

"میں نے تمہیں رجا سے کبھی بھی کم نہیں سمجھا، مگر پھر بھی کبھی کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو اس کے لیے اپنی چھوٹی مامی کو معاف کر دینا۔"

"نہیں مامی بیگم۔" وہ بے ساختہ بولی۔ "آپ تو بہت اچھی ہیں۔"

"ہاں بری تو ایک بس میں ہی ہوں۔" شریفہ اس لمحے بھی باز نہ آئی تھیں۔

"چلو رجا، وریٰ کا بیگ اور اپنا سامان اٹھوا کر گاڑی میں رکھواؤ۔" عارفہ نے کسی بھی بدمزگی سے بچنے کی پیش بندی کے طور پر بات سرعت سے بدلتے ہوئے، ایک کونے میں نم آنکھیں لیے کھڑی بری طرح اپنے گلابی

ہونٹ کچلتی رجا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے بولی۔
''جی امی......'' اور وریٰ سے پارلر میں خود ساختہ گلے شکوے دور کرنے کا ارادہ کرتی ہوئی کمرہ عبور کر گئی۔
''خدا حافظ بڑی مامی۔'' تب وریٰ نے سپاٹ لہجے میں برے برے منہ بناتی شریفہ سے کہا۔ اور ان کا جواب سنے بغیر ایک دم آگے بڑھ گئی۔
''آہ میری زہرہ...... کاش آج تو یہ ساعت مسرت دیکھنے کو یہاں موجود ہوتی۔'' لیاقت بیگم ایک بار پھر آب دیدہ ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

''ہم روزانہ سیکڑوں برائڈز تیار کرتے ہیں، مگر مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے آج تک اتنی حسین برائڈ نہیں دیکھی۔''
مشاطہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی...... اور آئینہ گواہ تھا کہ وہ سچ کے سوا اس وقت کچھ اور نہیں کہہ رہی ہے۔
ڈبکے کے نفیس کام سے مزین عنابی انارکلی، چوڑی دار پاجامے میں ملبوس، سر پر ہلکا سنہری، عنابی پٹی لگا دوپٹا اوڑھے، نکاح کی مناسبت سے ہلکے پھلکے میک اپ معطئی طرز کے بھاری جھمکوں، چوکر، جھومر اور ہری چاند سے مشابہہ گول ٹیکے میں سجی، سنوری بدر الورحمیٰ کی بلاشبہ چھب ہی نرالی تھی۔
ایسا ملکوتی حسن، جو شاہ زادوں کو تخت و تاج ٹھکرانے پر مجبور کردے۔ مگر یہ حسن مضطرب تھا، فکر مند تھا، منتشر الذہن تھا۔
وجہ؟
وہی فون...... جو اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹے سے سنہری پاؤچ میں بڑی دیر سے تھر تھرائے چلا جاتا تھا، اور جسے ریسیو کرنے کی نوبت رجا کی یہاں موجودگی کے سبب آنہیں پارہی تھی۔
''کیا کروں؟ کیا کروں میں؟'' وہ سوچے چلی جارہی تھی۔ سات بج چکے تھے...... کچھ ہی دیر میں مفتاح انہیں لینے آجاتا۔ اس کے نکاح کا وقت بعد از نماز عشاء مقرر تھا۔ اور نماز عشاء ان دنوں ساڑھے سات بجے ہورہی تھی۔
''ہائے...... میں کیا کروں؟'' وہ ابھی اسی سوچ میں تھی کہ تب ہی، تیاری کے افتتاحی مراحل میں داخل ہوتی ایک اور دلہن نے دوپٹا سیٹ کرتی مشاطہ سے پہلے واش روم جانے کی اجازت چاہی اور وریٰ کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔
''میم...... مجھے بھی واش روم جانا ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔
''چلو...... میں لے چلتی ہوں۔'' سرمئی و فیروزی گھٹنے تک آتی قمیض اور ٹراؤزر میں ملبوس، لمبا سا فیروزی چنری کا دوپٹہ کندھے پر ڈالے رجا بولی تھی۔
''نہیں تم میجنگ روم سے سامان لے آؤ۔'' وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا کر بولی۔ ''میں چلی جاؤں گی۔''
''ٹھیک ہے۔'' رجا مدھم سے لہجے میں کہہ کر کپڑے تبدیل کرنے والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔
اجنبیت کی دیوار دونوں کے مابین اتنی بلند ہوگئی تھی کہ رجا چاہ کر بھی تا حال وریٰ سے کچھ بھی کہہ سن نہ پائی تھی۔
اس کے جاتے ہی، وریٰ سرعت سے اپنا فراک سنبھالتی اٹھی...... پیروں کے پاس پڑا سیاہ رنگ کا چھوٹا سا سنہری بیگ کندھے پر ڈالا اور واش روم میں داخل ہو کر جلدی سے متواتر بجتا فون اٹھایا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

جویریہ مریم

بات ہے گھر کی

ارے ناشکرو۔ اتنے عیش میں رہتے ہو یہاں۔ نانا، نانی، ماموں، خالاؤں کا پیار سمیٹے ہوئے ہو۔ سارا دن بکری کی طرح منہ چلتا ہے۔ ناشکری اور نخرے پھر بھی ختم نہیں ہوتے تمہارے۔

ہم سے پوچھ کے دیکھو ہم پہ کیا گزرتی تھی ہمارے ماموؤں کے ہاں۔ ارے زخم ہرے کرنے والی بات ہے مگر بتائے دیتا ہوں تم ناشکروں کو، تاکہ تمہیں قدر ہو، احساس ہو ہمارا، ہماری خدمت، لاڈ پیار کا کہ ہم جب بھی اپنے ماموؤں کے گھر جایا کرتے تھے گرمیوں کی چھٹیوں میں تو ہمارے خود غرض ماموں ہم سے سارا، سارا دن بھیڑ بکریاں چروایا کرتے تھے۔ تب کہیں جا کر شام کو کھانا دیتے تھے اور طعنے الگ کہ تمہارے باپ کے گھر تو تمہیں کبھی گوشت کھانے کو نہیں ملتا۔ یہاں ہم تمہیں گوشت اور خالص دودھ کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے۔"

کرم دین ترچھی نظروں سے، اپنی اہلیہ محترمہ کو دیکھتے بظاہر اپنے نواسے نواسیوں پر برس رہے تھے۔ ثمینہ خوب اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اپنے شوہر کی باتوں کا مطلب (ثمینہ کرم دین کی ماموں زاد بھی تھی)

کرم دین اپنی کہہ، ثمینہ کو آگ میں جھونک کر حقہ گڑگڑانے لگا تھا۔ اس کے نواسے، نواسیوں نے جن کی عمریں سات، پانچ اور تین سال تھیں انہوں نے نانا کی باتوں پہ کان تک نہ دھرے تھے۔ وہ ریں ریں کرتے نانی کا پلو پکڑے، اپنے من پسند کھانوں کی فرمائشیں جاری رکھے ہوئے تھے۔

"ہونہہ! جن کا بڑاؤ تین تین ماہ تک بھی نہ اٹھے، انہیں ویلے بٹھا کر کھلاتا بھی کون ہے۔ خود سے چار دن نواسے، نواسی برداشت نہیں ہوتے، کلیجہ کتنے لگتا ہے معصوم بچوں کو کھاتے دیکھ کر اور چلا ہے اپنی مثال دینے۔ ہمت تھی ہماری جو اتنے بڑے ٹبر کو کئی کئی ماہ برداشت کرتے تھے۔"

دودھ کے نیچے آگ ٹھیک کرتی، ثمینہ نے اپنی بھڑاس نکال کر حساب برابر کیا تھا۔ کرم دین اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

"مجال ہے جو کبھی یہ عورت جواب دیے بغیر رہ جائے۔ اور اپنی غلطی بھی مان لے۔ کھڑ کھڑا کر جواب رکھے ہوتی ہے۔"

منہ ہی منہ بڑبڑاہٹ جاری تھی تب ہی لکڑی کے پھاٹک نما دروازے کی کنڈی کھڑکی تھی اور پھر کھڑکتی ہی چلی گئی۔

"اللہ خیر! کنڈی کھڑکانے کا یہ انداز تو میری عالیہ کا ہے۔ نمانی پھر تو روٹھ کر نہیں آ گئی۔"

ثمینہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، دہلتے دل سے، دروازہ کھولنے کے لیے دوڑی تھی اور دروازے میں حسب توقع عالیہ ہی کھڑی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر روتی ان سے لپٹ گئی۔ ثمینہ کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا اپنی لاڈلی کی یہ حالت دیکھ کر، کرم دین بھی حقہ گڑگڑانا چھوڑ کر بیٹی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ نواسے، نواسی اب خاموشی سے خالہ اور نانی کو پریشان ہوتے دیکھ رہے تھے۔

"اماں! میں کہہ رہی ہوں۔ اس دفعہ میں ہرگز، نہیں جانے والی ان بھوکے ننگوں، جاہلوں کے گھر، رتی برابر عزت نہیں ہے میری اس گھر میں، کام، کام اور بس کام۔ ذرا ذرا سی بات پر بے عزت کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور احسن (عالیہ کا شوہر) یوں گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا ہوتا ہے جیسے میرا اس سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ بھگی

pklibrary.com

بلی بنا رہتا ہے۔ اپنے گھر والوں کے سامنے۔"

وہ سوں سوں کرتی اونچی آواز میں کہتی، ابا کے سامنے جھکی تھی۔ کرم دین نے پیار دے کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ عالیہ اور زور و شور سے رونے لگی تھی۔

اتنے میں سعدیہ نہا کر واش روم سے نکل آئی تھی، بچے ماں کو دیکھ کر اس سے چپک گئے تھے۔ عالیہ جھٹ بڑی بہن کے گلے جا لگی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں عالیہ کی ماں، ایک بار اچھی طرح نہ بتا دیں عالیہ کے سسرال والوں کو، دھونا (مارنا) پڑے گا ایک بار انہیں اچھی طرح، ذلیل کر کے رکھ چھوڑا ہے ہماری بیٹی کو کم ظرف لوگوں نے۔"

کرم دین نے بڑھک ماری تھی۔

"ٹھنڈے دماغ سے کام لے۔ بیٹی کا معاملہ ہے۔ بیٹے کا نہیں۔ فوراً عالیہ کے ماتھے پر تین لفظ لکھ کر تیرے در پر چھوڑ جائیں گے وہ لوگ، بیٹی والوں کو نیچا ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔"

ثمینہ نے ٹوکا تھا۔ وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ لکڑی کے کھلے پھاٹک سے احسن اپنی بائیک سمیت آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے بائیک دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے ان کی طرف آتے، بلند آواز میں سلام کیا تھا۔

کرم دین کے علاوہ کسی نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ عالیہ نے تو اسے خوں خوار نظروں سے گھور کر منہ موڑ لیا تھا۔

"آؤ، آؤ، احسن بیٹا! بیٹھو۔"

کرم دین نے کہا تو ثمینہ نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا تھا اور کرم دین نے مکمل طور پر ان غصیلی نظروں کو نظر انداز کیا تھا۔

احسن شرمندہ، شرمندہ سا چارپائی پر ٹک گیا۔ جس پہ کرم دین بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

"سعدیہ بیٹا! احسن کے لیے کھانا لے کر آؤ۔"

کرم دین نے کہا تو سعدیہ، بادل نخواستہ کھانا لے آئی تھی۔ عالیہ کب کی اندر جا چکی تھی۔

ثمینہ بھی عالیہ کے پیچھے پیچھے اس سے مزید پوچھ گچھ کرنے کے لیے چل دی۔

"نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میں عالیہ کو لینے آیا ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ دراصل عالیہ اور میرے گھر والوں کی آپس میں بن نہیں رہی ہے۔ پھر بھی، آپ یقین کریں کہ وہ عالیہ کے ساتھ سمجھوتا کر کے، سلوک اتفاق سے رہنا چاہتے ہیں۔ مگر عالیہ ایسا سوچنے تک کے لیے تیار نہیں ہے۔"

کرم دین کھوکھلی سی ہنسی ہنسا تھا۔

"ارے، احسن بیٹا! ہمیں پتا ہے کہ ہماری عالیہ لاڈلی اور غصیلی ہے ذرا۔ برداشت کم ہے اس میں، پھر گھروں میں یہ چھوٹی موٹی باتیں اور جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ تم کھانا کھاؤ میں عالیہ کو بلاتا ہوں۔"

احسن نے تشکر سے اپنے سسر کو دیکھا تھا۔ کرم

دین کھنکھارتا ہوا عالیہ اور ثمینہ کے سر پہ جا پہنچا تھا۔

''عالیہ بیٹا! آجاؤ احسن شرمندہ ہے۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا تمہارے ساتھ وہاں۔''

''ابا اب میں نہیں جاؤں گی۔ آپ لوگوں کی دی ڈھیل نے ہی ان لوگوں کو میرے سر پر بٹھایا ہوا ہے۔'' عالیہ نے ناک سڑسڑاتے کہا تھا۔ اور ثمینہ تو بھڑک ہی گئی تھی۔

''نہ، یہ سانپ جیسی کنڈلی مارنی اور پلٹ مارنی کہاں سے سیکھی ہے تم نے! ابھی تو ان لوگوں کو دھونے کی باتیں کر رہے تھے اور احسن پہ نظر پڑتے ہی سارا غصہ جھاگ بن کر بیٹھ گیا۔ میں انہیں دھونے کا نہیں کہہ رہی۔ لیکن بیٹی کے بدلے چار باتیں سخت لہجے میں تو کرتے، تاکہ انہیں بھی پتا چلتا کہ یہ لاوارث نہیں ہے۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، بات بھی کروں گا۔ مگر اب چلی جائے ناں عالیہ بیٹی تو پیچھے سے جائیں گے ہم ان پہ دباؤ ڈالنے۔''

کرم دین کھسیا کر بولا تھا۔

عالیہ نے سختی سے انکار کر دیا تھا جانے سے۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر باہر صحن میں آیا، جہاں احسن منتظر بیٹھا تھا۔

''احسن بیٹا! وہ کیا ہے کہ صبح میں خود لے آؤں گا عالیہ کو، صبح تک چلو اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا اور ہم اسے سمجھا بھی دیں گے کہ وہ اچھی طرح رہے سسرال میں۔''

''جی!'' احسن گہرا سانس بھر کر اٹھا تھا اور سر سے مصافحہ کر کے اپنی بائیک پہ ہوا ہو گیا۔

کرم دین کسی سوچ میں ڈوبا حقہ گڑگڑانے لگا، تھوڑی دیر بعد ہی اس کے تینوں بیٹے کھیتوں سے واپس آ گئے تھے۔ فصل کی تیاری کا وقت تھا اور وہ صبح کے گئے شام کو آتے تھے کھیتوں سے۔

☆☆☆

عالیہ چوہدری کرم دین اور ثمینہ کی دوسرے نمبر کی بیٹی تھی۔ بہت عصیلی، نخرے باز اور چھوٹے دل کی تھی۔ ساتھ والے گاؤں میں ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ ذرا سی کوئی اونچ نیچ ہوتی اور وہ وہاں سے پیدل نکل آئی تھی۔

دس منٹ میں ہی اپنے گھر کے پھاٹک پر موجود ہوتی تھی۔ گھر والے تنگ تھے اس طرح اس کے روز روز روٹھ کر آنے سے۔ مگر اس کا رونا اور شکایتیں سن سن کر نرم پڑ جاتے تھے۔ کچھ اس کا مزاج ایسا تھا کہ وہ سوچ سمجھ کر ہی اس سے بولتے تھے۔

☆☆☆

رات کی چادر آسمان پر تن چکی تھی۔ اماوس کی قدرے ٹھنڈی رات تھی۔ صحن میں چار پانچ چارپائیاں ہی بچھائی گئی تھیں۔ باقی افراد اندر کمروں میں سو رہے تھے۔

کرم دین اور ثمینہ، آدھی رات گزر جانے کے باوجود جاگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بچھی چارپائی پر چھوٹی نادیہ، ہما سوئی تھیں۔ پھر عالیہ کی چارپائی تھی اور اس کی ساتھ والی چارپائی خالی پڑی تھی۔

نیند عالیہ کی آنکھوں میں بھی نہیں اتری تھی۔ مگر وہ یوں پڑی تھی۔ جیسے گہری نیند میں غرق ہو۔ دل کے کسی کونے میں ندامت و شرمندگی بھی تھی کہ غلطی سراسر اسی کی تھی۔ وہ ذرا سی بات پر طوفان مچا کر سسرال سے نکل آئی تھی اور پھر احسن کے، پیچھے پیچھے آنے پر بھی واپس نہیں گئی تھی۔

''وہ بھی اتنے اچھے نہیں ہیں۔ ہزار کاموں کا بوجھ مجھ پہ لادا ہوا ہے اور ذرا سی شاپنگ کی بات کیا کر دی۔ نندوں کو برابر لا کھڑا کیا کہ ان کے کپڑے جوتے نہیں آئے تو تمہارے بھی نہیں آئیں گے۔''

دل نے دلیل پیش کی تھی۔ تب ہی ابا کھنکھارا تھا۔

''سو گئی ہو؟''

''ہماری قسمت میں نیند کہاں، کوئی نہ کوئی ٹینشن رکھی ہی رہتی ہے۔'' ثمینہ نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

عالیہ کان لگا کر سننے لگی۔

''بھلیے لوکے، وہ تو میں عالیہ کو دیکھ کر اس کا دل رکھنے کے لیے بڑھک مار رہا تھا کہ عالیہ کے سسرال والوں کو دھونا پڑے گا۔ کہ عالیہ یہ نہ سوچے کہ ماں باپ کے گھر آئی ہوں اتنے مان سے اور یہ ہی مجھے غلط کہہ رہے ہیں۔ ورنہ تو..... عالیہ بٹیا کی یہ عادت

ماہنامہ کرن

اکتوبر 2023ء کے شمارے کی ایک جھلک

❁ بیادِ محمود بابر فیصل،

❁ میزبان ''نمرہ عمران آرائیں'' سے شاہین رشید کی ملاقات،

❁ اینکر ''ثنا فیصل'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیئے''،

❁ اس ماہ ''آمنہ نور'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،

❁ ''تاش گھر'' ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''دامن سحاب'' مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''گنوا کر دل و جاں ہم'' ام طیفور کا مکمل ناول،

❁ ام اقصیٰ کا مکمل ناول ''شب غم کی سحر

''زحال مسکین مکن تغافل'' ام زویا کا مکمل ناول،

❁ ''سپاس گزار'' میمونہ صدف کا ناولٹ،

❁ صبا زین، سونیا ربانی، لبنیٰ آصف اور عنبرین اعجاز کے افسانے اور مستقل سلسلے،

❁ **''کرن کتاب''**

"دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیدار کھانوں کی ترکیبوں کے ساتھ"

اکتوبر 2023ء کا شمارہ شائع ہوگیا

pklibrary.com

اچھی نہیں ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ کر آ جاتی ہے۔ گھر سے قدم نکالنے والی عورت کے لیے مرد کے دل میں عزت نہیں رہتی۔"

عالیہ دھک سے رہ گئی تھی۔

"وہ تو اپنا احسن اچھا بچہ ہے۔ پیچھے آ جاتا ہے۔ تم صبح عالیہ کو نرمی سے سمجھانا کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ اگر عالیہ کی اس حرکت سے تنگ آ کر احسن بھی نہ آیا تو اور عالیہ جتنی ضد اور انا کی پکی ہے اس کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ بات بگڑ گئی تو ذلیل ہو کے رہ جائیں گے ہم۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ثمینہ نے سرد آہ بھری تھی۔

"بس اولاد ہے ہی ایسی چیز کہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ ورنہ تو..... عالیہ کی یہ عادت مجھے بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چھوٹی دو بہنیں ہیں اس کی ابھی کنواری۔ وہ کیا سیکھیں گی اس کی ان حرکتوں سے۔ اسے خود یہ سب سوچنا چاہیے۔"

عالیہ دم سادھے یہ سب سن رہی تھی اور پاتال میں گرتی جا رہی تھی۔

"اور ویسے بھی عالیہ کے ابا! بیٹی جب تک ہی باپ کے گھر میں رہتی اچھی لگتی ہے، جب تک بیاہ نہ ہو۔ پھر تو جب بیاہ کے بعد آتی ہے تو مہمانوں کی طرح آتی ہے۔ اور تب بھی جب اچھی لگتی ہے جب ہنسی خوشی آئے۔ جھگڑا فساد کر کے آنے والی بیٹی تو ماں باپ کے لیے وبال جان ہوتی ہے۔"

اس ٹھنڈی رات میں عالیہ چارپائی پر بستر میں نہائی پڑی تھی۔ حالانکہ اکتوبر کی ٹھنڈی رات تھی۔

"ہاں، بھلے لوگے۔ کہتی تو سو فیصد ٹھیک ہو، پر اولاد سے خاص کر بیٹیوں سے ایسی باتیں، کھل کر نہیں کی جا سکتیں۔ انہیں خود سوچنا چاہیے کل ہم نہ ہوں گے تو عالیہ کو کوئی برداشت نہیں کرے گا، ایسے اور اب بھی اس گھر میں ابھی تک کوئی بہو نہیں آئی اس لیے۔ کل کو کوئی بہو، عالیہ کو ایک دن بھی برداشت نہیں کرے گی۔" کرم دین اب کے دور کی کوڑی لایا تھا۔

"ہوں! ذرا سمجھاتی ہوں صبح میں عالیہ کو نرمی سے۔"

ثمینہ کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ان دونوں کے خراٹے گونجنے لگے تھے اور عالیہ پوری آنکھیں کھولے سیاہ آسمان کو گھور رہی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکالا تھا اور احسن کو میسج کر دیا۔

"جاگ رہے ہو؟" جواب فوراً آیا تھا۔

"ہاں، بھلا مجھے نیند کیسے آ سکتی ہے تم خود سوچو۔ اچھا نہیں کرتی ہو ویسے تم میرے ساتھ۔"

"میں خود شرمندہ ہوں احسن! تم صبح صبح آ جانا، میں انتظار کروں گی۔"

اس نے دل پہ پتھر رکھ کر آج اپنی ضد اور انا کو کچل ڈالا تھا۔

"جو حکم میرے آقا!" فوراً جواب آیا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے موبائل تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا اور کروٹ لے لی۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا تھا۔

"کتنی کم عقل تھی میں۔ دونوں جگہوں پہ اپنی عزت، قدر گھٹاتی رہی واقعی! بیٹی باپ کے گھر میں شہزادی صرف شادی سے پہلے تک رہتی ہے۔"

وہ سوچ رہی تھی اور سوچتے سوچتے جانے کب میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی پتا ہی نہ چلا تھا۔

☆☆☆

"ارے، بدبختوں، کم بختوں! ہمارے ماموں تو ہم سے بھیڑیں چروایا کرتے تھے جب ہم وہاں جاتے تھے۔ ایک تم ہو۔ ایسے منے رہ کر بھی ستاتے ہو۔"

اگلی صبح، عالیہ کی آواز ابا کی بلند آواز میں بچوں کو ڈانٹنے سے کھلی تھی۔ وہ منہ سے چادر پرے کرتی فوراً اٹھ بیٹھی تھی۔

دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ اس نے ٹائم دیکھا تو آٹھ بج رہے تھے۔ احسن کے چھ بجے کے میسج آئے ہوئے تھے۔

"جاگ گئیں؟" وہ نادم سی ہو کر مسکرا دی تھی۔

"جب جاگ جاؤ تو میسج کر دینا میں آ جاؤں گا۔"

وہ تل پہ ہاتھ منہ دھونے لگی۔ اماں چولہے پہ چائے بنا رہی تھی۔ سعدیہ یقیناً ابھی تک سو رہی تھی۔

نادیہ اور ہما بھی اماں کے ساتھ چھوٹے، موٹے کام کروا رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں تم مجھے یہ طعنہ مت دیا کرو، بھیڑ بکریاں چروانے کا۔ ورنہ میں اپنے بھائیوں کو بتا دوں گی۔"

ثمینہ نے کئی بار کی دی دھمکی دی تھی اور کرم دین ہنس پڑا۔

"لو بھلا میں تمہیں طعنہ دیتا ہوں۔ میں تو بچوں کو قدر، احساس دلاتا ہوں ان کے اتنے اچھے ننھیال کی۔"

"ہاں، جیسے میں تو پاگل ہوں ناں، کچھ سمجھتی ہی نہیں ہوں۔ سناتے تو مجھے ہی ہو ناں۔"

ثمینہ نے تپ کر کہا تھا۔ عالیہ مسکراتی ان کی بحث انجوائے کرتی، اب چارپائی پر بیٹھ کر احسن کو آنے کا میسج کر رہی تھی۔

"ارے، بھلیے لوکے، بس ایسے ہی مخول کرتا ہوں۔ تم غصہ کرتی ہو تو......"

کرم دین نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"اماں، بس ایسے ہی چھیڑتے ہیں ابا! طعنہ نہیں دیتے۔" نادیہ نے ہنستے ہوئے ماں کا موڈ بحال کرنا چاہا تھا۔

"ہاں، تم تو ہو ہی باپ کی چمچیاں، سب سمجھتی ہوں میں، میرا خون جلانے کو ایسی باتیں کرتا ہے۔"

نادیہ اور ہما ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ اب چولہے کے قریب صرف اماں، ابا ہی بیٹھے تھے عالیہ، قدرے فاصلے پر بچھی چارپائی پہ بیٹھی۔ اماں ابا کی باتیں غور سے سنتی موبائل میں مصروف تھی۔

"ارے بھلیے لوکے، میاں بیوی کی لڑائی بھی کوئی لڑائی ہوتی ہے۔ ادھر لڑے، ادھر مل بیٹھے۔ رات کو لڑائی کر کے سوئے۔ صبح کو ہنستے اٹھے۔"

ابا نے سرگوشی میں کہا تھا اور عالیہ کو ایک اور سبق سکھا دیا تھا۔ اس کی ندامت میں تھوڑا اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ نم آنکھوں کو رگڑتی گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جب ہی احسن کی بائیک کا ہارن لکڑی کے پھاٹک کے باہر بجا تھا۔

"احسن بیٹا! آ گیا۔" کرم دین چونک کر اٹھا تھا۔

"ابا! میں جا رہی ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا تھا اور ماں، باپ کو سلام کر کے دوپٹہ ٹھیک کرتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ارے، یوں کیسے، عالیہ بیٹا! ناشتہ تو کر لو۔ احسن کو بھی اندر بلاؤ ناشتہ کر کے جاؤ دونوں۔" کرم دین بوکھلائے سے انداز میں بولا تھا۔

عالیہ لکڑی کا پھاٹک نما دروازہ کھول چکی تھی۔

"ابا! وہیں جا کر کر لیں گے ناشتہ، احسن کو جلدی ہے۔ ضروری کام سے جانا ہے کہیں۔"

"اچھا پھر رب راکھا!" کرم دین نے سکھ کا سانس لے کر کہا تھا۔ ایسا ہی ایک سانس ثمینہ کے سینے سے بھی نکلا تھا۔ اور لکڑی کے پھاٹک کے باہر احسن اور عالیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"قریبی اڈے پر چلتے ہیں ناشتہ وہاں کریں گے۔" احسن نے اس کے بائیک پہ بیٹھتے ہی کہا تھا۔

"کس خوشی میں؟" عالیہ نے چونک کر پوچھا تھا۔

"تمہاری کایا پلٹنے کی خوشی میں یار! پہلی بار تم نے خود بلایا ہے مجھے۔ ورنہ تو جب بھی ناراض ہو کر آتی ہو۔ منتیں کر کر کے لے کر جاتا ہوں۔" احسن ہنس رہا تھا۔ عالیہ ندامت کے ایک اور گڑھے میں گر گئی تھی اور دل میں عہد کر رہی تھی کہ اب کبھی بھی روٹھ کر میکے نہیں آئے گی۔

احسن نے بائیک اسٹارٹ کی تھی۔ تب ہی عالیہ کے کانوں میں کرم دین کی آواز پڑی تھی۔

"ارے، میں تو کہتا ہوں بھلیے لوکے، مجھے کچھ بھیڑ، بکریاں خریدنی پڑیں گے۔ ان ناقدروں کو یہاں کی قدر تب ہی آئے گی۔ جب یہ نامراد، سارا سارا دن بھیڑ بکریاں چراتے پھریں گے۔"

عالیہ نے اپنی ہنسی کا گلا بمشکل گھونٹا تھا اور ہاتھ احسن کے کندھے پر رکھ دیا۔

☆☆

pklibrary.com

سنیعہ عمیر

شاہی کوفتے

کسی زمانے میں رسوئی شروع کرنا بھی ایک اہم رسم ہوتی تھی۔ اپنی گرہستی اپنا چولہا بہت معنی رکھتے تھے۔

میں نے جب اپنا کچن سیٹ کیا تو صرف میں اور میرا میاں تھے۔ پاکستان میں جتنا عرصہ رہی سسرال میں کسی نے کام ہی نہیں کرنے دیا۔ اس لیے پہلے دو دن کھانا باہر سے آیا۔ برتن دھلنے لگے۔ دیگچیوں کو زحمت ہی نہ ہوئی، میں پوری طرح گھر سیٹ کرنے میں مصروف تھی۔

ملک سے باہر ہمارا چھوٹا سا آشیانہ تھا۔ ہر کام خود کرنا پڑتا ابتدا میں نہ سودے کی سمجھ آتی تھی نہ الیکٹرک برنر کی۔ پہلی کلاس کی طالبہ کی طرح میں نے ہر چیز نئے سرے سے سیکھی تھی۔

پہلے بڑا معرکہ لگتا تھا، وہ اس لیے کہ شادی سے پہلے میں پڑھائی میں مگن تھی۔ شوقیہ ڈش بنانے کچن میں جاتی تھی۔ اس لیے روٹی سے صرف کھانے کی حد تک تعلق تھا اور آٹے سے دور کی سلام دعا تھی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور لگی رہی۔

☆☆☆

اس دن میں نے پہلی بار، چولہے سے ہلکے اتارے تو اپنا اور آٹے کا گٹھ جوڑ دیکھ کر خود ہی خوشی سے پھول گئی۔

''آج تو اتنی ہلکی روٹی ہے کہ دل کر رہا ہے کھاتی جاؤں۔'' میں نے اپنی ہی تعریفوں کے پل باندھے۔

''ہوں کسی دن کوفتے بھی بناؤ۔'' ظہیر نے فرمائش کی۔ میرے پھلکے سے بھاپ اور جسم سے جان نکل گئی۔

''کوفتے؟'' میں نے ایسے کہا جیسے ماؤنٹ ایورسٹ ہو۔

''انٹرنیٹ سے کوئی ترکیب دیکھ لو۔ بہت شاہانہ ڈش ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی پہچان یہ کباب اور کوفتے ہی تو تھے۔'' ظہیر تاریخ کو بھی گھسیٹ لائے۔

پھر اپنے بچپن کے قصے بتانے لگے۔ جیسے میرے گھر میں آلو فرائی، سب کی پسندیدہ ڈش تھی ویسے ان کے گھر میں کوفتے کا راج تھا۔ مگر یہ ظہیر کا بچپن تھا میرا بچپن اس سے سراسر الٹ تھا۔

☆☆☆

تمام خاندان لاہور میں رہتا تھا۔ مگر نانی کا گھر فیصل آباد میں تھا۔ امی بتاتی ہیں لاہور سے لگ بھگ تین گھنٹے کے فاصلے پر ہمارے شہر میں رشتہ داروں کا اکثر آنا ہوتا۔ وہ آتے کبھی تو کبھی رات رکتے، کبھی دن گزارتے کبھی اس کے بیچ ستاتے۔ ایک روز پھوپھا جی کی کال آئی کہ کل انہوں نے فیصل آباد آنا ہے۔

''ایسا ہے تو پھر ہماری طرف ہی ٹھہریے گا۔ کھانا بھی ادھر ہی کھایے۔'' نانی نے فراخ دلی سے کہا۔

''مجھے ضروری کام کرنا ہے۔ بس روٹی تمہاری طرف آ کر کھاؤں گا۔ کوئی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کوفتوں کا سالن پکا لینا۔'' انہوں نے خاصے رعب سے کہا۔

وہ امی کے پھوپھا تھے اور خاندان بھر میں رعب کے لیے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اگلے کو آسانی کہی۔ مگر نانی کے گھر تو کھلبلی مچ گئی۔

ماموں بھی چھوٹے تھے۔ وہ سائیکل پر جا کر کونڈی ڈنڈا لائے۔ ان دونوں فریج بھی نہیں ہوتے تھے۔ تازہ قیمہ آیا، نانی نے مسالے ڈال کر قیمہ کوٹا۔ میں تو تھی نہیں۔ میری امی تھیں جو مسلسل سوچ رہی تھیں کہ کیا مصیبت ہے۔ پہلے بوٹی کو قیمہ کرو۔ پھر قیمے کو مزید قیمہ کرو۔ پھر گول گیند بنا کر پھر بوٹی بنانے کی کوشش کرو۔ جبکہ دانتوں سے پھر قیمہ ہی کرنا ہے۔

کوفتے ہمارے گھر شاذ و نادر ہی بنتے تھے اور کسی کو ان کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب ظہیر نے فرمائش کی تھی تو پوری تو کرنی تھی۔

☆☆☆

pklibrary.com

''تھوڑا دور جانا پڑتا ہے مگر اس اسٹور پر پاکستانی چیزیں ملتی ہیں۔ وہیں سے کوفتے لائی ہوں۔''

میں نے بہت خوش ہوتے ہوئے ڈونگا آگے کیا۔

ظہیر بسم اللہ پڑھ کر کھانے لگے۔ میرے لیے کوفتے اندر سے خشک تھے۔ ظاہر ہے تازہ جو نہیں تھے۔ مرچ بھی میرے حساب سے زیادہ تھی۔ مگر آدھا دن میں بننے والی ہانڈی، ریڈی میڈ کوفتوں کے باعث آدھے گھنٹے میں بن گئی۔ کتنا وقت بچا، میں نے اچھائیاں گن کر پورا کھانا کھالیا۔

''کیوں ظہیر کیسے ہیں؟'' آخری نوالے پر مجھے ان کا بھی خیال آیا۔

''ہوں..... خود بناؤ تو زیادہ اچھے بنتے ہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

میں شرمندہ ہوگئی۔ شوہر نے پہلی بار فرمائش کی تھی۔ میں وہ بھی صحیح سے پوری نہ کرسکی۔

☆☆☆

میرے بیٹے نے جب روٹی کھانی شروع کی تو میں اس کے لیے آلو فرائی بنانے لگی۔ صرف نمک، کالی مرچ، تیل اور آلو، سادا سی جھٹ پٹ ریسپی اور مشرق مغرب کا ملاپ۔ چاہے کانٹے سے کھالو یا روٹی کے ساتھ۔

زوہان کو بھی بہت پسند تھا۔ وہ تو تقریباً روز ہی کھاتا تھا۔ زوہان کے ساتھ ہم پاکستان ہو کر آئے تھے۔ تو ظہیر کی امی کے ہاتھ کے کوفتے بھی کھائے۔

وہ سچ میں بہت مزے کے تھے۔ اس لیے واپس آکر میں نے ان ہی کی ریسپی سے کوفتے بنائے، میں باقی کاموں میں بہت طاق ہو چکی تھی۔ پھر بھی کوفتوں میں محنت لگی۔ مگر یہ محنت ظہیر کی خاطر تھی۔ پسینے کی ہر بوند سے میرا چہرہ دمک رہا تھا۔ بھاگ دوڑ سے میرا خون بڑھ رہا تھا اور ظہیر کی خاطر وقت صرف کرنا تو میرے لیے اعزاز تھا۔

جب میں نے دوپہر میں کھانا کھایا تو مجھے لگا میں نے کمال ہی کردیا بس اب تو ہر دعوت کی ایک ڈش پکی ہوگئی۔

میں خود کو سراہتی خود سے ہی باتیں کرتی اس دن ہواؤں میں تھی۔

☆☆☆

''کیسے بنے۔ میں نے فون کرکے پاکستان سے ریسپی لی ہے۔''

میں نے خوش ہو کر نوالہ لیا اور کوفتے پر دہی لگا کر زوہان کو بھی دیا۔ تین چار نوالے کھانے کے بعد مجھے احساس ہوا ظہیر خاموشی سے کھا رہے ہیں۔ انہوں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔

''کیسے بنے ہیں؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''اچھے ہیں مگر امی کے جیسے نہیں ہیں۔'' انہوں نے مجبوراً کہا۔

میرا تو سارا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ اتنی محنت کی اور یہ سننے کو ملا۔ ہائے اب ساس کا فون آئے گا تو ان کو بھی بتائیں گے۔ میری ساس کو اور موقع مل جائے گا مجھ میں کیڑے نکالنے کا میں بدمزہ ہوگئی مگر ہار نہ مانی۔

☆☆☆

کسی نے کہا بریڈ کے سلائس ڈالو، کسی نے کہا پیاز کا چورا ڈالو، کبھی دہی تو کبھی میٹھا سوڈا۔ میں نے آہستہ آہستہ خود کو کوفتوں میں طاق کرلیا۔ پوری کمیونٹی میں میرے ہاتھ کے کوفتوں کی دھوم تھی۔

زوہان اور ابراہیم نے بھی ایک فلم دیکھی تھی۔ جس میں گدھا راجا بن جاتا ہے اور اسے شاہی کوفتے پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک تو پسندیدہ فلم میں ذکر پھر میرے ہاتھ کے کوفتوں کی دھوم، میرے بچوں کے بھی کوفتے پسندیدہ ہوگئے اور میرے کوفتے ترقی کرکے شاہی کوفتے کہلانے لگے۔ ظہیر ہمیشہ خاموشی سے کھاتے مگر بولتے کچھ نہیں۔

''سارے ڈنر پر میرے شاہی کوفتوں کی دھوم تھی۔ آپ کے علاوہ سب نے تعریف کی۔'' میں نے ایک روز پھر سے گلا کیا۔

''میں نے کھا لیے مطلب اچھے تھے اور یہی

تعریف ہے۔'' وہ سادگی سے کہنے لگے۔

''منہ سے کھا رہا ہوں مطلب اچھے ہیں اور یہی تعریف ہے۔'' وہ سادگی سے کہتے۔

''منہ سے کھا رہے تھے مگر دل میں تو یہی سوچ رہے ہوں گے کہ آپ کی امی جیسے نہیں ہیں۔'' میں نے روٹھ کر کہا۔

''میں سادا انسان ہوں تعریف نہیں کرتا تم جانتی ہو۔'' وہ بہانا بناتے۔ مگر یہ سچ نہیں تھا وہ کبھی میری کھیر تو کبھی بریانی کی تعریف میں ''ناس'' کہہ دیتے تو میرا دن بن جاتا۔ مگر کوفتوں کے معاملے میں میری جیت کبھی نہیں ہوئی۔

☆☆☆

بچے بڑے ہوئے تو انگریزی ڈشز شامل ہونے لگیں۔ پاستا تو زوہان خود ہی بنالیتا تھا۔ ایک روز میں بہت بری طرح بیمار ہوگئی۔ بخار نے کھانے پینے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ ایک آدمی، دو لڑکے اور میں بیمار، گھر کی تو حالت ہوگئی تھی۔

میں تو دودھ بسکٹوں پر تھی۔ زوہان اور ظہیر تجرباتی کھانے بنا کر پیٹ کی آگ مٹا رہے تھے۔ اس رات میں نے اللہ سے بہت دعا کہ بچوں کی خاطر مجھے صحت دے دے۔ میں اٹھ کر ان کی ذمہ داریاں ہی نبھا سکوں۔

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ ظہیر کے اندر کا سگھڑ آیا۔ جس کی کافی دن سے، گھسائی ہو رہی تھی اس دن چمکنے لگا۔ انہوں نے بچوں کو لگایا، کچن سمیٹا۔ صفائی کی لانڈری کی بلکہ مجھ سے ترکیب پوچھ کر سالن بھی بنا دیا۔ کچھ اس کے کھانے کی خوشبو کچھ میری سبھلتی طبیعت، دوپہر کو میں کمرے سے نکل کر چار دن بعد ڈائننگ ٹیبل تک آئی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔

''آج تو میں ڈبل کھاؤں گا۔ میرا فیورٹ آلو فرائی ہے۔ میں نے کام بھی بہت کیا ہے۔ اب بڑا ہو کر دھوبی بن جاؤں گا۔'' زوہان نے کہا۔

''آج کی محنت سے چلو اس کا کیریئر تو سیٹ ہوا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''سارا کام تو میں نے کیا ہے۔ تم اور ابراہیم برتن دھوتے ہوئے جھاگ سے کھیل رہے تھے۔'' ظہیر کو بھی آج تعریف چاہیے تھی۔

''ہاں پاپا از گریٹ، آلو ایسے کاٹے جیسے کوئی نجا (Ninja) ہوں۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔'' ابراہیم نے نقل اتاری۔

''شکریہ ظہیر! مجھے تو بیماری نے بدحال کر دیا ہے۔'' میں نے بھی ان کے احساس کو سراہا وہ اس معاملے میں بھی سادا تھے۔ تعریف سن کر بھی شرما جاتے تھے۔

''چلو اب کھانا کھاؤ، سارے کیسے بنے ہیں۔'' انہوں نے بات پلٹی۔

''بہت اچھے ہیں مگر ماما جیسے نہیں ہیں۔'' زوہان نے کہا اور ویسے ہی کہا جیسے ظہیر کوفتوں کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ ظہیر کے چہرے پر ویسی ہی الجھن آئی جو میرے چہرے پر آئی تھی۔ وہ ہی ترکیب وہی اجزا۔ اتنے لذیذ مگر امی جیسے نہیں ہیں۔

''ماں ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ کا ذائقہ بھی بس اس کے پاس ہی ہوتا ہے۔ تمہارے پاپا نے بہت اچھے آلو فرائی بنائے ہیں تھینک یو۔ بولو'' میں نے پیار سے سمجھایا۔

''تھینک یو پاپا۔'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

اس دن میں خود بھی سمجھ گئی۔ میرے شاہی کوفتے چاہ کر بھی، میرے شوہر کی ماں اور بچپن کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ ان کے دل میں ماں کے ہاتھ کے بنے وہ کوفتے ہمیشہ افضل رہیں گے، جو وہ بچپن میں کھاتے تھے۔ میں نے پھر اس لاحاصل مقابلے بازی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

خواہش کا دیا

فرح حیرت اور خوشی سے اپنے سامنے رکھی چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سادہ سی منگنی میں، اتنے پیارے اور خوب صورت تحفے ملیں گے چونکہ دونوں خاندان مالی طور پر بہت خوش حال نہیں تھے اس لیے ہر کام میں، سادگی ہی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر فرح کے لیے عام سی منگنی پر خاص تحفے دلی مسرت کا باعث بنے۔ اسے ہمیشہ سے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا، جو زیادہ تر عید کے جوڑے کی صورت میں پورا ہوتا کیونکہ گھر میں کمانے والا صرف ایک تھا، جو مشکل اپنے بیوی بچوں کا بوجھ اٹھا رہا تھا۔

سعدیہ بیگم کو ہر مہینے باقاعدگی سے مرحوم شوہر کی پینشن ملتی تھی۔ کچھ فرح بھی ٹیوشن پڑھا کر کما لیتی جس سے ان ماں بیٹی کا گزارہ ہو جاتا۔ سب سے بڑا عابد تھا جو شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔ اس سے چھوٹی حرا، پھر فرح تھی۔ حرا کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی۔ فرح کے رشتے کے لیے، کشور نے بڑی بہن سعدیہ سے بات کی ہوئی تھی۔ اس لیے، فرح کے ایم۔اے کرتے ہی، وہ باقاعدہ منگنی کی رسم کرنے پہنچ گئیں اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی مانگ لی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ وہ دیکھتی رہ گئی مگر خوش بھی تھی کہ کشور خالہ کے گھر، وہ اکلوتی اور لاڈلی بہو بن کر رہے گی۔ کشور خالہ کی اپنی اکلوتی اولاد فیضان میں جان تھی۔ فیضان بھی تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ سعدیہ بیگم بہت خوش اور مطمئن تھیں کہ فرح اپنی خالہ کے گھر جا رہی ہے۔

''شکر ہے فرح کو سب چیزیں پسند آئی ہیں۔'' کشور خالہ نے اس کے چمکتے چہرے کو دیکھ کر کہا تو وہ، جھینپ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

''یہ سب ابھی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شادی کچھ مہینوں بعد ہے۔ تب کام آئیں گی۔ سنبھال کر رکھ دو۔''

کشور خالہ کے جانے کے بعد، جب فرح اور حرا کپڑے دیکھتے ہوئے تبصرے کر رہی تھیں تو سعدیہ بیگم نے کہا۔ وہ چونک گئی۔

''ویسے فرح کی قسمت اچھی ہے۔ ہمیں تو سسرال سے ایسے تحفے نہیں ملے۔''

عالیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے حسرت بھرے انداز میں کہا۔ اس کے تینوں بچے بھی بھاگتے ہوئے پاس آئے اور حیرانی سے چیزیں دیکھتے ہوئے مختلف سوال کرنے لگے۔

''بس بھابھی! اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ حسد کیا کرنا۔'' حرا نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا مگر عالیہ تپ گئی۔

''حسد کرتی ہے میری جوتی، اس گھر میں تو میرے بچوں کو کبھی ان کا حق نہیں ملا، جو مجھے کچھ مل جائے گا۔'' وہ غصے میں بولتی واپس چلی گئی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی یہ بات کہنے کی؟ عابد بے چارا پہلے ہی اپنے حالات کی وجہ سے پریشان ہے اور بلاوجہ کی لڑائیاں۔''

سعدیہ بیگم نے بیٹی کو ڈانٹا۔ بڑے بیٹے کی معمولی نوکری اور بڑھتے اخراجات کی وجہ سے وہ فکر

مندر ہتیں۔ عالیہ کے بگڑے مزاج کی وجہ بھی ان کے خراب مالی حالات تھے۔ دراصل عابد کی تعلیم واجبی سی تھی۔ ہنر کوئی تھا نہیں، اس لیے ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ تنخواہ کم اور اخراجات کا پہاڑ تھا جسے سر کرنے کی کوشش میں وہ تھک جاتا۔ سعدیہ بیگم کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ اپنا بوجھ بیٹے پر نہ ڈالیں۔ وہ بہت سمجھ داری سے شوہر کی پنشن میں گزارہ کر رہی تھیں۔ یہ سب وہ فرح کو بھی سمجھاتی رہتیں کہ کفایت شعاری سے گھر چلانا، عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

فرح کی شادی، روایتی رسم ورواج کے ساتھ مگر سادگی سے سرانجام پائی۔ میکے کے تنگ ماحول کی نسبت سسرال میں، حالات بہتر تھے کیونکہ افراد کم تھے۔ فیضان جو بھی کماتا گھر پر ہی خرچ کرتا۔ فیضان کی جاب اچھی تھی جس میں ترقی کے مواقع بھی تھے۔ فرح جو میکے میں خواہشوں کو مار کر جی رہی تھی، سسرال میں ملی آزادی، اس کے لیے بہت خوش گوار ثابت ہوئی تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن، میکے کے حالات سے یکسر بے خبر رہنے لگی۔

☆☆☆

نرم ریت کو اپنے قدموں تلے روندتے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ساحل سمندر کے کنارے چل رہے تھے۔ تیز ہوا، آس پاس لوگوں کا شور، چیزیں بیچنے والوں کی آوازیں، سمندر کا گدلا پانی، جو تیزی سے ان کی طرف بڑھتا مگر مخصوص فاصلے کی وجہ سے ناکام ہو کر واپس پلٹ جاتا۔ بھٹہ کھاتے ہوئے وہ عام سی باتیں کرتے ہوئے بھی دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ یہ ہنسی اس ساتھ اور سکون کے لیے تھی جو وہ ایک دوسرے کی سنگت میں محسوس کرتے تھے۔ ان کی شادی کو چھ مہینے گزر گئے مگر لگتا تھا کہ کل کی بات ہے۔ فیضان اس کا بہت خیال رکھتا۔ فرح بھی فیضان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتی تھی۔ شادی کے بعد تو وہ ساری دنیا بھول گئی تھی۔ باتیں کرتا ہوا فیضان، اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی کی طرف لے گیا۔

"اگر میں ڈوب گئی تو؟" اس نے پیروں کے نیچے سے کھسکتی ریت کی بے اعتباری پر گھبرا کر سوال کیا۔

"میں نے ہاتھ تھام رکھا ہے۔ بے فکر رہو۔" وہ مسکرایا تو فرح بھی مطمئن ہو گئی۔ غروب آفتاب کا وقت قریب تھا۔ سمندر کے اُس پار سورج ڈوبتے ہوئے پراسرار لگ رہا تھا، جیسے کسی جادو نگری کا مکین ہو۔

"میری خواہش ہے کہ میں بہت جلد اپنی گاڑی خرید لوں مگر ابھی تو یہ ممکن نہیں ہے۔" واپسی پر بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے فیضان نے ہنس کر کہا۔

"ان شاء اللہ بہت جلد ہمارے سب خواب پورے ہوں گے۔" فرح نے یقین سے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ وہ شام ڈھلے گھر لوٹے تو کئی خواب، ان کی آنکھوں کے سمندر میں ابھر کر ڈوب رہے تھے

۔انھیں امید تھی کہ ان کے خوابوں کو بھی ،یقین کا کنارہ ضرور ملے گا۔اس کے لیے فرح نے بھی عملی قدم اٹھانے کا سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

''خالہ! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

فیضان ناشتہ کر کے آفس چلا گیا تو وہ چائے بنا کر لاؤنج میں لے آئی۔

''مجھیں پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

وہ مسکرائیں تو اسے حوصلہ ہوا۔

''آپ جانتی ہیں کہ شادی سے پہلے بھی میں محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی۔اس سے آمدنی بھی اچھی ہو جاتی اور وقت بھی کٹ جاتا۔مجھے پتا چلا ہے کہ قریبی اسکول میں ٹیچر کی ضرورت ہے۔میں سوچ رہی تھی کہ کوشش کر کے دیکھ لوں۔فیضان تو شام کو گھر آتے ہیں۔سارا دن فارغ رہتی ہوں۔اچھا ہے کچھ کر لو۔اس طرح کچھ پیسے بھی جوڑ لوں گی تاکہ فیضان جلدی گاڑی خرید سکیں۔''

اس نے نرمی سے کہا۔کشور کچھ دیر سوچتی رہیں۔وہ ان ساسوں میں سے ہرگز نہیں تھی، جو بہو کے سانس لینے پر بھی پابندی لگانا فرض سمجھتے ہیں۔فرح کی اچھی سوچ نے ان کے دل میں سکون پھیلا دیا۔

''اسے فیضان کی کتنی فکر ہے۔'' وہ محبت سے سوچ رہی تھیں۔

''فیضان سے پوچھ لو۔مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' فرح کا چہرہ کھل اٹھا۔

''ان سے بات کر لی ہے۔کل صبح ان کے ساتھ انٹرویو دینے چلی جاؤں گی۔''

وہ جلدی سے کہہ کر چلی گئی۔کشور سر جھٹک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔جلد ہی فرح کو نوکری مل گئی۔وہ بہت خوش تھی۔فیضان اسے خوش دیکھ کر خوش تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ فرح اپنی مرضی اور خوشی سے ہر فیصلہ کرے۔فرح نے اپنی دوستانہ فطرت کی وجہ سے جلد ہی سب ٹیچرز سے دوستی کر لی۔ان کے ذریعے ہی اسے پتا چلا کہ سب ٹیچرز کمیٹی بھی ڈالتی ہیں۔

''ایک کمیٹی اگلے مہینے سے شروع ہو رہی ہے۔اگر تمہارا ارادہ ہو تو بتا دینا۔'' مس ندرت نے کہا تو اس نے فوراً ہامی بھر لی۔یہ کمیٹی پچاس ہزار کی تھی۔

''بڑی کمیٹی چھ مہینے کے بعد شروع ہوگی۔''

فرح کے پوچھنے پر صدف نے بتایا۔فرح کی سب سے پہلے اور قریبی دوست صدف ہی بنی تھی۔دونوں ہم عمر تھیں۔صدف کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔وہ جو بھی کماتی، کھلے ہاتھوں سے خرچ کر دیتی کیوں کہ اس پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔فرح جو دبے ماحول سے آئی تھی اس کے لیے صدف ،ایسا قطب نما ثابت ہوئی جو خواہشوں کی نگری میں اسے نت نئے راستے دکھاتی۔فرح بہت جلد اس کے رنگ میں رنگتی چلی گئی۔صدف سے ہی اس نے سیکھا کہ خواہش کو اپنا آقا کیسے بناتے ہیں۔

☆☆☆

''مجھے نہیں پتا! سب کے پاس اچھے موبائل ہیں۔میرے پاس عام سا موبائل ہے۔مجھے نیا موبائل لینا ہے۔''

پچھلے کئی دنوں سے وہ مسلسل ضد کر رہی تھی۔فیضان نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔پہلے جھک کر فرمائش کرنے والی فرح ،اب ضد کرتے ہوئے یہ بھی بھول جاتی تھی کہ فیضان کی جیب اس کی خواہش پوری کرنے کی استطاعت رکھتی بھی ہے یا نہیں۔

''مجھے امید ہے کہ اگلے سال ضرور بونس ملے گا۔تب تم اپنی مرضی اور پسند سے موبائل خرید لینا۔''

اس نے نرم لہجے میں کہا۔کشور خاموش بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھیں کہ میاں بیوی کے معاملے میں وہ نہیں بولتی تھیں۔

''اف اگلے سال تک کون انتظار کرے؟ میری کمیٹی اس مہینے نکل رہی ہے۔پچاس ہزار کمیٹی

کے ہوں گے۔ باقی آپ ڈال دیجیے گا۔ میں نے جو موبائل پسند کیا ہے، وہ ستر ہزار کا ہے مگر صدف کے بہنوئی کی واقفیت کی وجہ سے ساٹھ میں مل جائے گا۔"

وہ سب کچھ طے کر کے آئی تھی۔ اس لیے بے فکری سے کہنے لگی۔ فیضان کے چہرے پر واضح ناگواری تھی مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

"فرح بیٹی! تم نے یہ کمیٹی تو گاڑی میں پیسے ڈالنے کے لیے رکھی تھی نا؟" کشور نے حیرانی سے پوچھا۔

"پچاس ہزار سے کیا فرق پڑ جائے گا اور ویسے بھی کون سا ابھی فیضان گاڑی خرید رہے ہیں۔"

وہ لاپروائی سے کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ کشور افسوس سے سر ہلانے لگیں۔ فرح کو نوکری کرتے ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے۔ اس دوران اس کے رنگ ڈھنگ بالکل بدل گئے۔ گھر کے کاموں سے یکسر لاپرواہ رہنے لگی۔ اسکول سے آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ فیضان شام کو گھر آتا تو وہ ٹکٹکی جیلیے میں تھکی ہاری سوئی ہوئی ملتی۔ فیضان کو چائے وغیرہ پوچھنا تو دور کی بات تھی۔ اسے یہ بھی فکر نہیں ہوتی کہ رات کو کھانے میں کیا بنانا ہے؟ کشور ہی بیٹے کے آگے پیچھے رہتیں اور اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میز پر کھانا لگا دیتیں۔

وہ صرف کھانا کھا کر، رات کے برتن دھو کر چائے بناتی مگر تب بھی اس کا موڈ آف رہتا کہ اسکول میں بہت کام ہوتا ہے۔ گھر کے کاموں کے لیے مستقل ملازمہ ہونی چاہیے۔ جس کے لیے کشور اور فیضان نہیں مانتے تھے کہ ان کے گھر میں کام ہی کتنا ہے، جو وہ اضافی خرچہ اپنے سر لیں۔ فرح جو بھی کماتی تھی، خود پر خرچ کر رہی تھی۔ صدف اسے اپنے ساتھ مختلف شاپنگ مالز میں لے جاتی جہاں مہنگے برانڈز پر خریداری کرتے ہوئے اس کا پرس فوراً خالی ہو جاتا مگر وہ، خوش تھی کہ اس کے پاس مہنگے کپڑے اور برانڈڈ چیزیں ہیں۔ فرح کی فضول خرچیوں پر فیضان نے ایک بار ٹوکنا چاہا، مگر وہ ان سنی گئی؟ فیضان بھی چپ کر گیا کہ وہ بحث کر کے لڑائی نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

"آپ نے بتایا نہیں؟ میں نے پیسے جمع کروانے ہیں۔" فرح نے اپنا مطالبہ پھر سے دہرایا تو ٹی وی دیکھتا فیضان، غصے سے ریموٹ پھینک کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟ جب میں نے ایک بار منع کر دیا ہے کہ اسکول ٹور کے ساتھ تم ناردرن ایریا نہیں جاؤ گی تو بار بار پوچھنے کا مطلب؟"

"تو آپ کیوں نہیں مجھے آج تک لے کر گئے؟ ہمیشہ محدود آمدنی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ اتنا اچھا موقع مل رہا ہے مگر۔۔۔"

وہ منہ بسور کر کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تو سامنے، پریشان کھڑی خالہ کشور کو دیکھ کر چونک گئی۔

"فیضان کو پہلی بار چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔" وہ فکرمندی سے کہنے لگیں۔

"آپ نے بہت سر چڑھایا ہوا ہے۔ کوئی بات نہیں سنتے۔ ہر بات میں اپنی مرضی، من مانی کرنے کی عادت ہے۔" وہ چڑ کر کہنے لگی۔

"بری بات ہے۔ شوہر ہے تمہارا۔ تمہیں اس کی بات سننی چاہیے۔" انھوں نے نرمی سے ٹوکا۔

"میرا مطالبہ کون سا غلط ہے؟ سب ٹیچرز جا رہی ہیں۔" وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ کشور نے مزید بحث نہیں کی۔ اسے کیا سمجھاتیں جو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ فرح اسکول ٹرپ کے ساتھ نہیں جا سکی جو صرف ٹیچرز کو لے کر جا رہا تھا۔ اس بات کا افسوس اسے کئی دن رہا، جس کا اظہار وہ اپنے برے رویے سے کر کے گھر کا ماحول خراب کرتی رہی۔

☆☆☆

"اچھا ہوا تم آج ملنے چلی آئیں۔ تمہاری چچی

افراء کی شادی کا کارڈ دے گئی تھیں۔"

آج کافی دنوں کے بعد اس کا میکے کا چکر لگا تو سعدیہ بیگم نے شادی کا کارڈ اسے تھمایا، جسے کھول کر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجب چمک تھی۔

"اب مزا آئے گا۔ چچی نے ہمیشہ ہمیں غریب سمجھ کر برتاؤ کیا ہے مگر افرا کی شادی میں، میں انھیں دکھادوں گی کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔"

اس نے غرور سے کہا۔ سعدیہ بیگم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ان کا ہمارے ساتھ کیا مقابلہ ہے؟ وہ امیر لوگ ہیں اور ہم مڈل کلاس۔ فضول کے مقابلے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سختی سے گویا ہوئیں، مگر فرح دل میں ٹھان چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ گھر آتے ہی اس نے شادی کا کارڈ فیضان کو دکھایا اور اسے شاپنگ پر لے جانے کا کہا۔

"کتنی شاپنگ کرنی ہے؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ فرح نے گھورا۔

"میرا بجٹ کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ بس میں شادی میں کسی سے کم نہیں لگنا چاہتی ہوں۔"

اس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ خاموشی سے سر ہلانے لگا۔ ویک اینڈ پر وہ دونوں شاپنگ پر گئے مگر جب واپس آئے تو دونوں کے موڈ ہی سخت آف تھے۔

"کیا ہوا؟" کشور نے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"اماں! اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ اتنے مہنگے سوٹ پسند کیے کہ میرے پاس مزید کسی چیز کے لیے پیسے نہیں بچے ہیں۔"

اس نے تپ کر کہا۔

"شادی کون سا روز روز آنی ہے؟ میری عزت کا سوال ہے۔"

وہ بھی تڑخ کر بولی۔ کشور نے بمشکل دونوں کو چپ کروایا۔ فرح نے اپنے بجٹ سے باہر نکل کر بہت مہنگے، دو سوٹ خرید لیے تھے جس کے ساتھ باقی کے سب لوازمات بھی چاہیئے تھے۔

"اچھا تم فکر مت کرو۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔" کشور نے دونوں کے بیچ بحث ختم کروانے کے لیے کہا۔

"آپ اپنی بہو کو سر چڑھا رہی ہیں۔" وہ غصے سے کہتا کمرے میں چلا گیا۔

"دیکھا آپ نے؟" فرح نے ناگواری سے کہا۔

"بیٹی! تم بھی اس پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ اس کی تنخواہ تمہارے سامنے ہے۔ نہ وہ فضول خرچ ہے نہ خود پر پیسہ خرچ کرتا ہے۔ جو کماتا ہے تم پر یا گھر پر لگا دیتا ہے۔" وہ نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں فضول خرچ ہوں۔" وہ تپ گئی اور ان کی بات سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ کشور سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"اسے کون سمجھائے؟" وہ بے بسی سے بڑبڑانے لگیں۔ فرح اور فیضان میں آئے روز چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلافات بڑھنے لگے تھے۔ فیضان کو شکوہ تھا کہ فرح اس کے حالات کو نہیں سمجھ رہی اور اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلاتی ہے، جبکہ فرح کو لگتا کہ فیضان کو بچت کرنے کی عادت ہے اس لیے وہ کنجوسی سے کام لیتا ہے۔ فرح کو وہ سب باتیں اور خواب بھول گئے تھے، جو کبھی ساحل سمندر پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہوئے ان دونوں نے ریت کے گھروندے کی طرح بنائے تھے۔ وقت نے ثابت کیا کہ ان کے سب عہد ریت کے گھروندے ہی تھے۔

☆☆☆

باقی کی ساری تیاری اس نے صدف سے پیسے ادھار لے کر کی تھی۔ مہندی، بارات پر اس نے شہر کے مشہور پارلر سے پارٹی میک اپ کروانے کا سوچا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ خاندان بھر میں اس کی دھوم مچ جائے گی۔ اس نے کسی چیز میں کمی نہیں رکھی۔ مہندی کا دن آیا تو وہ خوب صورت لہنگا چولی میں ملبوس، نفاست سے تیار جب ہال میں پہنچی تو

سب سے زیادہ حیران، اس کے میکے والے ہوئے۔

''تمہارے، تو رنگ ڈھنگ ہی بدلے ہوئے ہیں۔'' حرا نے حیرانی سے کہا۔ عالیہ اور سعدیہ بیگم کے تاثرات بھی مختلف نہیں تھے مگر وہ سب سے بے پرواہ تتلی بن کر، یہاں سے وہاں اڑتی پھر رہی تھی۔ وہ جو بہت ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ تب ہی اس کی خوش فہمی کے غبارے کی ہوا نکل گئی، جب اس نے اپنے آس پاس مہنگے اور جدید کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں اور خواتین کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے چاچو بہت مشہور کاروباری شخصیت ہیں۔ ان کا ملنا ملانا بھی ایسے لوگوں سے ہی تھا۔ جن کے نزدیک یہ سب عام سی باتیں تھیں۔

''امی! بھائی اور بچے نہیں آئے؟'' پورے ہال کا جائزہ لینے کے بعد وہ واپس اپنی اوقات میں آتے ہوئے بولی۔

''آئے تو ہیں۔ کسی کونے میں بیٹھے ہوں گے۔''

سعدیہ بیگم کے لہجے میں دکھ تھا۔ فرح کو ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ مہندی کا فنکشن بہت دھوم دھام سے ہوا۔ اگلے دن بارات تھی۔ وہ پارلر سے تیار ہو کر گھر آئی۔ خالہ کشور نے دیکھتے ہی تعریف کی۔ آج وہ بھی ان کے ساتھ جا رہی تھیں۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

مہنگی میکسی پہنے، اس نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ بہت ناز بھرے انداز میں فیضان سے پوچھا، اس نے سرسری نگاہ ڈالی۔

''اتنا پیسہ لگا کر تو کوئی بھی اچھا لگ سکتا ہے۔''

اس نے کندھے اچکا کر بے زاری سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے دل کو شدید دھچکا پہنچا۔ بہت غور سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ وہ بلاشبہ بہت پیاری لگ رہی تھی مگر کیا فائدہ، اگر اس کے محبوب نے ہی سراہا نہیں تھا۔ بے دلی کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکلی۔ فیضان نے شادی مبارک کے لفافے میں پیسے ڈال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''اتنی سلامی؟'' کشور نے حیرانی سے کہا۔

''آپ کی بہو کا حکم ہے۔ نہ مانا تو اگلے کئی دن گھر میں لڑائی رہے گی۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ فرح تیزی سے باہر کی طرف بڑھی۔

''حد ہے دوسروں کی شادی میں اتنا اسراف کون کرتا ہے؟ پہلے حیثیت سے بڑھ کر شاپنگ اور اب اتنی سلامی؟''

کشور کے صبر کا پیمانہ بھی آج لبریز ہو گیا تھا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی چادر لینے چلی گئیں۔ فیضان گہری سانس لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ جب وہ سب ہال پہنچے تو حرا اور سعدیہ بیگم بھی اپنی اپنی فیملی سمیت آ چکے تھے۔ سب گرم جوشی سے ملے۔ عابد بھائی اور بچوں سے ملتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ عابد بھائی کے کپڑے بہت پرانے تھے، جبکہ جوتی کی رنگت بھی اڑی ہوئی تھی۔ بچوں کی حالت بھی الگ نہیں تھی۔ بھلے انھیں گھر میں موجود سب سے اچھے کپڑے پہنائے گئے تھے، مگر ان کپڑوں کی حالت بھی بہت اچھی نہیں تھی۔ بچوں کی عمریں بالترتیب نو، سات اور پانچ سال تھیں۔ تینوں بچے خاموشی سے کونے میں بیٹھ کر، سامنے کھیلتے بچوں کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہاں آتے ہوئے فرح جتنی خوش تھی، اس کی ساری خوشی ختم ہو گئی۔

عالیہ نے شاید اپنی بری کا کوئی کام والا جوڑا پہنا تھا جس کا پرانا، پھیکا کام واضح تھا۔ عالیہ کا منہ سوجا ہوا تھا۔ فرح نے مطمئن اور مسکراتے چہرے والی حرا کو دیکھا، جو اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ، اپنی بری کے جوڑے میں ملبوس، فرح سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی کیونکہ اس کے پاس دل کا سکون تھا۔ شوہر کی محبت بھری نگاہ اور مان تھا جبکہ اس کا شوہر تو ناراض سا، ایک کونے میں بیٹھ کر موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس شادی کی تیاری میں اس نے فیضان کو بہت تنگ کیا تھا۔ فیضان جو گاڑی کے لیے پیسے جوڑ رہا تھا، اس میں سے اکثر اب فرح کی کسی نہ کسی فرمائش پر ضرور خرچ ہوتے تھے۔

''تم بچوں کے پاس بیٹھو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔'' حرا نے خیالوں میں گم فرح کا کندھا ہلایا تو وہ چونکی۔ عالیہ اور حرا، بچے اس کے پاس چھوڑ کر کھانا لینے چلی گئیں۔ سعدیہ بیگم اور کشور اپنی ہم عمر خواتین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

''پیچھے ہٹو! ڈرٹی بوائے۔'' اچانک ایک تیرہ سالہ لڑکی نے جھنجھلا کر، نو سالہ حسن سے کہا جو بے خیالی میں اس کے راستے میں آگیا تھا۔ لڑکی کا تعلق کسی امیر فیملی سے تھا۔ اس کا حلیہ اور ہاتھ میں پکڑا مہنگا موبائل اس کا ثبوت تھے۔

''پتا نہیں کام والی کے بچوں کو کس نے یہاں بلا لیا ہے۔'' وہ لڑکی بدتمیزی سے کہتے ہوئے اس کا مذاق اڑانے لگی، جب غصے سے بھری فرح آگے بڑھی اور حسن کو پیچھے کیا۔

''تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی۔'' وہ غصے سے بولی جب اس لڑکی کی الٹرا ماڈرن ماں بھی وہاں پہنچ گئی۔

''ہاں تو حلیے سے تو یہ بچہ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میری بیٹی نے کیا غلط کہہ دیا۔ اتنی فکر تھی تو اپنے ساتھ بٹھاتیں، اپنے بیٹے کے کپڑوں پر بھی توجہ دینا تھی۔'' وہ عورت ناگواری سے کہتی بچی کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے گئی۔ فرح ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ حسن اس کا بھتیجا تھا مگر وہ بیٹا سمجھ کر طنز کر گئی۔

''میں نے مما کو منع بھی کیا تھا کہ ہم شادی میں نہیں جاتے۔ ہمارے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں، مگر وہ کہہ رہی تھیں کہ یہاں اچھا کھانا تو ملے گا نا! اس لیے ہم کل بھی کونے میں بیٹھے رہے۔''

حسن نے نم لہجے میں کہا۔ فرح کے دل پر ہاتھ پڑا۔ نو سال کا بچہ کتنی عجیب باتیں کر رہا تھا۔ بھلا یہ عمر ہوتی ہے غربت کا پہاڑہ یاد کرنے کی؟ یہ عمر تو ہنسی، شرارت، بے فکری کی پینگ (جھولے) کی طرح ہوتی ہے جو اوپر سے اوپر ہی جاتی ہے۔

''امی! آپ نے بتایا ہی نہیں بچوں کے یہ حالات ہیں۔'' موقع ملتے ہی اس نے ماں سے شکوہ کیا جس نے عجیب نگاہوں سے گھورا۔

''کیا تمہیں پہلے سے نہیں معلوم تھا؟ یا تمہاری ساس کی بات درست ہے کہ تمہیں آج کل اپنے علاوہ کچھ دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔''

وہ سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔ کشور نے دبے لفظوں میں کچھ باتیں بتائی تھیں، جنہیں سن کر وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ انھیں فرح سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔

''کیا اپنی خواہش پوری کرنا غلط ہے؟'' اس نے مدھم لہجے میں جیسے خود سے پوچھا تھا۔

''نہیں مگر اپنی خواہش کو اپنا آقا بنا لینا ضرور غلط ہے۔ یہ کیا کہ تمہاری خواہش نے حکم دیا اور تم سر جھکا کر اسے پورا کرنے چل پڑیں۔ میں نے تو تمہیں کفایت شعاری کا سبق پڑھایا تھا۔ یہ اسراف کی لت کہاں سے لگ گئی؟''

وہ دکھ سے کہتی واپس جانے کے لیے مڑ گئیں۔ فرح لب کاٹتی انھیں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کے سامنے، اس کی زندگی کے سب اہم اور قیمتی رشتے باری باری ہال سے باہر نکل رہے تھے۔

وہ افسوس سے دیکھتی رہی۔ اسے دکھ اس بات کا تھا کہ اس نے اپنی خواہش کا غلام بن کر سب کو ہی ناراض کر دیا تھا۔ نہ اس کا شوہر اس کے کسی عمل سے خوش تھا، نہ اس کی ماں، نہ اس کی ساس، حتیٰ کہ وہ خود بھی۔

اور اپنوں کے حقوق کا خیال نہ رکھنے پر تو اللہ بھی راضی نہیں رہتا.....

خواہش آقا نے اس سے سب کچھ چھین کر وقتی خوشی کا ایسا سراب دکھایا تھا، جس سے اسے اب ہر حال میں واپس لوٹ کر سب کو راضی کرنا تھا۔

☆☆

حمیرا اشفاق

کبھی کبھی

سارا دن سورج میاں نے خوب آگ کے گولے برسائے تھے۔ سہ پہر کے وقت نجانے کہاں سے کالے بادل گھر گھر آئے اور رم جھم شروع ہوگئی۔ ٹھنڈی ہوا کے مست جھونکوں نے فضا کو مزید فرحت بخش بنادیا۔

ایسی حسین رت میں نجانے کب کے بچھڑے دلوں نے ملن کا پروگرام بنا ڈالا۔ شہر سے قدرے ہٹ کر ایک باغ نما پارک کا انتخاب ہوا۔

سب سے پہلے ہیروئن صاحبہ ہی وہاں پہنچیں۔ ہلکے کاسنی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس، گھور کالی سیاہ زلفوں کا ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا بنائے، وہ سج سج کر قدم اٹھاتی ایک نسبتاً سونے سے کونے کی طرف چلی آئی۔

pklibrary.com

کیا حسین ویرانہ تھا۔ رنگ برنگے پھول بارش سے ڈھلے ہوا کے نم جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ سرسبز گھنے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے چہچہا رہے تھے۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ محبوب کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

اس نے پرس سے موبائل نکالا اور ادھر ادھر بکھرے خوب صورت نظاروں کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ کئی گھڑیاں مزید سرک گئیں۔ گاہے بگاہے وہ باغ کے اندر آنے والے راستے پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ جب کافی دیر بعد بھی محبوب کے آنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اس کی خفگی اب غصے میں بدلنے لگی۔

موبائل سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو فون کاٹ دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا اشتعال مزید بڑھتا۔ اچانک اس کی نظر ایک گوشے پر پڑی، جہاں ڈھیر سارے اس کی ساڑھی سے ہم رنگ کاسنی پھول کھلے تھے۔ وہ جھٹ ادھر چلی کہ چند ایک توڑ کر اپنے جوڑے میں سجالے۔

ابھی پھول توڑنے کے لیے ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر اس کی دونوں آنکھوں کو نرمی سے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے ڈھانپ دیا۔ ایک مخصوص پرفیوم کی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اور اور وہ اندر تک سرشار ہوگئی۔ محبوب آپہنچا تھا۔

"میں نہیں بولتی..... اتنی دیر لگا دی۔"

وہ اس کی کلائیوں کو پرے ہٹاتے ہوئے خفگی سے بولی۔

"جان من! باس نے اچانک میٹنگ رکھ دی تھی۔ مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔"

ہلکی براؤن شرٹ پر اس کی ساڑھی سے میچنگ کرتی کاسنی ٹائی لگائے نک سک سے تیار ہیرو اس کے کاندھوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے پیار سے بولا تو ایک پل میں ہیروئن صاحبہ کا غصہ اڑن چھو ہوگیا۔ دونوں پھولوں سے لدی ہوئی ایک باڑ کے قریب بیٹھ گئے۔

☆☆☆

یوں تو ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر فرصت سے حال دل سنانے کا موقع زندگی کے جھمیلوں میں کہاں ملتا تھا۔ یہ آئے دن کے بھاؤ بجلی پانی کے بلوں کی فکر نے محبت اور الفت کا سارا حسن چھین لیا تھا۔

اس لیے آج ان دونوں نے زندگی کے تمام مسائل سے چند گھنٹوں کے لیے جان چھڑا کر، فقط ایک دوجے کی سنگت میں وقت گزارنے کا حسین پروگرام بنالیا تھا۔ ایک دوسرے کی ذات میں گم وہ محبت کی راہوں میں ہم سفر تھے۔ جب ایک کڑک دار آواز سے لرز اٹھے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں.....؟" کون ہو تم دونوں.....؟"

"گرج دار آواز نے فضا کا سارا فسوں درہم برہم کر دیا۔ سامنے پولیس یونیفارم میں دو لمبے تڑنگے کانسٹیبل کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔

ان دونوں کی جان ہوا ہوگئی۔ ہیروئن صاحبہ نے سرک کر اپنے ہیرو کے پہلو میں دبک کر ایک طرح سے منظر سے غائب ہوجانا چاہا اور ہیرو اڑے اڑے حواسوں کے ساتھ منمنانے لگا۔

"وہ جی..... صاحب جی وہ دراصل....."

گھگھیاتے ہوئے الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

"کیا وہ..... شرم نہیں آتی۔ یوں ایک لڑکی کے ساتھ دن دیہاڑے رنگ رلیاں منا رہے ہو۔ اپنے گھر میں ماں بہن نہیں ہے تمہاری۔" ایک کانسٹیبل جس نے چھڑی تھام رکھی تھی۔ کڑے تیوروں سے ان کی جانب بڑھا۔

"سر جی! ان کو تھانے لے چلتے ہیں۔ یہ تو سیدھا سیدھا حدود کا کیس بنتا ہے۔" دوسرے کانسٹیبل نے چھڑی والے سے کہا۔ دونوں کا مزید خون خشک ہوگیا۔

اتنے میں ہیروئن صاحبہ کے پرس میں موجود موبائل نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس نے کانپتے

ہاتھوں سے پرس میں ہاتھ ڈال کر موبائل بند کرنا چاہا مگر گھاگ پولیس آفسر اس کا ارادہ جان کر مزید بھڑک اٹھا۔

''خبردار لڑکی! جو تم نے موبائل بند کیا۔ نکالو اسے باہر اور اسپیکر آن کر کے سنو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ تم اپنے گھر والوں سے کیا بہانا بناتی ہو۔ کیسے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہو۔ نکالو اور بٹن دباؤ۔''

اس نے گرج دار آواز میں آرڈر دیا۔ لڑکی کا رنگ پیلا پھٹک ہوگیا۔ مگر اب حکم مانے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس نے موبائل نکالا، جو مسلسل بجے جارہا تھا۔ پھر بادل ناخواستہ بٹن دبایا۔ ایک باریک سی آواز آئی۔

''آپا! خدا کے لیے گھر آجاؤ، تمہارا اور بھائی جان کا ہنی مون نجانے کب ختم ہوگا۔ ادھر تم دونوں کے بچوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چھوٹے نے تو اپنا پاؤں زخمی کرلیا ہے۔ جلدی آجاؤ، اماں کا پارہ بہت ہائی ہورہا ہے۔''

''ہیں...... یہ کیا......؟'' فون سے برآمد ہونے والے جملوں کو سن کر دونوں پولیس والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جبکہ ہیرو کے کچھ حواس بحال ہوئے اور وہ شرماتے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔

''وہ صاحب جی! دراصل ہم دونوں حقیقی میاں بیوی ہیں۔ جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ گھر میں پرائیویسی نہیں ملتی، کچھ وقت کی کمی کی وجہ ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملتا۔ آج موسم حسین تھا تو یوں پارک میں ملنے کا پروگرام بنالیا۔ اگر آپ کو شک ہے تو یہ نکاح نامہ دیکھ لیں۔''

ہیرو صاحب نے جھٹ جیب سے نکاح نامہ نکال کر پیش کردیا۔ اب تو مزید کارروائی کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ وہ دونوں پولیس والے معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔

☆☆☆

''ہیں...... کیا وہ سچ مچ میاں بیوی تھے۔'' رات کو ایک پولیس والا اپنی بیگم کو مزے سے یہ رام کہانی سنارہا تھا تو وہ اچنبھے سے بولی۔

''ہاں بالکل اصلی والے۔ میں نے نکاح نامہ اچھی طرح سے چیک کیا تھا۔ بے چاروں کو گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملتا۔''

''وہ تو ہمیں بھی نہیں ملتا۔ مجھے گھر کے دھندوں سے فرصت نہیں ملتی اور آپ کو اپنی نوکری سے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

''اجی سنیں! کیوں نہ ہم بھی ایسا ہی کوئی پروگرام بنائیں۔'' اب اس نے دوپٹے کا کونا مروڑتے ہوئے شرما کر فرمائش کی تو پولیس والا اچھل پڑا۔

''اری بیگم! بس رہنے دو۔ وہ تو دفتر میں کام کرتا تھا۔ چھٹی مل گئی۔ میری تو چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔ میں تمہیں کہاں سیریں کرواتا پھروں۔''

''مجھے نہیں پتا۔ میں کچھ نہیں جانتی میں بھی جاؤں گی آپ کے ساتھ ہنی مون منانے۔ ہم نے تو شادی کے بعد والا بھی نہیں منایا تھا۔ اس وقت بھی آپ کو چھٹی نہیں ملی تھی۔''

وہ تو کسی ضدی بچے کی طرح اینٹھ گئی۔

''اچھا سوچیں گے بیگم!'' اس نے مٹھاس بھرے لہجے میں ٹالنا چاہا مگر وہ ہرگز ٹلنے والی نہیں تھی۔

''سوچیں گے نہیں......! ابھی کے ابھی درخواست لکھیں۔ بس ہم کل چل رہے ہیں آؤٹنگ پر...... میں اماں کو فون لگاتی ہوں وہ بچوں کو دیکھ لیں گی۔''

وہ تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی جبکہ پولیس والا بے چارا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سچ کہا تھا ابا میاں نے کہ عورت کو باہر کی باتیں نہیں بتاتے۔ آخر خربوزے کو دیکھ کر ہی خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ ناچار اس نے جیب سے بال پوائنٹ نکالا اور ایمرجنسی چھٹی کی درخواست لکھنے لگا۔

☆☆

pklibrary.com

مکمل ناول

شازیہ جمال طارق

آپ کا شکریہ

بجیل ماموں کی ہونے والی سسرال نے ان کے سب بہن بھائیوں کو لنچ پر مدعو کیا تھا۔

گو کہ مدعو تو گھر کے سب ہی افراد کو کیا گیا تھا لیکن ہر گھر سے صرف دو، دو لوگ ہی جا رہے تھے۔ نئی نئی رشتے داری تھی ''پورا ٹبر اٹھ کر آ گیا'' لڑکی والوں پر اس قسم کا کوئی غلط امپریشن نہ پڑے، یہی سوچ کر صرف گنے چنے افراد ہی دعوت پر جا رہے تھے۔

ندرت نے ادیبہ کو تیار ہو کر اپنے ساتھ چلنے کا کہا تو وہ خوشی خوشی تیار ہو گئی۔

''اپنا ریڈ اینڈ بلیک کنٹراسٹ والا سوٹ پہن لو جو فریحہ آپا نے تمہارے لیے شارجہ سے بھجوایا ہے۔''

اپنے نئے نئے کٹر کیے بالوں کا آئینے میں جائزہ لیتے وہ ادیبہ سے بولی تھیں۔

''اچھا وہ؟ لیکن میں تو سوچ رہی تھی تائیس پر سی گرین کڑھائی والی کرتی پہن لیتی ہوں۔ اقصیٰ بتا رہی تھی، کچھ پینڈو سے لوگ ہیں۔ پہلی بار ان کے ہاں جا رہے ہیں ماڈرن امپریشن ڈالنا تو بنتا ہے؟''

کیوٹکس لگاتے ہوئے ادیبہ مسکرائی۔ دودھیا موی ہاتھوں پر سرخ نیل کلر بہت جچ رہا تھا۔

''نہیں، وہ رہنے دو۔ آپا والا سوٹ ہی ٹھیک ہے۔ وہ تم پر بجتا بھی بہت ہے۔ اس روز فائقہ بھابھی کی نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں تم پر سے......''

pklibrary.com

pklibrary.com

''ٹھیک ہے امی!'' اریبہ نے کندھے اچکائے۔ پھر اٹھ کر الماری سے اپنا سوٹ نکال کر استری کرنے لگی۔

''امی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

عروسہ نے اندر آتے ہوئے ان کی تیاریوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اریبہ جا تو رہی ہے میرے ساتھ۔ تم کیا کرو گی وہاں جا کر؟'' ندرت الماری کھول کر اپنا آج کی دعوت میں پہننے کے لیے سوٹ منتخب کرتے مصروف انداز میں بولیں۔

''جو باقی سب کریں گے، میں بھی وہی کروں گی۔''

اس کے انداز پر امی نے گردن گھما کر گھور کر اسے دیکھا۔

''ہر گھر سے صرف دو لوگ ہی جا رہے ہیں۔''

''تو پھر آپ مجھے ساتھ لے جائیں۔ اریبہ تو ویسے بھی ہر جگہ آپ کے ساتھ جاتی ہے۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''عروسہ! کتنی بار تمہیں کہا ہے، چھوٹی بہن سے مقابلے بازی مت کیا کرو۔''

اریبہ من ہی من جما جما کر اپنا سوٹ استری کرتی رہی، وہ جانتی تھی، امی اسے اپنے ساتھ ضرور لے جائیں گی۔

''پچھلے ہفتے اپنی ثروت پھپھو کے ہاں قرآن خوانی میں تم ہی گئی تھیں نا؟ اریبہ نے تو ساتھ جانے کی ضد نہیں کی۔''

ندرت نے اپنا خوب صورت سی گرین سوٹ نکال کر الماری کا پٹ بند کر دیا۔

''تو کیا لازمی ہے دادی لوگوں کی طرف ہر تقریب میں، میں ہی جاؤں؟''

وہ جرح کرنے والے انداز میں بولی۔ اور ایسا ہر بار ہوتا تھا۔ ددھیال والوں کی طرف سے ہر چھوٹے بڑے موقع پر امی ہمیشہ اسے ہی بھیجا کرتیں۔ جبکہ ننھیال والوں کی طرف ہر خاص و عام تقریب پر اریبہ کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔

''بحث مت کرو عروسہ! ہم کوئی آخری بار تو نہیں جا رہے۔ اگلی دفعہ جاؤں گی تو تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

اریبہ اپنا سوٹ استری کرنے کے بعد اب ماں کا استری کرنے لگی تھی۔

''آپ ہر بار میرے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں۔''

عروسہ روتے ہوئے باہر نکلنے کو تھی جب عقب سے امی کی جھنجھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اب نسوے بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو تم بھی ساتھ۔ جو حلوے مانڈے وہاں ہم کھائیں گے تم بھی کھا لینا۔''

ان کے جلے کٹے انداز کی پرواہ کیے بغیر وہ ایک دم خوش ہو کر واپس پلٹی۔

''سوٹ کون سا پہنوں؟''

''کوئی سا بھی پہن لو۔ تم پر سب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔''

اریبہ کے ہاتھ سے اپنا جوڑا لے کر وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر چلی گئی تھیں۔ عروسہ نے الماری کا پورا پٹ کھول دیا۔ وہ اپنے سارے کپڑے ہمیشہ استری کر کے ہینگ کر دیتی تھی تاکہ کہیں بھی جانے سے پہلے استری کرنے کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا پڑے۔ اس نے نیلا کڑھائی سوٹ نکال کر پہن لیا۔

ایک چور نظر تیار ہوتی اریبہ پر ڈالی۔ چھوٹے ستاروں کے کام سے مزین سرخ و سیاہ امتزاج کا شیفون کا سوٹ اس کی گوری رنگت پر اب دمک رہا تھا۔ قدرت نے اسے بہت فیاضی سے حسن کی دولت سے نوازا تھا۔ سلکی تراشیدہ بالوں کو کھلا چھوڑے وہ اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہی تھی۔

''ہر چیز میں مجھے کاپی کرنا لازمی نہیں ہے۔''

بلیک سینڈل کے اسٹریپ بند کر کے سیدھی ہوتی وہ کھڑی ہوئی اور ٹھک ٹھک کرتی باہر چلی گئی تھی۔

عروسہ اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی تھی۔ دونوں بہنوں میں دوستی و بے تکلفی نامی کوئی چیز نہیں تھی۔

عروسہ نے لمبے سیدھے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی

چوٹی بنائی۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر نیچرل کلر کی لپ اسٹک۔ اس سے زیادہ وہ تیار ہوتی بھی تو رہنا اس نے وہی تھا، معمولی شکل وصورت کی عام سی عروسہ اکبر۔

☆☆☆

''ایک تو اتنا چوڑا ماتھا ہے، اوپر سے سیدھی مانگ نکال لیتی ہے۔''

ندرت نے دیکھتے ہی پہلا اعتراض جڑ دیا۔ وہ پہلے ہی اپنی تیاری سے خاصی غیر مطمئن تھی فوراً پوچھا۔

''دوبارہ بنا کر آؤں بال؟''

''نہیں، بس اب رہنے دو، ویسے ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔''

سب نانی کے گھر جمع ہو رہے تھے۔ وہاں سے شرجیل ماموں اور راحیل ماموں کی بڑی گاڑیوں میں سوار ہو کر سب نے بجیل ماموں کے سسرال جانا تھا۔

نئے سمدھیوں کو متاثر کرنے کی غرض سے سب نے ہی اپنی اپنی تیاری میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ نانی نے بھی بریزے کا خوب صورت چکن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

پاؤں میں نئے سوفٹی چپل۔ وہ خود اور ان کی ساری اولاد میں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ اور شوق پورے خاندان میں مشہور تھا۔ فائقہ ممانی کے ساتھ افضی جا رہی تھی۔ سدرہ کو اس کے چھوٹے بچوں کی وجہ سے ساتھ جانے سے منع کر دیا۔ فضا ممانی کے ساتھ عنایا اور دانش تھے۔ بجیل ماموں نے وائٹ کلر کے برانڈڈ کرتا شلوار پر بلیک واسکٹ پہن رکھی تھی۔

تیاری بھرپور تھی لیکن ماتھے کی چمکتی چندیا نے گویا ساری تیاری پر پانی پھیر دیا تھا۔

''اوہو آج تو عروسہ بھی ساتھ جا رہی ہے۔''

فائقہ ممانی نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے گردن گھما کر عقب میں دیکھا۔

''ہاں ضد کر رہی تھی ساتھ چلنے کی تو میں نے کہا تم بھی چلو۔'' ندرت نے خوامخواہ وضاحت دی۔

''اچھا کیا، ذرا اسے بھی لوگوں سے ملنے جلنے کا ڈھنگ معلوم ہو۔ کہیں آتی جاتی نہیں۔ اعتماد کہاں سے آئے گا۔''

فضا ممانی نے تبصرہ کیا۔ ندرت نے شیشے سے لگ کر بیٹھی ناخن چباتی عروسہ کو گھورا تو اس نے جلدی سے ہاتھ نیچے کیا۔

بجیل ماموں کی سسرال میں سب کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ چھوٹے بڑے سب انہیں پروٹوکول دینے کے لیے جیسے سر کے بل تیار کھڑے تھے۔ بجیل ماموں کی گردن اکڑ گئی۔ عمر رواں کی چالیس بہاریں ایسے ہی تو نہیں گنوائی تھیں تب کہیں جا کر یہ گوہر مقصود ہاتھ لگا تھا۔

ان کی ہونے والی دلہن کا نام رانیہ تھا۔ سیکنڈری اسکول کی استانی، آنکھوں پر بڑا سا نظر کا چشمہ چڑھائے۔ اپنے معیار کے رشتے کے انتظار میں بالوں میں چاندی اترنے کا درد، انہوں نے بھی سہا تھا تب کہیں جا کر زندگی کی شاہراہ پر بجیل میاں ٹکرائے جنہیں مس رانیہ نے، ان کی چودھویں کے چاند کی سی چمکتی چندیا سمیت دل وجان سے قبول کیا تھا۔

''یہ آپ کی بیٹی ہے؟''

رانیہ کی والدہ نے ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ خوش گوار قہقہے لگاتی اریبہ کو دیکھ کر پوچھا تو ندرت مسکراتے ہوئے بولیں۔

''جی میری چھوٹی بیٹی ہے اریبہ! اسی سال یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے۔'' اریبہ کا تعارف ان کے لیے کسی فخر سے کم نہیں تھا۔

''ماشاء اللہ! بہت پیاری بچی ہے۔''

ندرت نے تنی ہوئی گردن کے ساتھ یہ تعریف وصول کی تھی۔

''بڑی بیٹی نہیں آئی آپ کے ساتھ؟''

''یہ میری بڑی بیٹی ہے عروسہ!''

رانیہ کی والدہ نے قدرے حیرت بھرے انداز میں تھوڑے فاصلے پر بیٹھی عروسہ کو دیکھا، جو کنفیوز سی آئس کریم کے پیالے میں مسلسل چمچہ گھما رہی تھی۔

''دراصل میری بڑی بیٹی اپنے ددھیال والوں پر گئی ہے۔'' ندرت نے شرمندہ شرمندہ سی وضاحت دی۔ عروسہ نظریں جھکائے پگھلتی آئس کریم کو گھورتی

رہی۔ اسے اس وقت خود پر شدید غصہ آ رہا تھا وہ یہاں آئی ہی کیوں؟

نانی نے سب کی مشاورت سے لگے ہاتھوں شادی کی تاریخ بھی طے کر ڈالی۔ اپنے ساتھ مٹھائی کے ٹوکرے تو وہ لے کے ہی آئی تھیں۔ اگلے مہینے کے پہلے جمعہ کو نکاح کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ مبارک، سلامت کا شور اٹھا۔

پرتکلف کھانے کے بعد چائے اور مٹھائی کا دور چلا۔ جمیل ماموں نوعمر لڑکوں کی طرح شرماتے، دھیمے دھیمے مسکراتے رہے۔

واپسی پر گاڑیوں میں سب کے باآواز بلند تبصرے گونج رہے تھے۔ ندرت گاہے بگاہے ایک گھورتی ہوئی نظر پچھلی سیٹ پر بیٹھی عروسہ پر بھی ڈال لیتیں۔ اس نے ناخن چبانا ترک کیے، دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا، لٹیں کانوں کے پیچھے اڑسیں۔ اس کے علاوہ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا اور کیا کرے آخر؟

☆☆☆

"اگر ضد کر کے ساتھ چلی ہی گئی تھیں تو وہاں گوتم بدھ بن کر بیٹھنے کی کیا تک بنتی تھی؟ کتنی ہی تمہاری عمر کی لڑکیاں تھیں، ان سے ہنس بول لیتیں تو کوئی اضافی چارجز نہیں لگ جانے تھے تم پر۔"

کپڑے اتار کر کیس میں رکھتے ہوئے ندرت نے اسے خوب سخت سست سنائیں۔ عروسہ روہانسی ہوگئی۔

"میں کیا بات کرتی ان سے؟ مجھے ان کی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔"

آن لائن شاپنگ، انسٹاگرام پیج، فلاں فلاں ایکٹر کے اتنے فالورز ...... آج کل کی لڑکیاں جن موضوعات پر گھنٹوں گوسپ کرتی ہیں ان موضوعات کے بارے میں اس کی معلومات ناکافی تھیں۔ جس چیز کے بارے میں وہ جانتی ہی نہیں تھی بیچ میں لقمے دے کر مزید شرمندگی کیوں مول لیتی؟ لیکن یہ بات وہ ماں کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

"ہاں تمہیں بس کھڑی دال اور کڑھی میں بگھار لگانے کے طریقے ہی پتا ہیں۔" امی کو نجانے اتنا غصہ کس بات پر آ رہا تھا۔

"بھئی، میں نے تو خوب انجوائے کیا۔" ہاتھ بلند کر کے ایک بھرپور انگڑائی لیتی اریبہ نے کہا اور جھک کر سینڈل کے اسٹریپ کھولنے لگی۔ اسی وقت ابا نے اندر جھانکا۔

"آ گئی ہو تو ایک کپ چائے ہی بنا دو۔"

"آج آپ دفتر سے جلدی واپس آ گئے؟" ندرت نے پوچھا۔

"ہاں۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس لیے جلدی اٹھ آیا۔ یہاں آیا تو پتا چلا تم سب جمیل کی سسرال گئے ہو۔ تب سے چائے کی پیالی کے انتظار میں بیٹھا سوکھ رہا ہوں۔" ابا شگفتہ سے انداز میں بولے۔

"سلمیٰ کو تو میں نے چھٹی دے دی تھی۔ لیکن جبران تو گھر پر تھا۔ آپ اسی سے کہہ کر چائے بنوا لیتے۔"

"سلمیٰ اور جبران کے ہاتھ سے بنی چائے سے کہاں یہ درد دور ہونے والا تھا۔ اسے صرف میری عروسہ کے ہاتھ سے بنی چائے ہی بھگا سکتی ہے۔"

عروسہ پھیکا سا مسکراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابا کی تعریف اس کے لیے اس وقت شلجم سے مٹی اترنے کے مترادف تھی۔ جہاں وہ خود پر اتنی تنقید سن چکی تھی وہاں ابا کی "اتنی سی" تعریف سے بھلا اسے کیا خوشی ہو پاتی۔

اس نے چائے بنا کر ابا کو دی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ دیر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے عکس کو یوں ہی گھورتی رہی۔ چوڑا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، گندمی رنگت، قدرے بھری بھری جسامت......

اپنے ایک ایک نقش کا ناقدانہ جائزہ لیتی گئی۔ "کچھ بھی تو خاص نہیں ہے مجھ میں۔" اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی شخصیت اتنی ہی معمولی اور عام لگی تھی۔

کھلتی ملائی سے گندھی، موم کے مجسمے میں ڈھلی بے حد خوب صورت اریبہ سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہ بہت ذہین تھی، پراعتماد۔ اسے گفتگو کا سلیقہ آتا تھا۔

pklibrary.com

''میں کبھی اریبہ جیسی نہیں بن سکتی۔'' اس کی زود رنجی بڑھی اور احساس کمتری پوری طرح عود کر باہر آ گیا تھا۔

☆☆☆

لابی میں پڑا فون کب سے گنگنا رہا تھا۔ ندرت نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔ ثروت پھپھو کی کال آ رہی تھی۔ انہوں نے وہیں سے عروسہ کو آواز لگائی۔ وہ دوپہر کے لیے آٹا گوندھ رہی تھی۔ سنے ہوئے ہاتھوں سے باہر نکلی۔

''تمہاری ثروت پھپھو کا فون ہے آ کر سن لو۔''

''میں آٹا گوندھ رہی ہوں۔''

''بعد میں گوندھ لینا۔ ان کو بھی وقت بے وقت کال کرنے کی عادت ہے۔''

امی بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ عروسہ نے جلدی سے ہاتھ دھو کر ریسور اٹھایا۔

''السلام علیکم! پھپھو کیسی ہیں آپ؟''

از راہ مروت اس نے پوچھا۔ ماں کی طرح کھلم کھلا بے زاری کا اظہار وہ نہیں کر سکتی تھی۔

حالانکہ ابا کے رشتے داروں سے دلی لگاؤ اسے بھی نہیں تھا بلکہ وہ دل ہی دل میں ان سے خوب چڑتی جب ندرت ہر بار کہتیں ''عروسہ اپنے ددھیال والوں پر گئی ہے۔ اسے ان پر غصہ آنے لگتا جیسے اس سب میں وہ اس کے برابر کے قصوروار ہوں۔ وہ شکل، عقل میں ان پر ہی کیوں گئی کیا تھا جو اریبہ کی طرح وہ اپنے ننھیال والوں پر چلی جاتی۔ ان کی طرح گوری چٹی، خوب صورت اور پراعتماد ہوتی۔

''کیسی ہو بیٹا؟ اریبہ، جبران کیسے ہیں؟ اور بھابھی جان؟''

''سب ٹھیک ہیں پھپھو! اریبہ یونی ورسٹی گئی ہے اور امی.....''

وہ دانستہ چپ ہو گئی۔ امی کو بھلا کہاں پسند تھا سسرال والوں کے ساتھ خوامخواہ باتیں بگھارنا۔ کبھی کبھار کال پر بس رسمی سی بات کر لیتیں وہ بھی تب جب ان کی طرف سے فون کال آ جاتی۔

''اتنے دن ہو گئے، کوئی خیر خیریت نہیں ہو سکی۔ میرا بھی آنا نہیں ہوا۔ جاوید صبح کا گیا رات گئے اسٹور سے واپس آتا ہے۔ ازکی، فائزہ کالج جاتی ہیں۔ مومن سے روز کہتی ہوں بائیک پر مجھے چھوڑ آؤ لیکن ہر بار ٹال جاتا ہے۔'' پھپھو خود ہی شروع ہو گئیں۔ وہ بے دلی سے ہوں، ہاں کرتی رہی۔

''تم نے بھی پھر چکر نہیں لگایا۔''

''جی، کاموں میں مصروف ہوتی ہوں۔''

''ہاں واقعی کام بھی تو بہت کرتی ہو تم۔ اور یہ گھر کے کام شیطان کی آنت برابر۔ شروع ہو جائیں تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔''

ان کا انداز سادہ ہی تھا لیکن عروسہ کو لگا وہ اس پر طنز کر گئی ہیں کہ اسے صرف گھر کے کام کرنے ہی آتے ہیں۔''

''اچھا پھپھو! ابھی مجھے کچھ کام ہے۔ بعد میں آپ سے بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔''

ان کی اگلی بات سنے بغیر روکھے لہجے میں بولتے اس نے ریسیور پٹخا۔ اور کچن میں بے دلی سے آٹا گوندھنے لگی۔

☆☆☆

جب سے سجیل ماموں کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ امی کا تقریباً روز ہی نانی کے گھر کا چکر لگتا۔ ممانیوں کے ساتھ مل کر بری خریدی جا رہی تھی۔ فریحہ خالہ تو شارجہ میں تھیں۔ انہوں نے شادی پر ہی آنا تھا۔ ایسے میں امی ہی چھوٹے، لاڈلے بھائی کی شادی کی تیاریوں میں پیش پیش تھیں۔

اریبہ بھی اکثر یونی ورسٹی سے چھٹی کر کے ان کے ساتھ چلی جاتی۔ ڈھولکی رکھی جاتی، ڈانس پریکٹس ہوتی۔ نانی کے گھر خوب ہلا گلا رہنے لگا تھا۔ نانی اپنے وقت کی بے حد خوب صورت عورت تھیں۔ ان کی ساری اولاد بھی ان ہی پر گئی تھی۔ دراز قامت، گوری رنگت، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں..... فریحہ خالہ اور امی ہو بہو ان کی کاپی تھیں۔ اریبہ نے سارے نقش ان ہی سے چرائے تھے۔ اس کی اٹھی ہوئی صراحی دار گردن پر نمایاں تل

دیکھنے والوں کو ندرت کی جوانی یاد دلا دیتا۔ عمر رواں نے ابھی بھی ندرت کا کچھ خاص نہیں بگاڑا تھا۔ انہوں نے خود کو بدلتے دور کے تقاضوں کے مطابق مین ٹین کر رکھا تھا۔

لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز عروسہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو اس نے میگزین اوندھا کر کے سینے پر رکھا اور ارد گرد سے بے خبر ہو گئی۔

نجانے کتنا وقت گزر گیا، وہ ایک ہی زاویے پر اسی طرح سوئی رہی۔

''عروسہ! اٹھو۔'' جبران کی آواز اسے کہیں دور سے آتی سنائی دی تھی۔

''افوہ! اب اٹھ بھی جاؤ۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں۔'' جھنجھلا کر اس کا بازو ہلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا مصیبت ہے؟'' آنکھیں مسلتے ہوئے سر پر ملک الموت کی طرح سوار بھائی کو گھورا۔

''جلدی سے روٹی بنا دو۔ میرا اکیڈمی جانے کا ٹائم ہونے والا ہے۔''

رسٹ واچ پر نگاہیں دوڑاتا وہ بے زاری سے بولا تھا۔

''میں کیوں بناؤں؟ اریبہ کہاں ہے، اس سے جا کر کہو۔ آج دن کا کھانا اس نے بنانا تھا نا؟'' صوفے سے پاؤں نیچے کارپٹ پر رکھتے ہوئے اس نے اپنے قدرے اوپر کو چڑھے ٹراؤزر کے بائیچے جھٹک کر نیچے کیے۔

''اریبہ اور امی تو نانی کے ہاں گئی ہیں۔ جاتے جاتے کہہ کر گئی تھیں عروسہ سے کہنا اپنے اور تمہارے لیے روٹی ڈال لے گی۔ سالن فریج میں رکھا ہے۔''

جبران نے من وعن ماں کا پیغام دہرایا۔ عروسہ یک لخت سیدھی ہو بیٹھی۔

''کیا؟ کب گئیں؟ مجھے بھی تو جانا تھا ان کے ساتھ؟''

''نانی کی کال آئی تھی بجیلی ماموں کی دلہن کا زیور بن کر آ گیا ہے شاید وہی دیکھنے گئی ہیں۔''

''ہاں تو مجھے بھی زیور دیکھنے جانا تھا۔ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئیں؟''

''یہ سوال جواب تم ان سے خود کر لینا جب وہ واپس آ جائیں۔ ابھی پلیز اٹھ کر جلدی سے روٹی بنا دو۔ میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہا ہوں۔''

''میں نہیں بنا رہی.....'' عروسہ کی فطری ہٹ دھرمی عود کر آئی۔ ''اس مہارانی کو نانی کے گھر جانے کی اتنی جلدی تھی تو اپنا کام کر کے ہی جاتی۔ ویسے ہی مرمر کے کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہے۔ اب کہا ہے تو پورا بھی تو کرتی نا؟''

''ٹھیک ہے مرو تم..... یہیں بیٹھ کر سوگ مناتی رہو۔ میں اکیڈمی سے ہی کچھ کھا لوں گا۔'' جبران بھنا کر کہتا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

عروسہ وہیں بیٹھی غصے سے ابلتی رہی۔ صبح ناشتے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا، اب شدت سے بھوک کا احساس جاگ اٹھا لیکن وہ ڈھیٹ بنی اس کمرے سے اس کمرے تک چکر کاٹتی رہی۔ احساس کمتری، خود اذیتی کو جنم دیتی ہے۔ عروسہ اسی سے دوچار تھی۔ اسے رہ رہ کر امی اور اریبہ پر غصہ آ رہا تھا۔

☆☆☆

عصر عقبی دیوار پر سر نیہوڑائے دم توڑنے کو تھی جب امی اور اریبہ کی واپسی ہوئی۔ عروسہ زور سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے لاؤنج میں آ گئی۔

''امی! آپ مجھے کیوں نہیں لے گئیں اپنے ساتھ نانی کے ہاں؟'' چھوٹتے ہی اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

''تم سو رہی تھیں۔ کیسے لے جاتی؟'' چادر اتار کر رکھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔ اریبہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ کر اپنا پرس کھولے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''سو کہاں رہی تھی، ایسے ہی لیٹے لیٹے بس ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ آپ مجھے اٹھا بھی تو سکتی تھیں؟''

''اچھا..... اچھا کون سا آخری بار گئی ہوں۔ کل پرسوں بری ٹانکنے جانا ہے تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی۔''

''بشرطیکہ تمہاری یونہی لیٹے لیٹے ذرا سی'' آنکھ نہ لگ گئی تو.....'' بیگ کی زپ بند کرتے اریبہ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''جبران اکیڈمی چلا گیا؟ روٹی بنا کر دی تھی اسے؟''

ندرت کے پوچھنے پر وہ خاموش رہی تو انہوں نے ملامتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''عروسہ!''

وہ چڑ گئی۔ ''آپ نے خود ہی تو کہا تھا اریبہ جس دن یونی ورسٹی نہیں جائے گی۔ دن کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ بنا دے گی۔ رات کا کھانا تو روز میں ہی بناتی ہوں۔ اسے اپنا کام کر کے جانا چاہیے تھا نا؟''

ندرت کا پارہ چڑھنے لگا۔ ''جبران بھوکا ہی اکیڈمی چلا گیا۔ کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہو تم عروسہ!''

''اصولاً تو آپ کو اسے ڈانٹنا چاہیے کہ یہ اپنا کام کر کے کیوں نہیں گئی۔ لیکن آپ بھلا اسے کیوں کچھ کہیں گی۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''بس جتنی مرضی بحث کروالو تم سے۔ چھوٹی بہن سے مقابلہ بازی کر کے نجانے کون سے گولڈ میڈل مل جاتے ہیں تمہیں۔''

ندرت حسب عادت اسے برا بھلا کہتی وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ عروسہ نے تنفر سے اریبہ کو دیکھا جو لاپروائی سے چیونگم کا ریپر اتار کر منہ میں ڈال رہی تھی۔

☆☆☆

موسم اچھا خاصا خوش گوار ہو رہا تھا اریبہ نے شام کی چائے باہر صحن میں ہی لگا دی۔ گول دائرے کی صورت کرسیاں بچھا کر درمیان میں چھوٹی میز رکھ دی تھی۔ ابا کے بیٹھک میں کوئی دوست آئے بیٹھے تھے ان کے لیے جبران کے ہاتھ چائے اندر بھجوائی۔

ایک یہی کام وہ پورے دل سے کرتی تھی۔

''سنو! تمہارے چہرے کے گھڑیال کی سوئی ہمیشہ بارہ کے ہندسے پر ہی کیوں اٹکی رہتی ہے؟'' چائے کی چسکیاں لیتے جبران نے شرارت سے عروسہ کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے سیل ختم ہو گئے ہیں۔''

اپنا چاہئے کا کپ اٹھاتی اریبہ فوراً بولی۔

''تو اور ڈلوالو۔'' دونوں کا ایک ساتھ مشترکہ قہقہہ ابھرا تھا۔ عروسہ نے روہانسی ہو کر ماں کو دیکھا۔

''امی! دیکھ رہی ہیں ان دونوں کو.....''

''کتنی بری بات ہے عروسہ! اب چھوٹے بہن بھائی تم سے مذاق بھی نہیں کر سکتے؟ اتنی تنک مزاج کیوں ہوتی جا رہی ہو؟''

''یہ مذاق کر نہیں رہے مذاق اڑا رہے ہیں۔''

اس نے باری باری ایک کینہ توز نظر ان دونوں پر ڈالی۔ جبران تو اپنی چائے ختم کرتا اٹھ کر چلا گیا جبکہ اریبہ کہہ رہی تھی۔

''ویسے امی! رانیہ ممانی کا زیور تھا بہت پیارا۔ کتنا نفیس سیٹ تھا۔ اس کا ڈیزائن خدیجہ خالہ نے پسند کیا تھا نا؟''

''ہاں آپا نے ہی ڈیزائن بھیجا کے موبائل پر واٹس ایپ کیا تھا۔ باقی سب کو تو بہت پسند آیا بس ایک فائقہ بھابھی ہی حسب عادت ناک چڑھا چڑھا کر نقص ڈھونڈتی رہیں۔''

''فائقہ ممانی کی تو عادت ہے۔ ان کا موڈ بھی آج کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی تھی۔''

اریبہ نے چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

''فائقہ بھابھی کی تو شروع سے عادت ہے۔ جہاں چار بندے اکٹھے ہوں وہاں یہ منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔''

عروسہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی لیکن نانی کے گھر کا حال جاننے کی خاطر دانستہ بیٹھی رہی ہر بار وہاں سے واپسی پر امی اور اریبہ یونہی بے لاگ تبصرے کیا کرتیں۔

''چھوٹی ممانی کے تو آج دانت ہی اندر نہیں جا رہے تھے۔ پتا نہیں انہیں ایسا کون سا قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔''

''بہت چالاک ہے یہ فضا بھابھی! بڑی کا

خراب موڈ دیکھ کر اخلاق جھاڑنے کو یونہی خوانخواہ اونچے اونچے قہقہے لگانا شروع ہو جاتی ہے۔ تاکہ فاقہ بھابھی کا دل مزید جل کر کوئلہ ہو۔"

ماں کے تجزیے پر اریبہ کو ہنسی آ گئی۔

"ویسے ان کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔ چکن پلاؤ تو بہت مزے کا بنایا ہوا تھا۔ کباب اور رائتے کے بغیر ہی اتنا لذیذ لگ رہا تھا۔ قورمہ بھی اچھا بنا تھا۔"

"ہاں بہت سارا بچ گیا تھا، مجھے لگا عروسہ اور جبران کے لیے ڈبوں میں نکال کر دیں گی۔ لیکن دل کی دونوں ہی تنگ ہیں۔"

سارا دن ضد اور غصے میں بھوکے پیٹ رہنے کے بعد چکن پلاؤ اور قورمے کا سن کر عروسہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دل میں ایک بار پھر شکوہ سر اٹھانے لگا، کیا تھا جو امی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتیں۔

"فریحہ خالہ کب آ رہی ہیں؟"

سر جھٹکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"شادی سے ہفتہ پہلے ہی آئیں گی۔ کہہ رہی تھیں رشتا تو کالج سے فری ہو گئی ہے۔ عمیر کی چھٹی کا مسئلہ ہے۔ اس کا کوئی سمسٹر چل رہا ہے۔"

عمیر کے ذکر پر اریبہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔

"تم کیا باتوں میں لگ کر بیٹھ گئی ہو۔ کھانا نہیں بنانا؟ تمہارے ابا دفتر سے آتے ہی ہوں گے۔" یاد آنے پر انہوں نے عروسہ کو ٹوکا تو وہ گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چائے کے برتن تم خود ہی دھوؤ گی۔"

کچن کی طرف جاتے جاتے وہ اریبہ کو یاد دلانا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

ناشتہ ہمیشہ ندرت خود ہی بناتی تھیں۔

اکبر صاحب دہی کے ساتھ سادہ روٹی لیتے۔ جبکہ اریبہ اور جبران پراٹھے کے ساتھ آملیٹ۔ عروسہ کو ہاف فرائی انڈہ پسند تھا۔ لیکن ندرت ہمیشہ ایک ہی باؤل میں تینوں انڈے پھینٹ کر تینوں کے لیے آملیٹ بنا لیتیں۔ عروسہ اعتراض کرتی تو فوراً جھاڑ دیتیں۔

"تمہاری ہر رگ الٹی ہے عروسہ! اب تمہارے لیے میں الگ سے فرائی انڈہ بناؤں؟"

وہ بد دلی سے آملیٹ کی پلیٹ اٹھا کر لقمے زہر مار کرنے لگتی۔ پہلا پراٹھا ہمیشہ اریبہ کے لیے ہی بنتا کہ اسے یونیورسٹی جانا ہوتا تھا۔ جبران کالج اور ابا دفتر چلے جاتے۔ برتن، کپڑے اور صفائی وغیرہ کے لیے ایک جز وقتی ملازمہ آتی تھی۔

اریبہ کا موڈ ہوتا تو موبائل سے کسی نئی ڈش کی ترکیب دیکھ کر ترائی کرنے کچن کا رخ کرتی۔ یہ اور بات تھی کہ اکثر اس کے ایسے تجربے ناکامی کی نذر ہو جاتے۔

عروسہ پڑھائی کے معاملے میں اوسط درجے کی طالبہ تھی۔ اریبہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں کو ایک ہی اسکول داخل کروایا گیا تھا۔

عروسہ ہر کلاس میں تھرڈ پوزیشن لیتی جبکہ غیر معمولی ذہانت کی حامل اریبہ کی ہر بار فرسٹ پوزیشن ہی ہوتی۔ ساری داد و تحسین اریبہ کے حصے میں آتی۔ عروسہ جتنی بھی محنت کرتی پوزیشن تھرڈ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا چھٹی کلاس میں اس کی سیکنڈ پوزیشن آ گئی۔ مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے لگا وہ ساری تعریف، ساری پذیرائی جو صرف اریبہ کے حصے میں آتی تھی، اس بار اسے ملے گی۔ لیکن اسی سال اریبہ کی پانچویں کے بورڈ میں پہلی پوزیشن نے اس کی ساری خوشی ملیامیٹ کر دی۔

"اریبہ کو دیکھا ہے، تم سے چھوٹی ہے لیکن کیسے محنت کر کے ہر کلاس میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑتی ہے۔ اس کی ٹیچرز بھی اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتیں....."

وہ جو اپنا رزلٹ کارڈ اٹھائے اس امید کے ساتھ امی کے سامنے کھڑی تھی، وہ اسے گلے لگا کر ڈھیر سارا پیار کریں گی۔ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

"میری بھی تو سیکنڈ پوزیشن ہے امی!"

"ہاں تو فرسٹ تو نہیں آئی نا؟"

اور پھر ایسا ہر سال ہونے لگا۔ گو کہ ابا اسے اریبہ کی طرح گلے لگا کر خوب پیار کرتے۔ انعام بھی دیتے۔ لیکن اریبہ کے لیے جس طرح نانی، ممانیاں لگاوٹ اور خوشی کا اظہار کرتیں اور تو اور فریحہ خالہ شارجہ سے بطور خاص اس کی ہر کامیابی پر بطور انعام کوئی نہ کوئی گفٹ ضرور بھیجتیں۔ عروسہ کے لیے کچھ بھجوانا وہ ہر بار ہی بھول جاتیں۔ یہ انہیں بعد میں یاد آتا تھا۔ جس کی معذرت وہ ہر بار کال پر کرلیتیں۔

شاید بچوں میں فرق روا رکھے جانے والی روایت ان کے خاندان میں بہت پرانی تھی۔

آہستہ آہستہ عروسہ کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایف اے کے بعد پڑھائی کو ہی خیرباد کہہ دیا۔ اس پر بھی ندرت نے اسے خوب لعنت ملامت کی۔ عروسہ کو گھرداری کا شوق تھا۔ کچن سنبھالتے ہی اس نے خانساماں کی چھٹی کردی۔

ابا اور جبران کو یہ تبدیلی بہت پسند آئی تھی۔ عروسہ کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ اس دن اس نے سادہ آلو بینگن بنائے جب اچانک دادی کے ساتھ ثروت پھپھو اور رمشہ چچی آگئیں۔ ندرت نے کہا جو پکا ہے بس وہی لاکر ٹیبل پر لگادو۔ سادہ سا کھانا تھا لیکن سب نے اس کے ہاتھ کے ذائقے کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔

''کھانا بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ اچھا خاصا کالج جاتا چھوڑ دیا۔ اب گھر بیٹھ کر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔'' ندرت ابھی بھی اس سے خوش نہیں تھیں۔

''ایسی لذت اور سلیقہ بھی اللہ کسی کسی کو ہی دیتا ہے۔ پڑھائی چھوڑ کر بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ گھرداری میں طاق ہوگئی ہے ہماری عروسہ!''

دادی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ہاں، آپ لوگوں کی طرح ہی محدود سوچ ہے اس کی۔ اسے بھی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔''

ندرت نے تو اپنے تئیں گہرا طنز کیا تھا۔ جبکہ دادی بے طرح خوش ہوگئیں کہ کم سے کم اکبر کی ایک اولاد تو ان پر گئی۔

☆☆☆

ناشتے کے بعد ماسی نے آکر برتن سمیٹنے شروع کردیے تھے۔ عروسہ چائے کا خالی کپ سنک میں رکھتی لاؤنج میں چلی آئی جہاں ندرت کال پر فریحہ خالہ سے بات کررہی تھیں۔

''یہاں سب کو آپ لوگوں کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اب تو شادی میں بھی ہفتہ بھر ہی رہ گیا ہے۔''

''ہاں فرقان سے کہا ہے بس اسی ہفتے کی ہماری ٹکٹ کروادیں چھوٹے لاڈلے بھائی کی شادی ہے۔ شادی سے زیادہ مزہ تو شادی سے پہلے کی تیاریوں میں آتا ہے۔''

''بالکل آپا! بہت رونق لگی ہوئی ہے ان دنوں اماں کے گھر.....''

فریحہ خالہ سے بات کرتے ہوئے امی کا لہجہ یونہی خوش گوار ہوجایا کرتا۔ عروسہ میوٹ کا بٹن دبا کر چینل سرفنگ کرنے لگی۔

''تم سناؤ لڑکیوں کی شاپنگ کرلی؟''

''کہاں آپا! اریبہ کو تو پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی۔ سوچ رہی ہوں، ایک دو دن میں انہیں مال لے جاؤں اپنی پسند سے شاپنگ کرلیں گی۔''

''اریبہ کی تم فکر مت کرو۔ میں نے اور رشنا نے اس کی اچھی خاصی شاپنگ کرلی ہے۔''

''آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں آپا! ویسے ہی آپ اس کے لیے ہر بار اتنا کچھ بھجوادیتی ہیں۔''

''ہاں تو کیوں نہ دوں؟ میری ہونے والی بہو ہے۔ لگنی بھی تو چاہیے نا؟''

فریحہ خالہ کا گھمنڈی لہجہ قریب بیٹھی عروسہ تک بھی پہنچا تھا۔ جبکہ ندرت قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

''بالکل آپا! یہ تو ہے۔''

فریحہ آپا نے بہت سال پہلے اپنے عمیر کے لیے اریبہ کو مانگ لیا تھا۔ ندرت کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ جھٹ سے اقرار کرلیا۔ دونوں بہنوں میں زبانی کلامی رشتہ طے ہوا تھا۔ دونوں کے شوہر حضرات کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اریبہ کی عمیر کے لیے پسندیدگی محبت میں ڈھل گئی تھی۔ خالہ لوگوں کی طرف سے ملنے والا پروٹوکول اسے مغرور کرنے کے لیے کافی تھا۔

ندرت اب آپا کو دونوں بھابیوں کا حال بتا رہی تھیں کیسے دونوں نے ان کی سیدھی سادی ماں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔

عروسہ بور ہو کر اٹھنے کو تھی جب دفتر جانے کے لیے تیار ابا نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ یقیناً انہیں کوئی ضروری بات کرنی تھی۔

"اچھا آپا! آپ لوگ خیر سے پہنچ جائیں پھر تسلی سے مل بیٹھ کر حال احوال کریں گے۔ اللہ حافظ۔"

ندرت نے الوداعی کلمات کے بعد کال کاٹ دی اور استفہامیہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

"کامران کی کال آئی تھی، کہہ رہا تھا اماں آج یہاں آئیں گی۔ ان کے لیے کھانے میں کچھ الگ سے بنا لینا۔"

اپنی بات مکمل کرتے وہ بعجلت باہر نکل گئے تھے۔ غالباً دفتر سے لیٹ ہو گئے تھے۔ ندرت جل بھن کر رہ گئیں۔

"ایک تو انہیں بھی ایک جگہ پر آرام نہیں آتا۔ اچھا بھلا کامران کے ہاں رہ رہی تھیں۔ اب یہاں آنے کی کیا تک بنتی ہے بھلا۔ پتا بھی ہے ان دنوں ہم شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اب وہاں جائیں گے تو پیچھے ان کا خیال کون رکھے گا؟"

ندرت کا غصے کے مارے برا حال ہونے لگا۔ دادی کی ہر بار آمد انہیں یونہی خفقان میں مبتلا کر دیتی۔

"شادی میں تو ابھی کچھ دن ہیں امی! دادی کون سا ہفتہ بھر رہنے کے لیے آتی ہیں۔ ایک دو دن میں ویسے بھی چلی جائیں گی۔"

عروسہ نے گویا ماں کے غصے کے بلند ہوتے گراف کو نیچے لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ نیک خیال انہیں خود سے تو نہیں آئے گا۔ میں اگر منہ سے کہوں گی تو بری کہلاؤں گی۔"

ساس سے ان کی ویسے بھی کم بنتی تھی۔ ان کی دقیانوسی سوچ، پرانے خیالات سے ندرت کو ہمیشہ اختلاف رہا تھا اور اس اختلاف رائے کا وہ کھلم کھلا اظہار کر دیتیں۔ یہی وجہ تھی کہ دادی زیادہ تر کامران چچا کے گھر ہی رہتیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار بڑے بیٹے، پوتے، پوتیوں کی محبت میں ہفتہ بھر کی تیاری کر کے رہنے کے لیے آتیں بھی تو بہو کے بگڑتے تیوروں سے خائف دوسرے روز ہی رخت سفر باندھ لیتیں۔

اکبر انہیں روکتے رہ جاتے۔ لیکن وہ بہت خود دار عورت تھیں۔ بہو کا مزاج اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ بیٹے کے گھر میں ان کی وجہ سے کوئی بدمزگی نہ ہو، یہی سوچ کر ہمیشہ محتاط رہتیں۔

"ہونہہ! اماں جی کو صرف کامران، اس کی بیوی بچوں سے پیار ہے۔ کیسے بھاگ بھاگ کر ان کی طرف جاتی ہیں۔ ہم تو جیسے ان کے کچھ لگتے ہی نہیں۔"

ہر بار دادی کے واپس جانے کے بعد دل ہی دل میں مطمئن ہوتی ندرت با آواز بلند یہ تبصرہ کرنا نہ بھولتیں۔

☆☆☆

دادی کو کامران چچا خود چھوڑنے آئے تھے۔ عین اسی وقت اریبہ کی وین کا ہارن سنائی دیا۔ وہ آگے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

عروسہ لان کے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ پائپ کیاری میں چھوڑ کر گیلے پائنچے جھٹک کر نیچے کرتی ان کی طرف چلی آئی۔

"امی! دادی آ گئیں....."

صحن میں دادی کو تخت پر بٹھا کر ان کی کمر کے پیچھے تکیہ رکھا اور بلند آواز سے ماں کو آواز دی۔ یقیناً انہیں ان کی آمد کی خبر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ دانستہ فوراً باہر نہیں نکلیں۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

رسمی علیک سلیک کے بعد اریبہ اپنا بیگ اور فولڈر اٹھائے کمرے سے چلی گئی۔

"چچا آپ بیٹھیے نا، میں چائے بنا کر لے آتی

ہوں۔"

عروسہ کو خوامخواہ شرمندگی ہونے لگی۔ کبھی کبھار ندرت بے مروتی کی حد کر دیتی تھیں۔

"ارے نہیں بیٹا! بس بھابھی جان کو سلام کرلوں پھر میں چلتا ہوں۔ یہاں سے ایک ضروری کام کے لیے جانا ہے۔"

اسی وقت ندرت کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئیں۔

"کھڑے کیوں ہو کامران! بیٹھو چائے وغیرہ پی کر جانا۔ رمشہ کیسی ہے؟"

دادی سے ملنے کے بعد انہیں چچا کا خیال آ گیا۔ وہ سادگی سے مسکرائے۔

"سب ٹھیک ہیں بھابھی جان! اماں بہت یاد کر رہی تھیں آپ سب کو، میں نے کہا تیاری کریں، میں چھوڑ آتا ہوں۔ ادا سی دور ہو جائے گی۔"

چچا نے مسکراتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

"دادی کا خیال رکھنا بیٹا!" پاس کھڑی عروسہ سے کہا اور چلے گئے۔ پیچھے ندرت کلس کر رہ گئیں۔

"ان کی یہی عادتیں مجھے غصہ دلاتی ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی کہنے کی بات ہے؟ جیسے ہم تو ان کا خیال رکھیں گے نہیں۔"

ندرت کو گنتی کے چند دنوں کے لیے ہی جلنے کڑھنے کے لیے اچھا خاصا مواد مل گیا تھا۔

☆☆☆

آج فریحہ خالہ نے آنا تھا۔

اریبہ کی تیاری دیکھنے لائق تھی۔ شہر کے مشہور بیوٹی پارلر سے ٹائم لے رکھا تھا۔ بالوں کی نئے اسٹائل میں کٹنگ کروائی۔ کلر بھی تبدیل کروالیا۔ کھلتے ہوئے پرپل رنگ کا جوڑا اس کے تن پر سج گیا تھا۔

"امی! میں بھی ساتھ چلوں گی۔" عروسہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ سب چلے جائیں گے تو پیچھے تمہاری دادی کا خیال کون رکھے گا؟"

اسے ماں کے منہ سے ایسا کچھ سننے کی امید تھی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ندرت نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ۔ عرصے بعد تو فروآ پا کا آنا ہوتا ہے۔"

عروسہ کی حیرت پر ماں کے اتنی جلدی مان جانے کی خوشی غالب آ گئی تھی۔ نانی کے گھر جا کر مزید حیرت کا جھٹکا لگا۔ سب یوں تیار ہو رہی تھیں جیسے آج ہی شادی کا کوئی فنکشن ہو۔

فائقہ اور مسز رحمانی نے بطور خاص نگاہیں ترچھی کر کے اریبہ کی تیاری کا جائزہ لیا تھا۔

عروسہ تو خیر کسی گنتی میں ہی نہیں تھی۔ وہ ضد کر کے آ تو جاتی لیکن یہاں کے سازشی ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔ ممانیوں کی معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ، نانی کی بڑبڑاہٹیں، ندرت کا ایک ایک پر کڑی نظر رکھنا۔

اقصیٰ اور عنایا کی ویسے تو آپس میں کم ہی بنتی لیکن جہاں اریبہ کو نیچا دکھانے کی بات آتی دونوں یک زبان دو قالب بن جاتیں۔

عروسہ نے اکتا کر اس سارے منظر پر نظر ڈالی۔ ڈیڑھ بجے کے قریب خالہ لوگوں کی آمد ہوئی تو گویا سارے گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ فرقان خالو کا شارجہ میں اچھا خاصا بزنس تھا۔ قیمتی لباس پہنے، خوشبوؤں میں بسی فریحہ خالہ نے دونوں کلائیوں میں طلائی کنگن اور چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے ایک ایک انداز سے خوب امارت جھلک رہی تھی۔

رشنا نے تنگ جینز پر کرتی پہن رکھی تھی۔ چھوٹے کٹے بھورے بال، مغرور نقوش والے چہرے پر اس وقت دنیا جہاں کی بے نیازی رقم تھی۔

"اوہ واؤ! ماما آپ نے کبھی بتایا نہیں پاکستان میں پریاں بھی ہوتی ہیں؟"

اریبہ کو دیکھتے ہوئے عمیر نے کچھ ایسے بے ساختہ انداز میں کہا کہ سب گردنیں موڑ کر اریبہ کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اریبہ کے چہرے پر مغرورانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کم بخت بلا کا ہینڈسم ہے۔"

اقصیٰ نے عنایہ کے کان میں سرگوشی کی تھی اریبہ

کی موجودگی میں ان کی دال کبھی گلنے والی نہیں تھی۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھیں لیکن ان کی یہ خوش فہم مائیں۔

کھانے کے بعد فریحہ خالہ سب کو ان کے تحائف کھول کھول کر دکھانے لگیں۔

''میرے والا بیگ مت کھولیں خالہ! اس کو ابھی سرپرائز رہنے دیں۔'' اریبہ کی بات پر انہوں نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''ارے دیکھنے تو دو سب کو، میں نے اور رشنا نے کتنی اچھی اور مہنگی شاپنگ کی ہے تمہارے لیے۔''

اس کے کپڑے، جوتے، بیگ، جیولری وغیرہ دیکھ کر سب کے چہروں پر رشک و حسد کے ملے جلے تاثرات ابھرتے ڈوبتے دیکھ کر خالہ نے گہری طمانیت بھری سانسیں اپنے اندر اتاری تھیں۔

''چلو بھئی اب خود ہی سمیٹو یہ سب کچھ۔'' مقصد پورا ہونے کے بعد وہ ہاتھ جھاڑتی قدرے مطمئن ہو کر صوفے کی بیک سے کمر ٹکا کر بیٹھ گئیں۔ اریبہ نے سارا سامان بیگ میں رکھا اور بیگ اٹھا کر نانی کے کمرے میں رکھ آئی۔ برآمدے میں عمیر راستہ روکے کھڑا تھا۔

''پریاں مغرور بھی ہوتی ہیں یہ پہلی بار دیکھا ہے۔''

اریبہ مسکراہٹ دباتے ہوئی بولی۔ ''دور دیس کے شہزادے خالی ہاتھ آتے ہیں یہ بھی پہلی بار ہی دیکھا ہے۔''

اس کے شکوے پر عمیر دل کھول کر ہنسا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ دیکھو تمہارے لیے۔''

اس نے جینز کی جیب سے چین نکال کر ہتھیلی پر رکھی۔

''خود پہنو گی یا میں پہناؤں؟''

''نہیں میں خود پہن لوں گی۔'' اس کی نگاہوں سے گھبرا کر اس کی کھلی ہتھیلی پر رکھی چین اٹھا کر مٹھی میں بند کرتی وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔

''مام نے صحیح کہا تھا اسے دیکھو گے تو ٹینا، مینا، شینا سب بھول جاؤ گے۔''

سر پر ہاتھ پھیرتے عمیر نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

ان کو واپسی پر بہت دیر ہو گئی تھی۔ دن کا کھانا خاصا لیٹ کھایا تھا اور اتنا کچھ کھالیا تھا کہ اب رات کا کھانا کھانے کی کسی کو طلب نہیں تھی۔ مغرب سے ذرا پہلے ندرت نے عروسہ اور اریبہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

گھر پر ابا غصے سے ٹہلتے یقیناً انہی کا انتظار کر رہے تھے۔

''بہت جلد نہیں آ گئے تم لوگ؟'' ایسا کڑا طنز۔

ندرت نے چادر اتارتے ہوئے ہاتھ روک کر شوہر کا غصے سے لال پیلا ہوتا چہرہ دیکھا۔

''کیا ہو گیا ہے کیوں اتنا غصہ کر رہے ہیں؟''

''حد ہوتی ہے ندرت بیگم! اماں کو پیچھے اکیلا چھوڑ کر جاتے ہوئے تم لوگوں کو ذرا احساس نہیں ہوا؟ یہ تو شکر ہے میں وقت پر پہنچ گیا ورنہ خدانخواستہ شوگر لو ہونے سے وہ بے ہوش بھی ہو سکتی تھیں۔''

''آپ کو بتایا تو تھا فریحہ آپا نے آنا تھا اور......''

''چاند سے نہیں آ رہی تھیں آپ کی فریحہ آپا۔ جو سب کا ان کے استقبال کے لیے موجود ہونا ضروری تھا۔'' اکبر صاحب کو بہت کم اتنا شدید غصہ آتا تھا۔

شور کی آواز سن کر دادی آہستگی سے چلتی باہر آ گئیں۔

''اکبر! کیوں غصہ کر رہے ہو بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دوائی لینی تھی اس لیے کچن میں کھانا گرم کرنے گئی تو بس......''

''اماں! یہ سب آپ کے کرنے کے کام نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔'' انہوں نے ایک شرمندہ کر دینے والی نظر بیوی اور بیٹیوں پر ڈالی۔

''اچھا چھوڑو بھی اب کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہو گئی۔ تمہارے سامنے ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ خوامخواہ میری بہو اور بچیوں کے آتے ہی عدالت لگا کر کھڑے ہو گئے۔ جاؤ بیٹا آپ لوگ آرام کرو......''

رسانیت سے بولتے ہوئے دادی نے بیٹے کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

عروسہ اور اریبہ تو خاموشی سے اپنے کمرے میں

چلی گئیں۔ بعد میں ندرت نے چیزیں پٹخ پٹخ کر اپنا غصہ خوب نکالا۔ دیر تک ان کی بڑبڑاہٹ جاری رہی تھی۔ گھر کا ماحول مکدر دیکھ کر دادی نے واپسی کی تیاری کرلی۔

جاوید کو فون ملایا۔ ''آ کر مجھے لے جاؤ۔''

''اماں! کوئی تکلیف ہوئی ہے آپ کو؟ کیوں اتنی جلدی واپس جارہی ہیں۔ کوئی خطا ہوگئی ہے ہم سے؟''

اکبر کے کہنے پر انہوں نے محبت سے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ ''تم تو میری سب سے فرماں بردار اولاد ہو۔ تم سے بھلا کیوں ناراض ہوں گی؟ بس بچوں کو دیکھ لیا سب سے مل لیا۔ پھر چکر لگاؤں گی۔ اللہ تمہیں اپنے بال بچوں کے ساتھ آباد رکھے.....''

دادی کے لبوں سے دیر تک دعائیں نکلتی رہی تھیں۔ وہ ظہر پڑھ رہی تھیں جب جاوید انہیں لینے آیا۔ دروازہ عروسہ نے ہی کھولا تھا۔

وہ سالوں بعد یہاں کا رخ کرتا۔ تھوڑی دیر ہی بیٹھتا اور ادھر ادھر گردن گھماتا نجانے کیا تلاش کرتا رہتا۔ اس بار وہ کافی عرصے بعد آیا تھا۔

''اندر آنے کو نہیں کہو گی؟'' عروسہ کو دروازے پر جما دیکھ کر پوچھا۔

''اگر میں نہیں کہوں گی تو کیا اندر نہیں آئیں گے؟'' عروسہ نے دروازہ چھوڑ دیا۔

''اخلاقیات کا تقاضا تو یہی ہے۔'' اندر قدم رکھتے ہوئے وہ بولا۔

عروسہ نے دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے چلی آئی۔ ''آپ بیٹھیں۔ دادی نماز پڑھ رہی ہیں۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''ویسے اخلاقیات کے تقاضے میں کچھ اور بھی آتا ہے؟''

اسے اندر کمرے میں جانے کے لیے پر تولتا دیکھ کر جاوید بولا۔ عروسہ بادل نخواستہ مڑی۔

''مثال کے طور پر کیا؟''

''مثال کے طور پر گھر آئے مہمان کو ایک کپ چائے پلاتا۔'' وہ برجستگی سے گویا ہوا۔

''میں بنا کر لاتی ہوں۔''

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا کبھی کبھار کا سامنا ہونے پر بھی وہ اس سے غیر ضروری تو کیا ضروری بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اور آج اس کا یوں بے تکلف ہونا عروسہ کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ چائے بنا کر اس نے سلمٰی کے ہاتھ باہر بھجوا دی۔

''السلام علیکم! ممانی جان!''

ندرت کو باہر آتا دیکھ کر وہ چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتا احتراماً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟ ثروت آپا کیسی ہیں؟''

''جی! سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

عروسہ نے یونہی کچن کی کھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہ ملنے پر مسکرا دیا۔ عروسہ نے کھٹاک سے کھڑکی بند کردی۔

اسے نجانے کیوں غصہ آرہا تھا۔ پہلی بار کوئی اس کی طرف متوجہ ہوا بھی تو کون وہ معمولی سا جاوید۔ ہونہہ! سلیب پر دونوں ہاتھ جمائے وہ اپنے اندر اٹھتے اشتعال پر قابو پانے کی سعی کرتی رہی۔ دادی جاتے جاتے بھی اس کا پوچھ رہی تھیں۔ لیکن وہ تب تک باہر نہیں نکلی جب تک وہ دادی کو لے کر چلا نہیں گیا۔

☆☆☆

''عروسہ! ذرا اس کا بلب تو بند کرنا۔''

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اریبہ نے بال سمیٹ کر ایک کندھے پر ڈالے اور چین گردن میں پہنتے ہوئے عروسہ کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''یہ چین کہاں سے آئی؟''

اس نے اٹھ کر بلب بند کردیا۔

''عمیر نے دی ہے۔'' اریبہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ عروسہ اندازہ نہیں کر پائی تھی چین واقعی اتنی خوب صورت تھی یا اس کی گردن میں آنے کے بعد خوب صورت لگنے لگی تھی۔

''عمیر نے؟'' عروسہ نے حیرت سے دہرایا۔

''سب دیکھ کر پوچھیں گے تو کیا جواب دو گی؟''

''یہی کہوں گی عمیر نے دی ہے اور کیا؟'' اریبہ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیا پتا خالہ مائنڈ کر جائیں؟ عمیر نے سب سے چھپ کر تمہارے لیے یہ لی ہو؟'' اس نے اپنی سوچوں کو زبان دی۔ اریبہ نے سر جھٹکا۔

''وہ لوگ اتنے کنزرویٹو نہیں ہیں۔''

عروسہ خاموشی سے اٹھ کر شاپنگ بیگز سے اپنے کپڑے وغیرہ نکالنے لگی۔ دونوں ابھی ابھی ندرت کے ساتھ شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔

''امی! میرے لیے اتنے ڈل کلرز کیوں لے رہی ہیں؟ شادیوں میں تو سب برائٹ کلرز ہی پہنتے ہیں۔''

عروسہ نے ماں کو سارے ہلکے رنگ کے کپڑے منتخب کرتے دیکھ کر احتجاج کیا تو وہ اسے گھور کر بولیں۔

''جیسا تمہارا کمپلیکشن ہے اس کے حساب سے یہی کلرز تم پر سوٹ کرتے ہیں۔''

''لیکن امی.....!'' عروسہ نے روہانسی ہو کر اریبہ کو دیکھا جو اپنے لیے بلیک میکسی اور اناری سرخ رنگ کی فراک الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

''اچھا بلیک کلر میں تو ایک سوٹ لے دیں۔ وہ بلیک نیٹ کی فراک.....''

اس نے ہاتھ سے سامنے کی طرف اشارہ کیا ندرت نے فوراً منع کر دیا۔

''بلیک میں سانولا رنگ مزید دب جاتا ہے۔''

''تو کیا سارے اچھے رنگ گورے لوگوں کے لیے ہیں؟ سانولے لوگ پھانسی پر نہ چڑھا دیے جائیں ایک ہی بار.....'' اس کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بس نکلنے کو تھے۔ ندرت نے کوفت سے پہلو بدلا۔ پھر دبی آواز میں گھرکتے ہوئے بولیں۔

''یہ کوئی جگہ ہے بحث کرنے کی؟''

سیلز مین ان کے اشارے پر وہ سارے کپڑے پیک کرنے لگا تھا۔

اور ایسا اس کے ساتھ ہر بار ہی ہوتا۔ گولڈن سینڈل میں پاؤں بھدے لگیں گے۔ میرون نیل کلر مت لینا ہاتھ مزید کالے دکھنے لگتے ہیں، گول ایئر رنگز تمہارے چہرے پر سوٹ نہیں کریں گے بس وہ جھمکیاں ٹھیک ہیں۔

عروسہ کو لگتا شاید وہ معمولی شکل و صورت کی لڑکیوں سے بھی زیادہ گئی گزری ہے۔

اسی احساس کمتری نے اس کی شخصیت میں بہت سارے جھول پیدا کر دیئے تھے۔ اپنی ذات کی مسلسل نفی نے اس کے اندر عجیب سا چڑچڑا پن، غصہ، ضد اور ہٹ دھرمی بھر دی تھی۔ وہ بہت برے موڈ کے ساتھ مال سے گھر واپس آئی تھی۔

آتے کے ساتھ ہی سارے شاپنگ بیگز ادھر ادھر لڑھکا دیے۔ ندرت کمرے میں آئیں تو غصے سے ان کا پارہ چڑھ گیا۔

''کس قدر ناشکری لڑکی ہو۔ اتنی مہنگی شاپنگ کروائی پھر بھی تم خوش نہیں ہو۔''

''خوشی مہنگی نہیں من پسند چیز ملنے سے ہوتی ہے۔''

اس نے بسورتے ہوئے کہا۔

''اچھا بس رہنے دو۔ اپنے ددھیال والوں کی طرح زیادہ فلسفہ جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آٹھ جماعتیں پاس ہیں اور فلسفہ یوں جھاڑتے ہیں جیسے علامہ ہوں کہیں کے۔''

عروسہ چڑ گئی۔ ''آپ ہر بات میں مجھے ان کے ساتھ کیوں کمپیئر کرتی ہیں؟ کیا وہ صرف میرے ہی ددھیال والے ہیں؟''

''تمہیں دیکھ کر تو یہی لگتا ہے۔'' وہ جلے کٹے انداز میں بولیں۔ عروسہ غصے سے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ اور اب اریبہ کی چیخیں..... عمیر کا اسے اتنا خوب صورت مہنگا تحفہ دینا عروسہ کو حسد میں مبتلا کر گیا تھا۔

''تمہاری نانی کی کال آئی تھی ابھی۔ ناراض ہو رہی تھیں، شادی میں صرف دو دن رہ گئے ہیں تم لوگ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟''

ندرت بولتے ہوئے اندر آئی تھیں۔ ''اپنے

اپنے بیگ تیار کرلو۔ شام کو تمہارے ابا آجائیں گے تو پھر چلتے ہیں۔"

☆☆☆

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا میں سہرا نہیں باندھوں گا۔"

جمیل ماموں اکتائے ہوئے کرسی پر بیٹھے تھے۔ فائقہ ممانی ان کے سر پر سہرا باندھنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ جو بار بار ان کے چکیل میدان پر سے پھسلتا ہوا نیچے آگرتا۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد جمیل ماموں بلآخر زچ ہو گئے۔

"اگر اس بے چارے کے منہ میں زبان ہوتی تو یہ خود ہی بول پڑتا مجھے بار بار اس "پھسلن" کی اذیت سے نجات دلا دو خدا کے لیے۔ میرے حال پر رحم کرو۔"

دانش کے شرارت سے کہنے پر ایک مشترکہ قہقہہ پڑا تھا۔

"ارے بھئی ہٹ جاؤ سب بس کلاہ باندھ لیتے ہیں۔ میرے دولہا بھیا کا سر سب سے اونچا۔" فریحہ خالہ نے گولڈن کلاہ ان کے سر پر سجا دیا۔ شادی کے سارے فنکشنز میں خوب ہلا گلا رہا۔ عمیر کی وارفتہ نگاہیں..... اریبہ تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھی۔

"عروسہ! جا کر اپنی پھپھو لوگوں سے پوچھو انہیں کچھ چاہیے تو نہیں؟ بعد میں گلہ کریں گی کہ ہمیں پوچھا تک نہیں۔"

ولیمے پر ندرت نے قدرے کونے والی میز پر بیٹھی پھوپھو اور چچی لوگوں کی طرف اشارہ کیا تو عروسہ گہری سانس بھرتی ان کی جانب بڑھ گئی۔ اسے لگتا شاید وہ ہی ان کی کچھ لگتی ہے۔ یا شاید سب کچھ۔

☆☆☆

شادی کے ہنگامے سرد ہوئے تو ایک ایک کر کے سارے مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔

خاندان میں دولہا دلہن کی دعوتوں کے ساتھ فریحہ خالہ بھی دعوتیں ہو رہی تھیں کہ عرصے بعد ان کا محض چند دنوں کے لیے پاکستان آنا ہوتا تھا۔

لیکن اس بار ان کا پروگرام ذرا مختلف تھا۔

"فرقان کا ارادہ ہے اپنا سارا بزنس آہستہ آہستہ وہاں سے وائنڈ اپ کر کے یہاں منتقل کرنے کا۔ ایک کنسٹرکشن کمپنی سے رابطہ کیا ہے یہاں پلاٹ پر اپنا گھر تعمیر کروانے کے لیے۔ ایک آدھ مہینے میں اس پر کام شروع کر دیں گے۔"

چائے پیتے ہوئے فریحہ خالہ بتا رہی تھیں۔ نانی کو یہ سن کر ازحد مسرت ہوئی۔

"بہت اچھا فیصلہ کیا ہے فرقان میاں نے۔ بس بہت رہ لیا پردیس۔"

"جی اماں! اسی لیے تو فرقان نے ہمیں ابھی یہاں رکنے کا کہا ہے۔ جب تک وہ اپنے بزنس کے معاملات کلوز اپ کرتے ہیں تب تک ہمارا مکان بھی مکمل ہو جائے گا۔ پھر ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔"

فریحہ خالہ مطمئن سی بول رہی تھیں۔

"اوہ اس کا مطلب ہے ہماری پیاری اریبہ کا دبئی جانے کا خواب ادھورا رہ جائے گا؟"

افسوسیہ مصنوعی افسوس سے سر ہلاتی تمسخرانہ لہجے میں بولی تھی۔

"خیر، دبئی تو میں ویسے بھی جا سکتی ہوں گھومنے پھرنے کے لیے....."

اریبہ نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ مقابل کو ٹکڑا توڑ جواب دینا اسے بخوبی آتا تھا۔ اس کے پر اعتماد انداز پر رشتانے ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔ اریبہ کی اونچی اڑان اسے بھی کچھ خاص پسند نہیں آ رہی تھی۔

اسی وقت ندرت نے انہیں اپنا سامان وغیرہ سمیٹنے کا کہا۔ شام کو ان کی اپنے گھر واپسی تھی۔

☆☆☆

اریبہ نے پھر سے یونی ورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔ عروسہ کی اپنی مصروفیات تھیں۔ سلمٰی کو ساتھ لگا کر اس نے گھر کا کونا کونا چمکا دیا۔ کچن کے سارے کیبنٹ صاف کیے۔ مسالا جات کے ڈبوں کی سیٹنگ

تبدیل کی۔ اس کی عادت تھی مہینے میں ایک بار گھر کی سیٹنگ تبدیل کر کے نیا پن لانے کی کوشش کرتی۔

گھر تو چمک گیا لیکن وہ دونوں دھول مٹی سے اٹی بھوتنیاں بنی کھڑی تھیں۔ واشنگ مشین کے لیے ڈھیر سارے کپڑے، پردے وغیرہ جمع ہو گئے تھے۔ سلمیٰ کو صبح جلدی آ کر واشنگ مشین لگانے کی تاکید کرلی وہ جلد از جلد شاور لے کر لمبی تان کر سونا چاہتی تھی۔ تھکاوٹ کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے جبران کی اس پر نظر پڑی تو پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

"قسم سے عروسہ! اس حلیے میں اتنی ڈراؤنی اور مضحکہ خیز لگ رہی ہو کہ دل چاہ رہا ہے تمہاری ویڈیو بنا کر یوٹیوب پر ڈال دوں۔ سب سے اوپر لکھا ہوگا۔ "بچے اور کمزور دل کے افراد مت دیکھیں۔"

کہنے کے ساتھ ہی ایک بار پھر ہنسی کا فوارہ منہ سے پھوٹ نکلا تھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے جبران! قسم سے پوری بھتنی لگ رہی ہو۔" اریبہ ابھی ابھی یونی ورسٹی سے واپس لوٹی تھی۔ آتے ہی فولڈر اور بیگ صوفے پر رکھ کر خود دوسرے صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

"میں بھتنی بنی نظر آ رہی ہوں۔ اور یہ صاف ستھرا چمکتا ہوا گھر نظر نہیں آ رہا؟"

کمر سے بندھا دوپٹہ کھولتے ہوئے اس نے باری باری دونوں کو جتایا۔ اریبہ کندھے اچکاتی جوتے کے اسٹریپ کھولنے لگی۔

"خیر، یہ سب تو سلمیٰ بھی کر سکتی ہے۔"

"ہونہہ! جیسا کرتی ہے، وہ بھی نظر آ جاتا ہے۔" عروسہ نے کڑھ کر کہا۔ مجال ہے جو گھر میں کبھی کسی نے اس کی کسی کوشش کو سراہا ہو۔

"جب بندہ گھر فارغ بیٹھا ہو تو کوئی نہ کوئی مصروفیت تو ہونی چاہیے نا؟"

عروسہ سے متعلق دونوں بہن بھائی کے خیالات ماں سے ملتے جلتے تھے۔

"اس صفائی کے چکر میں آج کھانا پکانا بھی رہ گیا۔" ندرت نے لاؤنج میں آتے ہوئے کہا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں۔ میرے اندر اس وقت کچن میں جا کر کھانا بنانے کی بالکل ہمت نہیں ہے۔ باہر سے ہی کچھ آرڈر کر لیں۔"

بے زاری سے بولتی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

دادی ان دنوں ثروت پھوپھو کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ ثروت پھوپھو نے ان سے جاوید اور عروسہ کے رشتے کی بات کی تو وہ خوشی سے پھول اٹھی تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ دونوں بہن بھائی آپس میں جڑ جائیں۔

اسی مقصد کے لیے شام کو فون کر کے اکبر کو بھی بلا لیا۔ کامران چچا بھی اس وقت وہیں موجود تھے چائے کی چسکیاں لیتے اکبر لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ محنتی، خوددار، شریف اور حد درجہ فرماں بردار بھانجا انہیں داماد کے روپ میں دل و جان سے قبول تھا۔

"میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے اماں! میری بیٹی اپنوں کے درمیان آسودگی سے رہے گی۔ جاوید اپنا ہی بچہ ہے۔ لیکن میں ندرت اور بچوں سے مشاورت کے بغیر کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا ابھی۔"

ان کی بات پر ثروت پھوپھو نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ ورنہ ان کی لمحہ بھر کی خاموشی نے انہیں ڈرا دیا تھا، مبادا وہ اسی وقت رشتہ تسلیم کرنے سے معذوری ظاہر نہ کر لیں۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو اکبر! میں خود بھی یہی چاہتی ہوں یہ رشتہ سب کی رضامندی سے ہو۔ بچوں کی خوشی اور رضامندی سب سے ضروری ہے۔ یوں سمجھ لو میری اس خواہش کے پیچھے جاوید کی خوشی ہے۔ اس لیے ڈائریکٹ ندرت بھابھی سے بات کرنے کے بجائے پہلے تم سے بات کرنا ضروری سمجھا۔"

"بالکل آپا! ان شاء اللہ سب بہتر ہوگا۔"

وہ ان کے ہاتھ میں امید کا سرا تھما کر رخصت ہو گئے تھے۔

ندرت کا اتنی جلدی اس رشتے پر راضی ہو جانا اکبر کو حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔

''مطلب تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں؟''

''بظاہر انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ ویسے بھی جو عروسہ کا مزاج ہے اس کے لیے یہی گھرانا مناسب ہے۔ کچھ بھی ہو آپ کی آپا اپنی بھتیجی کو تو کم از کم خوش رکھ ہی لیں گی۔''

ان کی آخری بات پر اکبر انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ کہا کچھ نہیں کہ ان کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔ ندرت بغیر کسی بحث کے اس رشتے پر مان گئی تھیں۔ اگر وہ ایک بار انکار کر دیتیں تو پھر ان کا سوبار انکار ہی ہوتا۔

''بہرحال تم عروسہ سے اس کی مرضی پوچھ لینا۔''

ہلکے پھلکے ہو کر انہوں نے عینک درست کرتے کتاب اٹھائی تھی۔ ندرت صبح کو عروسہ سے بات کرنے کا ارادہ کرتیں اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی تھیں۔

عروسہ نے سنا تو ہتھے سے اکھڑ گئی۔

ندرت نے اکبر صاحب کے دفتر چلے جانے کے بعد اس سے بات کی تھی۔ جب وہ عقبی صحن میں سلمیٰ کو واشنگ مشین لگانے کے بارے میں ہدایات دے کر لاؤنج میں آئی تو ندرت جیسے اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ان کی بات سنتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔''

اس نے فی الفور انکار کیا تھا۔ ''میں کبھی اس جاوید سے شادی نہیں کروں گی۔ آپ منع کر دیں ابا کو۔''

''آخر کیا برائی ہے جاوید میں؟''

ماں کی بات سن کر وہ الٹا حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''آج تک آپ کو ان لوگوں میں کوئی اچھائی نظر نہیں آئی اور آج مجھ سے پوچھ رہی ہیں کیا برائی ہے ان میں؟''

''وہ میرے اور ان کے نظریاتی اختلافات تھے۔ ویسے بھی میرا ان کے ساتھ سسرال، بہو والا معاملہ ہے۔ تم ان کا خون ہو۔ تمہیں ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھیں گے۔''

ماں کی دوہری پالیسی پر افسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ صاف اور بے لچک انداز میں بولی۔

''بہرحال میری طرف سے صاف انکار ہے۔ ہے کیا اس جاوید میں؟ معمولی تعلیم، نہ کوئی ڈھنگ کی جاب نہ شخصیت مجھے تو حیرت ہے آپ کو یہ سب نظر کیوں نہیں آ رہا؟''

''کیونکہ مجھے تم نظر آ رہی ہو۔ تم میں ایسا کیا ہے؟ نہ تو اریبہ کی طرح خوب صورت ہو نہ کوئی قابل ذکر ڈگری ہے تمہارے پاس۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے تمہارا رشتہ مانگ لیا ورنہ مجھے تو سوچ سوچ کر ڈپریشن ہونے لگتا تھا نجانے تمہارا کیا بنے گا؟''

''امی!'' عروسہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھے گئی۔ اتنے بے رحم الفاظ، ایسا دل کو چھیدتا لہجہ۔ اس کے اندر جوار بھاٹا پکنے لگا تھا۔

''تو پھر آپ بھی سن لیں میں یہ شادی مر کر بھی نہیں کروں گی۔''

سلگتے لہجے میں کہتی وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ ندرت نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

☆☆☆

''عروسہ اس رشتے پر راضی نہیں ہے؟''

اکبر صاحب سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔

''دماغ خراب ہے اس کا۔'' ندرت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

''کیا کہتی ہے؟ کس چیز پہ اعتراض ہے؟ اگر وہ راضی نہیں ہے تو میں آپا کو منع کر دیتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' ندرت فوراً بولی تھیں۔ ''وہ تو بے وقوف ہے آپ یہ بے وقوفی ہرگز مت کیجیے گا۔

میں اسے سمجھالوں گی۔"

"لیکن یہ مناسب نہیں ہے۔ وہ دل سے راضی ہوتی تو اور بات تھی۔"

اکبر صاحب کسی بھی معاملے میں زور زبردستی کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے گھریلو اور خاندانی معاملات سے خود کو دور ہی رکھا تھا۔ ہر ماہ معقول رقم ندرت کے ہاتھ پہ رکھ دیتے جس سے وہ گھر کا سارا نظام چلاتیں۔ بچوں کی تربیت میں بھی زیادہ ہاتھ ندرت کا تھا۔

"دیکھ لو اگر وہ دل سے راضی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ....."

"میں نے آپ سے کہا نا، میں اس کو سمجھالوں گی۔ آپ آپا کو انکار مت کریں۔" ندرت کے قطعی انداز پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

عروسہ کھانا پینا چھوڑے خود کو کمرے میں بند کر بیٹھی تھی۔ یہ اس کا خاموش احتجاج تھا۔ گھر کے ماحول میں تناؤ کی کیفیت در آئی تھی۔ ندرت نے تین دن برداشت کیا چوتھے دن دھاڑ سے دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ ستا چہرہ، روئی روئی آنکھیں، گندمی چہرے سے جیسے بچی کھچی شادابی بھی رخصت ہو گئی تھی۔

ندرت کو خوب تپ چڑھی۔ "آخر چاہتی کیا ہو تم؟"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے عروسہ! اور کچھ نہیں۔ تمہارے ابا ان لوگوں کو ہاں کر چکے ہیں اگر تمہارے اندر اتنی جرات ہے تو جا کر ان کے سامنے انکار کر دو۔"

عروسہ صدمے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ نے ہمیشہ میرے ساتھ یہی کیا ہے۔ اگر میری جگہ اریبہ ہوتی تو آپ کبھی اس کا جاوید سے رشتہ نہ ہونے دیتیں۔ آپ نے ہمیشہ اریبہ کے لیے ہی اچھا سوچا۔ صرف وہی آپ کی بیٹی ہے۔ میں کچھ نہیں لگتی آپ کی....."

وہ ہذیانی انداز میں چلائی تھی۔ گردن کی نسیں تک ابھر آئی تھیں۔

اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب ایک عید کے موقع پر کامران چچا کے ہاں دعوت پر سب جمع تھے تو انہوں نے مذاق مذاق میں اپنے تیمور کے لیے اریبہ کا ہاتھ یا مانگنے کی بات کی تو ندرت سب کے سامنے پھٹ پڑی تھیں۔ انہوں نے اس وقت کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔

"آخر ان کی ہمت کیسے ہوئی میری اریبہ کے بارے میں ایسا سوچنے کی؟"

انہوں نے اس بات کو جواز بنا کر گھر میں کئی دنوں تک ہنگامہ کیے رکھا تھا۔ کامران چچا کے گھر جانا تک چھوڑ دیا تھا۔

اب بھی تو وہی لوگ تھے اور عروسہ کے لیے انہوں نے کتنی جلدی ہامی بھر لی تھی۔ انہوں نے ایک بار بھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کیا عروسہ جاوید سے بہتر شخص ڈیزرو نہیں کرتی؟

"کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے میں آپ کی اولاد ہی نہیں ہوں۔ جیسے کچرے کے ڈھیر سے اٹھایا ہو مجھے....."

"چٹاخ.....!" ندرت کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس کے رخسار پر نشان ثبت کر گیا۔

"تم....." مارے غم و غصے کے ان کے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

"اپنی شادی کا تحفہ سمجھ کر ہمیشہ یاد رکھوں گی اس کو۔"

دہکتے رخسار پر ہاتھ رکھے وہ سلگتے لہجے میں بولتی باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔

اس روز ابا اس کے کمرے میں آئے تھے۔ وہ یونہی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی رہی۔ اس وقت وہ پوری دنیا سے خفا تھی۔

"جاوید بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ یہ میں اس

لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میرا بھانجا ہے۔ بلکہ میں نے اسے خود پرکھا ہے۔ اس کا باطن بہت اجلا ہے اور اپنی پھوپھو کو تو تم جانتی ہی ہو کس قدر محبت کرتی ہیں وہ تم لوگوں سے۔ تمہیں کوئی شکایت ہے تو بتاؤ بیٹا؟"

اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"ساری شکائتیں دم توڑ گئی ہیں ابا! اب میں جا رہی ہوں تو کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گی۔" ان کے اٹھ جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں گویا ہوئی۔

جس دن باقاعدہ ہاں ہوئی اسی شام ثروت پھوپھو معہ میٹھائی لے کر آ گئے۔

"ہاں ہو تو گئی اب کیا ضرورت تھی ان سب چونچلوں کی۔"

ندرت نے کوفت سے سوچا۔ پورا لاؤنج بھر گیا تھا۔ عروسہ اندر کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ اریبہ ہی چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے اٹھی۔ اپنے ساتھ زبردستی جبران کو بھی کھینچ کر کچن میں لے گئی۔

"کیا مصیبت ہے میں اس وقت بازار نہیں جاؤں گا۔ جو کچھ گھر پر ہے وہی لا کر رکھ دو۔" وہ جھنجھلایا۔

"ہاں تو ہیلپ کرواؤ نا میری۔ وہ میڈم خود تو کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی ہیں۔ اب ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ ابا ناراض ہو جائیں گے۔"

اریبہ چائے بنانے لگی۔ جبران نمکو بسکٹ، رول وغیرہ پلیٹوں میں نکالنے لگا۔

"ارے بیٹا! کیوں اتنی تکلیف کی؟ اپنے گھر ہی کی بات ہے۔"

پہلی پہلی بار اس قدر عزت افزائی پر پھوپھو کے لہجے میں کھنک سی اتر آئی تھی۔

دادی نے نہال ہو کر اپنی آل اولاد کو دیکھا۔ سسرالی سمجھ کر جس بہو نے کبھی منہ نہیں لگایا تھا آج سمدھیانہ بنتے ہی خوب خیر مقدم کیا تھا۔

"عروسہ کہاں ہے؟"

ثروت پھوپھو کے پوچھنے پر ندرت نے بے ساختہ پہلو بدلا۔

"اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ سو رہی ہے اندر کمرے میں۔"

"میں جا کر دیکھ آؤں ان کو؟" ازکی نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تو ندرت نے فوراً روک دیا۔

"ابھی ابھی میڈیسن لے کر سوئی ہے۔ ڈسٹرب ہو جائے گی۔"

"ہاں ہاں، بھابھی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اسے آرام کرنے دو۔ اب تو ویسے بھی آنا جانا لگا رہے گا۔" رمشہ چچی کے کہنے پر ندرت جز بز سا مسکرائیں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی۔

"یہ کیا ہم نے تو سوچا تھا خوب دھوم دھڑکے سے شادی کی تاریخ لینے آئیں گے۔"

سب کا منہ میٹھا کروانی پاکیزہ نے کہا۔ ازکی نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "بھابھی کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ لے آتے اس خاص موقع پر۔"

"اپنوں میں ان تکلفات کی بھلا کہاں گنجائش رہتی ہے۔ ویسے بھی سارا دھوم دھڑکا ہم شادی پر ہی کریں گے۔" رمشہ چچی خوش گوار لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

یہ سارا شور شرابا اندر کمرے میں اپنے بیڈ پر کروٹیں بدلتی عروسہ پر بہت گراں گزر رہا تھا۔ رات گئے وہ سب جانے کے لیے اٹھے تو ندرت نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

☆☆☆

عروسہ نے شادی کی کسی بھی تیاری میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لیے سب کچھ ندرت اور اریبہ خود ہی دیکھ رہی تھیں۔

عروسہ خاموش تھی ندرت کے لیے یہی غنیمت تھا۔ انہوں نے خود بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

"بس کسی طرح یہ شادی خیر سے ہو جائے۔"

آئے روز بازار کے چکر نے انہیں گھن چکر بنا کر رکھ دیا تھا۔ عروسہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگا رہی تھی۔ اس لیے ندرت نے سلمیٰ کے ساتھ اس کی بیٹی کو بھی کل وقتی ملازمت پر رکھ لیا تھا۔

گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ اظہار پھوپھا ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ جاوید کا اپنا جنرل اسٹور تھا۔ جبکہ مومن، ازکی، پاکیزہ ابھی پڑھ رہے تھے۔

ثروت پھوپھو نے زندگی بھر اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلائے تھے۔ لیکن پہلے بیٹے کی خوشی کے موقع پر انہوں نے سب کچھ اپنی استطاعت سے بڑھ کر کیا۔

بری دیکھ کر عروسہ کی ممانیوں کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔

"تو یہ عروسہ! تمہارے سسرال والے اتنے پینڈو لگتے تو نہیں۔ کس دنیا میں رہتے ہیں یہ لوگ؟ آج کل بھلا کون پہنتا ہے اس طرح کے کپڑے؟"

عنائیہ نے تو سب کے سامنے منہ پھاڑ کر کہہ دیا۔

"بری بات عنائیہ! شگن کی چیزوں کے بارے میں ایسا نہیں کہتے۔ اب جتنی ان لوگوں کی حیثیت تھی انہوں نے اس کے مطابق ہی سب کچھ کرنا تھا نا؟"

فضا ممانی نے بظاہر ڈپٹ کر بیٹی سے کہا لیکن انداز ان کا بھی صاف صاف مذاق اڑانے والا تھا۔

"جیولری بھی کچھ خاص نہیں ہے۔ اتنی اولڈ فیشن۔" اقصیٰ ناک چڑھاتے کہہ رہی تھی۔

"اپنی عروسہ کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔"

سر جھکائے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی عروسہ کو سب کے تبصرے بخوبی سنائی دے رہے تھے۔ سب کے ساتھ مذاق اڑانے والوں میں اس کی اپنی بہن بھی شامل تھی۔

"تو کیا امی یہ سب نہیں جانتی تھیں؟"

اس کے اندر تلخی سی بھرنے لگی تھی۔

"یہاں کے لوگوں کے پاس کتنا فالتو ٹائم ہے۔ خوامخواہ اتنے دن بے کار کی رسموں میں نکال دیے۔"

بارات والے دن مخصوص ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ جب آف وائٹ فل پنک میکسی پہنے رشنا ناپسندیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"بور ہو رہی ہو؟" اقصیٰ نے پوچھا۔

"تو اور کیا؟" وہ منہ بنا کر آگے بڑھ گئی۔

راجستھانی لہنگا سنبھالتی اریبہ کے کانوں تک اس کے جملے پہنچے تو ذرا کی ذرا عمیر کے سامنے ٹھہری۔

"کیا تمہارے خیالات بھی اپنی بہن سے ملتے جلتے ہیں؟"

اریبہ کو اس کے خوبرو چہرے پر کم و بیش رشنا جیسے تاثرات دکھائی دیے تھے۔

"تو اور کیا؟" سینے پر بازو لپیٹے وہ گویا ہوا۔

"حالانکہ باہر سے آنے والے تو ان رسموں کو بہت انجوائے کرتے ہیں۔ تم تو دو دنوں میں اکتا گئے۔"

"اپنی شادی پر کیا کرو گے؟" وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

"میں یہ مہندی، مایوں جیسی فضول رسموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ڈائریکٹ نکاح کر کے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ویسے بھی یہ انتظار جان کو آ گیا ہے۔" آخر میں وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

"دیکھ لیں گے۔" اریبہ مسکراہٹ دباتی آگے بڑھ گئی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ ہے عروسہ کا دولہا؟"

آف وائٹ شلوار قمیص پر آف وائٹ واسکٹ پہنے جاوید کو دیکھ کر رشنا نے حیرت سے کہا۔

"تو تم کیا عمران عباس کی امید کر رہی تھیں؟"

"چلو عمران عباس نہ سہی، عمران اشرف ہی سہی۔ لیکن یہ تو بالکل ہی......"

دبی دبی مضحکہ اڑاتی مسکراہٹیں۔

عروسہ کا دل چاہا کانوں پر ہاتھ رکھے وہاں سے اٹھ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ اپنے پہلو میں

pklibrary.com

بیٹھے شخص کے لیے اس کے دل میں بے زاری اور ناپسندیدگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

☆☆☆

رخصتی کے وقت بھی اس کی آنکھیں خشک ہی رہی تھیں۔ ندرت نے اسے گلے لگانا چاہا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے جیسے پتھرا سی گئی تھیں اور عروسہ رخصت بھی ہوگئی۔ سارا شور شرابا دم توڑ گیا تھا۔

گھر کے سامنے گاڑی رکتے ہی مومن نے لڑکوں کے ساتھ مل کر خوب پٹاخے اور انار چھوڑے۔ آسمان رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ ایک ایک رسم پر خوب ارمان نکالے گئے۔ ''دروازہ پکڑوائی'' کے وقت اظہار پھوپھا نے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے سر پر وار کر پیچھے کھڑی میراثن کو دے دیا۔

''یہ رسم سسر اور بہو کے نام ہوتی ہے۔ بہو جو دل چاہے اپنے سسر سے مانگ سکتی ہے۔''

عروسہ خاموش رہی۔ وہ بھلا ان سے کیا مانگتی؟

''بولو بیٹا! تمہارا حق ہے۔ ہمارے وقتوں میں تو شرم سے دوہری ہوتی دلہنیں منمنا کر گھر کی بھینس بچھڑا تک مانگ لیتی تھیں۔ اپنے سسر سے۔''

دادی جوش و خروش میں اس وقت اپنا گھٹنوں کا درد بھی بھول گئی تھیں۔

''آج سے پورا گھر ہی میری عروسہ کا ہے۔'' اس کی مسلسل خاموشی پر پھوپھو نے کہا۔

''ہٹو بھئی اب راستہ چھوڑ دو۔ کھڑے کھڑے بچی بے چاری تھک گئی ہوگی۔'' مجمع چھٹا تو ازکی، پاکیزہ نے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح تھام کر اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ دونوں کی خوشی دیدنی تھی۔ بس ہاتھوں میں اس کے جوتے اٹھانے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

کمرہ خالی ہوتے ہی عروسہ نے کھل کر سانس لی تھی۔ اس کے ذہن میں اس وقت سب کچھ بری طرح گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کراؤن سے ٹیک لگائے ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اٹھ کر چینج کرے کہ ہلکی سی چرر کے ساتھ دروازہ کھلا۔ اس کی یونہی بلا ارادہ نظر اٹھی۔ دروازہ بند کرتے جاوید کو دیکھ کر تنے اعصاب مزید تن سے گئے۔ اس پل سب کی طنزیہ مسکراہٹیں، دل جلاتے تبصرے، ایک ایک کر کے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔

''جانتی ہو عروسہ! تم میرے دل کی اولین خواہش ہو۔ میری آنکھوں کا پہلا خواب، میرے دل کی کھیتی میں اگنے والا محبت کا پہلا پھول۔ آج تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا۔''

اس کے سامنے بیٹھا وہ جذب سے بول رہا تھا۔

تو اب یہ میرا یوں مذاق اڑائے گا؟ جھوٹی سچی محبت کو بیچ میں لا کر، گھسے پٹے جذبات کو بدنام کر کے؟ اس کے اندر جوار بھاٹا پکنے لگا تھا۔

''تمہیں پانے کی خواہش ضرور کی تھی دل نے لیکن.....'' اس کا ہاتھ تھامے وہ کہہ رہا تھا۔

عروسہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے بھاری سانولے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑوایا۔

جاوید متحیر سا اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے کترانے کو جھک کر محمول کرتا مسکرایا۔

''تم کچھ نہیں کہو گی؟ میرے پاس تو پوری داستان امیر حمزہ ہے تمہیں سنانے کے لیے۔ جس کے لیے یہ ایک رات بہت کم ہے۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔''

بنا اس کی طرف دیکھے وہ لہنگا سمیٹتے ہوئے بیڈ سے نیچے اتری۔ اس کا روکھا لہجہ جاوید کو کھٹکا گیا۔

''واش روم اس طرف ہے۔'' اس نے ہاتھ سے دائیں جانب اشارہ کیا تو وہ دونوں چٹکیوں میں لہنگا سنبھالتی واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے کی معطر فضا میں اس کی چوڑیوں کی کھنک ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

عروسہ نے خود کو آئینے میں دیکھا اور چند

ثانیوں تک یونہی خالی خالی نگاہوں سے دیکھے گئی۔

افوہ یہ کیوں پہن لیا؟ بالکل سوٹ نہیں کر رہا، یہ مت لگاؤ، وہ مت لگاؤ کی مسلسل تکرار سے تنگ آ کر اس نے آہستہ آہستہ خود پر توجہ دینا، اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔

اسے قدم قدم پر یہی احساس دلایا گیا خواہ وہ تیار ہوتی یا سادہ رہتی، رہنا اس نے وہی تھا معمولی شکل وصورت، اوسط درجے کی ذہانت کی حامل عروسہ اکبر۔

آج پہلی بار وہ یوں پور پور سجی تھی۔ بہت سوں نے کہا اس پر دلہناپے کا نوٹ کے روپ آیا ہے وہ پہچانی نہیں جا رہی۔ اور اس نے تلخی سے سوچا "دل رکھنے کا اچھا انداز ہے یہ بھی۔"

اس نے پورا شاور کھول دیا تھا۔ جلتے بلتے اعصاب پرسکون ہونے لگے تھے۔ کافی دیر بعد واش روم سے باہر نکلی تو جاوید اسی انداز میں بیڈ پر بیٹھا تھا۔

اسے نظر انداز کرتی وہ اپنا تکیہ درست کرتی بیڈ کے کنارے لیٹ گئی اور منہ تک کمبل تان لیا۔ جاوید کے ارمانوں پر اوس سی گرنے لگی۔ اس نے اس رات کے لیے بہت کچھ سوچا تھا۔ لیکن سب کچھ اس کی توقعات، خواہشات کے الٹ ہو رہا تھا۔

"کیا یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟"

ایک تکلیف دہ خیال نے اس کے پورے وجود میں بے چینی سی بھر دی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو یونہی گردن موڑ کر دیکھا جاوید بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہلکا سا مسکرایا۔ "طبیعت کیسی ہے اب؟"

"ٹھیک ہوں۔" مختصر جواب دیتی وہ واش روم میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے جاوید نے بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اس کی طرف بڑھایا۔

"ویسے تو خالی پیٹ چائے پینا اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن مجھے لگا تمہیں اس وقت اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی۔"

بال سمیٹتے عروسہ کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے تھمے۔ قدرے توقف کے بعد مگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بیڈ کے کنارے بیٹھ کر آہستہ آہستہ پینے لگی۔ اسے اس وقت واقعی چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔

جاوید نے ایک مخملی ڈبیا کھول کر اس کے سامنے کی۔

"یہ کیا ہے؟"

"تمہاری منہ دکھائی۔ رات موقع ہی نہیں ملا۔" جاوید نے کیس کھول کر انگوٹھی باہر نکالی۔

"پہنا دوں؟" اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" چائے کا خالی مگ لیے وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

"رونمائی کے تحفے میں ضرورت کا بھلا کیا کام؟ یہ تو خلوص میں گندھی محبت کا پہلا اقرار ہوتا ہے۔" جاوید نے ہار نہیں مانی تھی۔

"میں ان خرافات میں نہیں پڑتی۔"

عروسہ کا لہجہ اب بھی تیکھا ہی تھا۔ خالی مگ اس نے تپائی پر پٹخا۔

"تم محبت کو خرافات سمجھتی ہو؟"

عروسہ چیخی "کیا محبت محبت لگا رکھی ہے میں نے کہا نا مجھے اس "محبت" سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اور نہ ہی آپ مجھ سے ان فضول کے چونچلوں کی توقع رکھیے گا۔ سنا آپ نے؟"

وہ جیسے خود پر ضبط کھو کر چلائی تھی۔ جاوید ششدر رہ گیا۔

پیٹھ موڑے لمبے لمبے سانس لیتی وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ جاوید نے انگوٹھی دوبارہ کیس میں رکھی اور اسے بند کر کے بیڈ پر رکھتا باہر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ازکی، پاکیزہ ایک ساتھ اس کے کمرے میں

داخل ہوئی تھیں۔

''بھابھی! آپ ناشتہ باہر سب کے ساتھ کریں گی یا یہاں لے آئیں؟'' پاکیزہ نے پوچھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''رات بھی آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب تو کچھ کھالیں۔ اماں کہتی ہیں زیادہ دیر تک خالی پیٹ رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔'' ازکی مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا نا مجھے ابھی بھوک نہیں ہے جب لگے گی تو کھالوں گی۔'' وہ چبا چبا کر اس انداز سے بولی کہ لمحہ بھر کے لیے دونوں بہنوں نے سٹپٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دوستی اور بے تکلفی تو پہلے بھی ان کے بیچ نہیں تھی لیکن روکھا لہجہ پہلی بار اتنی شدت سے محسوس ہوا تھا۔

تب ہی ازکی کی نگاہ انگوٹھی پر پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر کیس اٹھالیا۔

''ارے واہ یہ جاوید بھائی نے دی ہے آپ کو؟'' اس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی تھی۔

''کتنی پیاری ہے آپ نے پہنی کیوں نہیں؟''

''میں جیولری نہیں پہنتی۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو آپ شادی شدہ ہیں۔ آپ کو پہننی چاہیے۔''

اس نے شرارت سے کہتے انگوٹھی اس کی طرف بڑھائی۔

عروسہ نے زچ ہو کر کیس اس کے ہاتھ سے لے کر ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخ دیا۔ ''بعد میں پہن لوں گی۔''

اسی وقت ثروت پھوپھو اندر چلی آئیں۔

''شاباش ہے لڑکیو! میں نے تم سے کہا تھا بھابھی کو ناشتے کے لیے بلا لاؤ اور تم دونوں یہاں آ کر باتوں میں لگ گئیں۔''

انہوں نے باری باری دونوں کو گھورا۔ پھر عروسہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''چلو بیٹا! مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔''

عروسہ دل نہ چاہنے کے باوجود ان کے ساتھ چلی آئی۔ ناشتہ کھلے کچن میں ہی دسترخوان بچھا کر لگا دیا گیا تھا۔ وہ جاوید کے ساتھ چھوڑی ہوئی جگہ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''پراٹھے، کچوریاں، چھولے.....'' آج بہو کی وجہ سے ہماری بھی عید ہوگئی۔'' اظہار پھوپھا نے خوش گوار سا قہقہہ لگایا۔ وہ خاصے خوش خوراک واقع ہوئے تھے۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اماں اگر مجھے ذرا جلدی اٹھا دیتیں تو میں نکڑ سے بھابھی کے لیے ایسا لذیذ ناشتہ بنوا کر لاتا کہ وہ زندگی بھر اس پہلی صبح کے پہلے ناشتے کو یاد کرتیں۔''

مومن کے کہنے پر پاکیزہ منہ بنا کر بولی۔

''رہنے دو، جب تک تم واپس آتے تب تک دن کے کھانے کا ٹائم ہو جانا تھا۔''

''ہاں تو پیدل آنے جانے میں اتنا وقت تو لگتا ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب جاوید بھائی مجھے قسطوں پر اپنی ذاتی بائیک خرید کر دیں گے۔ کیوں جاوید بھائی؟''

اس نے لگے ہاتھوں بڑے بھائی سے تسلی کروانی چاہی تو اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''جیو بڑے بھائی! شاد رہو آباد رہو۔''

خوشی سے نعرہ مستانہ بلند کرتا وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

''عروسہ! بیٹا! تم کچھ لے کیوں نہیں رہیں؟ شرم مت کرو۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔''

پھوپھو کے کہنے پر جاوید نے اس کی خالی پلیٹ میں چھولے ڈالے، دہی کا پیالہ آگے کیا اور اپنا پراٹھا اٹھا کر اس کے سامنے رکھا۔ مومن شرارت سے کھانسنے لگا تھا۔

جبکہ اظہار پھوپھا زندہ دلی سے کہہ رہے تھے۔ ''سیانے کہتے ہیں کھانے پینے کے معاملے میں بالکل شرم نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ سارا نقصان بندے کا اپنا ہی ہوتا ہے۔''

کتنا مختلف ماحول تھا۔ سادہ اور بے تکلف..... پراٹھے کا نوالہ توڑتی عروسہ نے بے ساختہ سوچا۔

☆☆☆

گو کہ وہ پھوپھو کے گھر پہلی بار نہیں آئی تھی۔ ندرت اپنی ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے ان سے زیادہ میل جول رکھنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے سسرال والوں کے ساتھ ہمیشہ ایک فاصلہ رکھا۔ اریبہ کے پاس ہمہ وقت پڑھائی کا جواز موجود رہتا تھا۔

اکبر صاحب کی ناراضی سے خائف ہو کر ندرت ہر عید، تہوار کے موقع پر اسے زبردستی پھوپھو، چچا لوگوں کی طرف بھیج دیتیں۔

وہ سارا وقت ایک ہی جگہ پر تکلف سے ٹک کر گزار دیتی۔ جیسے ہی جبران اسے لینے کے لیے آتا وہ اسپرنگ کی مانند اچھل کر کھڑی ہو جاتی۔

ہمیشہ کے لیے اس گھر، یہاں کے لوگوں کے درمیان رہنے کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جاوید پر بھی اس نے ایک کے بعد دوسری نظر تک نہیں ڈالی تھی اور اب اس کو زندگی بھر کے لیے اس کے سر پر مسلط کر دیا گیا۔

اس دن وہ ناشتے کے بعد ہی گھر سے باہر چلا گیا تھا اور پھر پورا دن باہر ہی رہا۔ عروسہ رات کو کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن یہ تبدیلی قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ انگوٹھی کا کیس جوں کا توں ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا تھا، اس نے اٹھ کر کیس کھولا۔ چھلکا سی انگوٹھی..... جو اس کے نزدیک بے حد معمولی تھی۔ اسے اس پل بے ساختہ اریبہ کی چین یاد آئی تھی۔

وہ انگوٹھی بددلی سے دوبارہ ڈبیا میں رکھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ جاوید نے اندر قدم رکھا۔ آہستگی سے چلتا اس کے قریب آن رکا۔

''شاید تمہیں یہ پسند نہیں آئی۔ تمہارے معیار کی نہیں ہے نا؟ تمہیں جو چاہیے بتا دو میں لا دوں گا۔''

اس بار بنا پوچھے اس نے عروسہ کا ہاتھ تھام کر انگوٹھی اسے پہنا دی۔

''کیا دے سکتے ہیں آپ مجھے؟'' اپنا ہاتھ چھڑواتی وہ اس انداز میں بولی جیسے کہہ رہی ہو آپ کے پاس ہے ہی کیا مجھے دینے کے لیے؟

''میرے پاس بہت کچھ ہے عروسہ! میری محبت، میری وفا، میرا خلوص اور سب سے بڑھ کر عزت، تمہارا دامن تنگ پڑ جائے گا لیکن ان میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔''

عروسہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھری۔

'' ان کی بھلا اوقات ہی کیا ہے؟''

جاوید کو اس کی سوچ پر افسوس ہوا تھا۔ اپنی بے مول وفا، پھولوں پر گری اوس کی مانند پر خلوص محبت کی ناقدری پر افسوس ہوا تھا۔ وہ جذبات کی نہیں چیزوں کی قدر و قیمت جانتی تھی۔

جب وہ بولا تو اس کا لہجہ سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

''میں بہت سادہ مزاج بندہ ہوں عروسہ! لفظوں کا ہیر پھیر مجھے نہیں آتا۔ اس گھر میں تنگی ترشی بھی دیکھی۔ لیکن ہماری ماں نے ہمیشہ ہمیں عزت سے سر اٹھا کر جینا سکھایا۔ اس ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے یا سر جھکانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ابا کا سہارا بننے کے لیے اس گھر کی گاڑی کھینچنے اور چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے مجھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ اور مجھے اس کا بالکل بھی افسوس نہیں ہے۔ بلکہ یہ میرے لیے بہت خوشی اور اطمینان کا باعث ہے کہ میں اپنے پیاروں کے لیے کچھ کر سکوں۔ ابا کی پنشن، میرے جنرل اسٹور سے ہماری ساری ضروریات وقت پر پوری ہو جاتی ہیں۔ خواہشات کا کیا ہے وہ تو بادشاہوں کی بھی ادھوری رہ جاتی ہیں۔''

آخر میں وہ اپنے مخصوص سادہ انداز میں مسکرایا۔ عروسہ بنا کچھ کہے خاموشی سے اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی۔ جاوید نے گہری سانس اندر اتارتے لائٹ بند کی اور دوسری طرف آ کر لیٹ گیا کچھ دیر

یونہی چت لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''آج بھی تمہاری طبیعت خراب ہے؟''

عروسہ نے کمبل منہ تک کھینچنا چاہا لیکن گرفت مضبوط ہوگئی۔

''اُف یہ شخص کس مٹی سے بنا ہے آخر؟''

زبردستی کی قربت نے اس کے اندر ہیجان برپا کردیا تھا۔

☆☆☆

وہ ہلکی دھوپ میں کرسی ڈالے دونوں پاؤں سامنے پھیلائے آنکھیں موندے ہوئے تھی۔ نرم گرم دھوپ اس کے اعصاب کو سکون بخش رہی تھی۔

''بھابھی! میں نے پہلی بار لزانیہ بنایا ہے۔ چکھ کر بتائیں کیسا بنا ہے؟''

پاکیزہ نے بھاپ اڑاتا لزانیہ کا پیالہ اس کی جانب بڑھایا۔

''جی نہیں، بھابھی آج میرے ہاتھوں سے بنی میکرونی کھائیں گی۔'' ازکی بھی اسی وقت کچن سے نکل کر اسی طرف چلی آئی تھی۔ ہاتھ میں میکرونی کی پلیٹ تھامے۔

''پہلے لزانیہ!'' پاکیزہ نے چمچہ بجایا۔

''میکرونی!'' ازکی گنگنائی۔

''کیوں سر پر سوار ہوگئی ہو؟ میرا ابھی کچھ بھی کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ لے جاؤ اسے۔'' ہاتھ سے پلیٹ دور کرتی وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔ دونوں کے چہرے اُتر گئے۔

جاوید ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ صحن میں لگے واش بیسن پر ہاتھ دھوئے۔ بہنوں کے اترے چہروں پر نظر ڈالی اور دوسری بے اعتنائی لیے بیٹھی عروسہ پر، تولیے سے ہاتھ پونچھتا ان کی جانب چلا آیا۔

''ارے واہ بھئی بڑے مزے کی خوشبو آرہی ہے۔ ذرا دکھاؤ تو کیا بنایا ہے؟''

''بھائی! لزانیہ اور میکرونی!'' لہجے میں پہلے والی گرم جوشی مفقود تھی۔

''واہ زبردست! چلو آؤ مل کر کھاتے ہیں۔''

ایک اچٹتی نگاہ عروسہ پر ڈالی اور دونوں کو لے کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ عروسہ کا خوامخواہ خون کھولنے لگا۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو بٹیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

ثروت پھوپھو کی اب اس پر نظر پڑی تھی۔

''جی پھوپھو! ٹھیک ہوں۔ بس ایسے ہی دھوپ اچھی لگ رہی تھی تو یہاں آ کر بیٹھ گئی۔''

جاتے ہوئے بھی وہ پھوپھو کے ساتھ تلخ رویہ نہیں اپنا سکی تھی۔ ان کا انداز ہی اتنا نرم اور شفیق ہوتا۔

''اچھا چلو، آؤ کھانا کھاتے ہیں۔''

وہ گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

موبائل پر مسلسل ''امی کالنگ'' جگمگا رہا تھا۔ وہ نظر انداز کیے بیٹھی رہی۔ جاوید نے آگے بڑھ کر کال اوکے کرلی۔

''السلام علیکم ممانی جان! جی جی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں سب۔ جی عروسہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ شاور لینے گئی ہے۔ فری ہو کر آپ کو کال کرتی ہے۔ جی جی خدا حافظ!''

کال ڈسکنکٹ کر کے موبائل اس کے سامنے رکھا۔ وہ کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کسی دوسرے کی کال بغیر اجازت پک کرنا کس قدر غیر اخلاقی حرکت ہے آپ کو شاید پتا نہیں ہے۔''

اس کے تپے تپے انداز پر جاوید مسکرایا۔

''کسی دوسرے کی پریشانی دور کرنے کے لیے کبھی کبھار ایسی غیر اخلاقی حرکتیں کرنی پڑ جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پریشان ہو رہی تھیں تمہارے لیے، بات کرلینا ان سے۔''

''مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں

ہے۔"

وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

"لیکن مجھے تو ہمیشہ ضرورت رہے گی تمہاری بھی اور تمہاری عنایات کی بھی....."

اس کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھ کر وہ بھنا کر وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

شام کو پھوپھو نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔ "عروسہ کو کہیں باہر گھمانے لے جاؤ۔"

جاوید فوراً کورنش بجالایا۔ عروسہ نے لاکھ بہانے تراشے لیکن پھوپھو نے اسے جاوید کے ساتھ بھیج کر ہی دم لیا۔ "جب سے شادی ہوئی ہے تم لوگ کہیں بھی گھومنے کے لیے نہیں گئے۔"

"تو محترمہ! اس وقت میں آپ کے لیے پراڈو کہاں سے ارینج کروں؟ میرے پاس فی الحال یہی شاہی سواری ہے جو سراسر میری ذاتی ہے۔"

"آپ پھوپھو کو انکار نہیں کر سکتے تھے؟" اسے ایک بار پھر غصہ آنے لگا تھا۔

"منہ میں زبان تو آپ بھی رکھتی ہیں۔" وہ برجستگی سے گویا ہوا۔

"پھوپھو کا لحاظ کرتی ہوں، اس لیے خاموش ہو جاتی ہوں۔"

جاوید ہنسا "شکر ہے اس دنیا میں کوئی تو ایسا خوش نصیب ہے جس کا آپ لحاظ کرتی ہیں، مجھے اپنی ماں پر رشک آرہا ہے۔"

عروسہ کو اس کی شوخیاں زہر لگ رہی تھیں۔

"اچھا اب بیٹھنا ہے یا ساری رات یہیں کھڑے کھڑے گزار دینی ہے۔؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں، میں بائیک پر کبھی نہیں بیٹھی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

وہ پہلی بار سراسیمگی کا شکار ہوئی۔

"میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اپنا ایک ہاتھ آہستگی سے اس کے کندھے پر رکھا۔ جاوید خوش دلی سے مسکرایا۔

"اعتبار کرنا سیکھیے میڈم! سب کو ایک ہی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیجیے۔ مزاج میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔"

زن سے بائیک آگے بڑھائی تو عروسہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ متوحش سا ہوتے دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ لیا۔ جاوید کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ موسم ایک دم بہت سہانا ہو گیا تھا۔

"کون سا فلیور لو گی؟"

ایک درمیانے درجے کے آئس کریم پوائنٹ پر اس نے بائیک روک دی تھی۔ عروسہ کئی بار سب گزنز کے ساتھ شہر کے مشہور اور مہنگے ترین آئس کریم پارلر جا چکی تھی۔ لیکن یہ ایک معمولی سا اوپن پارلر تھا۔ باہر بنچ، کرسیاں لگا کر درمیان میں میزیں رکھی گئی تھیں۔

چاندنی رات کا فسوں چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ مدھم سرگوشیاں کرتی ہوائیں سرسرا کر گزر رہی تھی جیسے دور کہیں کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ عروسہ کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

یہاں کوئی اس کی ذات کو نشانہ بنا کر طنز کرنے والا نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا وہ ساری رات یہیں گزار دے۔ نامانوس خوشبو سے بوجھل ہوا کے جھونکے اس کی پشت پر بکھرے بالوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے گزر جاتے۔

چند لمحوں کے لیے تو وہ ساتھ بیٹھے جاوید کا وجود بھی فراموش کر گئی جو اس سے پوچھ رہا تھا "چلیں؟"

عروسہ نے چونک کر دیکھا وہ کب کی اپنی آئس کریم ختم کر چکی تھی۔ سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاوید نے بائیک اسٹارٹ کی تو وہ آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی۔ جھٹکا اسے تب لگا جب وہ بائیک اس کے گھر کے سامنے کھڑی کر چکا تھا۔

"یہاں کیوں آئے ہیں؟ مجھے یہاں نہیں آنا۔" وہ پھر سے اپنے خول میں سمٹنے لگی تھی۔

"اب تو آ گئے ہیں۔"

جاوید اس کا مزاج سمجھنے لگا تھا اور اس کا گریز بھی۔

وہ بددلی سے اس کے پیچھے اندر آ گئی۔ ان دونوں کو آتا دیکھ کر نذرت کو حیرت اور خوشی ایک ساتھ ہوئی۔ سلام دعا کے بعد جاوید، اکبر صاحب کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے نگاہیں اپنے ہاتھوں پر جما دیں۔ وہ ماں کی طرف دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ اس وقت صرف اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہاں آنا کیوں چھوڑ دیا؟ میں کال کرتی ہوں تو وہ بھی نہیں اٹھاتیں؟"

"میرا دل نہیں چاہتا۔" اس کے کھنچے کھنچے انداز پر نذرت کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزرا۔

"تمہاری نانی تم لوگوں کی دعوت کرنا چاہ رہی تھیں تم نے اس کے لیے بھی منع کر دیا۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے؟" عروسہ کے اندر دھواں بھرنے لگا۔

(آپ کے لیے ابھی بھی "لوگ" اہم ہیں۔ عروسہ کیا سوچتی ہے اس سے آپ کو کوئی غرض نہیں)

اریبہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"قسم سے عروسہ! جب سے تم گئی ہو میری تو جان عذاب میں آ گئی ہے نجانے تم نے کیسے سب کچھ مینج کر رکھا تھا۔ اب تو سلمیٰ اور ہاجرہ کے ہوتے ہوئے بھی ہماری ساری روٹین درہم برہم ہو گئی ہے۔" عروسہ پھیکا سا مسکرائی۔

"یہ میری نظر کا قصور ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ عروسہ بائیک پہ آئی ہے؟

آئی ڈونٹ بلیو دس۔"

جبران نے اندر آتے ہوئے ایسے شاک بھرے انداز میں کہا کہ ابا کے ساتھ بات کرتا جاوید بے ساختہ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"زندگی میں پہلی بار اس نے میرے ساتھ بائیک پر بیٹھنے کا تجربہ کیا تھا۔ دس منٹ کے سفر میں سارا وقت ایسے اچھلتی رہی تھی کہ کئی بار ہمارا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مجھے لگا میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلا رہا ہوں۔ آپ کا کمال ہے جاوید بھائی، جو اسے بائیک پر بٹھا کر یہاں تک لے آئے۔"

جاوید ہنس پڑا تھا۔ عروسہ خفیف سی ہو گئی۔

"چلیں عروسہ؟" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ "اگر تم رکنا چاہو تو....."

"نہیں میں چلوں گی۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جاوید زیر لب مسکرا دیا۔

☆☆☆

سبز بیلوں سے ڈھکے پھوپھو کے کشادہ صاف ستھرے گھر کے ایک ایک کونے سے سلیقہ جھلکتا وہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں۔ ازکی، پاکیزہ کالج سے واپس آنے کے بعد ان کا ہاتھ بٹا دیتیں۔

عروسہ کو کبھی کسی کام کے لیے نہیں کہا، وہ سارا دن اندر سے باہر، باہر سے اندر بولائی بولائی پھرتی۔ ایک دن تنگ آ کر خود ہی کچن میں آ گئی۔ پھوپھو دن کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

"لائیں پھوپھو! میں کر دیتی ہوں۔"

اس نے مٹروں کی ٹوکری اپنی جانب کھسکائی۔

"میں کر لوں گی بیٹا!"

"کھانا میں بنا لوں گی۔ وہاں امی کے گھر بھی کھانے میں ہی بناتی تھی بلکہ....."

کچھ کہتے کہتے وہ سر جھٹک کر خاموش ہو گئی۔

"چلو جیسے تمہاری خوشی۔" پھوپھو مطمئن سی باہر چلی گئیں۔ اس نے قیمہ مٹر کا سالن بنایا لگے ہاتھوں روٹیاں بھی پکا دیں۔

پھوپھا کھانا کھا کر اسٹور پر جا بیٹھتے تو جاوید تھوڑی دیر کے لیے گھر کھانا کھانے آ جاتا۔

پھوپھا کو کھانا نکال کر دیا۔ پھر کچن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جاوید کے کسی کام کو وہ اب بھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔

پھوپھا نے سب کو بطور خاص بتایا آج کھانا عروسہ نے بنایا ہے۔

"بالکل آپ کے ہاتھ جیسا ذائقہ ہے۔" جاوید نے اس روز بہت رغبت سے کھانا کھایا تھا۔

ہاتھ دھو کر وہ کمرے میں آیا تو عروسہ جان بوجھ کر بازو آنکھوں پر رکھے سوئی بن گئی۔ جاوید آہستگی سے دروازہ بند کرتا پلٹ گیا۔

اسی شام دادی آ گئیں۔ کامران چچا، رمشہ چچی، تیمور بھی ساتھ تھے۔

"ارے نانی! میری پیاری نانی آئی ہیں اور کسی نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

مومن نے اندر آتے ہوئے جذباتی انداز میں دونوں بانہیں کھول کر زور سے انہیں جپھی ڈالی۔ نانی نواسے کی محبت کے اس اظہار پر خوشی سے نہال ہو گئیں۔

"اگر تمہیں پتا ہوتا تو کیا کر لیتے؟"

ازکی نے بھاگ کر تکیہ ان کی کمر کے پیچھے رکھا۔

"ریڈ کارپٹ بچھا دیتا۔ پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتا اور کچھ نہیں تو اپنی پیاری نانی کے لیے۔ "ویلکم ہوم" کا ایک پیارا سا کارڈ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر دروازے پر چپکا دیتا۔"

"شروع ہو گئی اس کی نوٹنکی۔"

پھوپھو نے ہنستے ہوئے کہا۔

عروسہ کو یاد آیا دادی کے آنے پر ان کے گھر کیسا روکھا پھیکا استقبال کیا جاتا تھا۔ رشتوں کا مان، ان کا تقدس کیا ہوتا ہے یہ اس نے یہاں آ کر دیکھا۔ وہ خاموشی سے دادی کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو عروسہ؟ شادی کے بعد اب دیکھ رہی ہوں تمہیں۔ تم نے بھی پکا سوچ لیا ہے چچی دعوت کرے گی تب ہی اس کے گھر جاؤں گی۔ ہے نا؟"

عروسہ بوکھلا گئی۔ "نہیں تو..... میں تو بس....."

"ارے پاگل! مذاق کر رہی ہوں۔" چچی نے بے تکلفی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔

"تمہاری شادی کے بعد میں تو ایسی بیمار پڑی کہ بستر کی ہی ہو کر رہ گئی۔ اب طبیعت کچھ بہتر ہوئی ہے تو تمہارے چچا سے کہا اس بخار کے چکر میں عروسہ اور جاوید کی شادی کی دعوت تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ ابھی جا کر انوائٹ کر آتے ہیں۔ کل آپ سب کی ہمارے گھر دعوت ہے۔"

چچی اپنے ازلی ہنس مکھ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"کیوں تکلف کرتی ہو رمشہ! بس عروسہ اور جاوید کی کر لو۔ ہمارا تو ویسے بھی چکر لگتا رہتا ہے۔"

پھوپھو نے سہولت سے انکار کرنا چاہا۔ چچی برا مان گئیں۔

"اس میں تکلف کیسا آپا؟ یہ دعوت تو مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ ذرا جلدی آ جانا۔ مل جل کر پکائیں گے۔ مجھا کیلی سے کچھ نہیں ہوگا۔"

ازکی چائے کے ساتھ پکوڑے لے آئی تھی۔

"جیو بھابھی!" کامران نے سب سے پہلے چائے کا کپ اٹھایا۔

"بھابھی نہیں، بھانجیاں!" پاکیزہ نے تصحیح کی۔ "کیونکہ چائے ازکی نے اور پکوڑے مابدولت نے بنائے ہیں؟"

عروسہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ گندمی رنگت بالوں کی سادی سی چوٹی بنائے، عام سے کپڑوں میں ملبوس پاکیزہ کس قدر پراعتماد تھی۔ اس کا سارا حسن اس کی شخصیت کا اعتماد ہی تو تھا۔ اور یہ یقیناً اسے ملنے والی تربیت کی مرہون منت تھا۔

"مجھے کال کر کے ان کے آنے کا بتا دیتیں تو میں بازار سے کچھ لیتا آتا۔" عروسہ کے بائیں ہاتھ والی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتا جاوید ایسے بولا جیسے ان دونوں کے درمیان گہرے بے تکلفانہ مراسم ہوں۔

عروسہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"اتنی سادہ کیوں رہتی ہو بیٹا؟ تیار ہوا کرو۔ خیر سے بیاہتا ہو۔"

صبح سویرے دادی کے پاس بیٹھنا اسے مہنگا پڑ

کیا تھا۔ جاوید اسنور پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر دادی کے پاس باہر سخت پر آ بیٹھی۔

''اپنے میاں کے لیے سنگھار کرنے والی عورت سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔ میرا جاوید بہت سیدھا سادا ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتا پر اس کا بھی تو دل چاہتا ہوگا۔ اس کی بیوی اس کے لیے سجے سنورے.....''

کچن کی طرف جاتے ''سیدھے سادے'' جاوید کے لبوں پر مسکراہٹ اُمڈی تھی جسے اس نے مہارت سے دانتوں تلے دبالیا۔ عروسہ نے پہلو بدلا۔

''مجھے عادت نہیں ہے دادی!''

''تو بیٹا، شادی کے بعد بہت ساری عادتیں بدلنی پڑتی ہیں۔''

''آپ کی بات سولہ آنے درست ہے نانی! لیکن مجھے یہ کسی بھی سنگھار کے بغیر ایسے سادگی میں بھی اچھی لگتی ہے۔''

کچن سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ ان کے پاس لمحہ بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔ عروسہ کا خون کھول اٹھا۔ ''مجھ پر زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''باخدا میں بالکل بھی طنز نہیں کر رہا۔ بلکہ جو بھی کہا ہے بالکل سچ کہا ہے۔''

''اپنا سچ اپنے پاس ہی رکھیں۔''

تڑخ کر کہتی وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دادی ہکا بکا رہ گئیں۔ جاوید نے ان کے دونوں کندھے دبائے۔ ''حیران مت ہوں۔ زبان کی کڑوی ہے لیکن دل کی بہت میٹھی ہے۔''

مسکرا کر کہتا وہ باہر چلا گیا تھا۔

چچا کے گھر دعوت تو رات کو تھی لیکن پھوپھو نے سب کو سہ پہر کو ہی تیار ہونے کا کہا۔

عروسہ نے کچھ سوچ کر بربری کا آتشی گلابی کام دار سوٹ پہن لیا۔ دادی سے کیا بعید وہاں سب کے سامنے پھر سے شروع ہو جاتیں۔

بالوں کو ہلکا سا ٹچ کر کے کھلا چھوڑا۔ کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں، ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک کی تہہ جمائی۔ کانوں میں آویزے پہن رہی تھی جب جاوید اندر آیا۔ عروسہ اسے نظر انداز کیے صوفے پر بیٹھ کر جوتے کے اسٹریپ بند کرنے لگی۔

''لگتا ہے نانی کا لیکچر کام کر گیا۔''

کف موڑتا وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

''مجھ سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دوپٹہ کندھوں پر پھیلاتی وہ سیدھی ہوئی۔ جاوید اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوراً سر تسلیم خم کیا۔ ''اور کوئی حکم؟''

زہر لگی تھی عروسہ کو اس کی یہ مسکراہٹ۔ نجانے کس مٹی سے بنا تھا یہ شخص۔ کچھ اٹھا کر وہ باہر نکل گئی۔

پھوپھو نے اس کی خوب بلائیں لی تھیں۔

''آج تو بھابھی پہچانی نہیں جا رہیں۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے یہ کلر آپ پر.....''

اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا اس لیے دونوں بہنیں اس سے بات کرتے وقت محتاط سی ہو جاتیں۔ لیکن اس وقت اسے دیکھ کر ازکی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''میں بائیک پر نہیں بیٹھوں گی پھوپھو!''

جاوید کو بائیک کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ بولی۔

''بھابھی! آپ کو سواری پر اعتبار نہیں ہے یا ڈرائیور پر؟'' مومن شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

''دونوں پر۔'' وہ جان بوجھ کر زور سے بولی۔

مومن خوب ہنسا۔

''باہر رکشہ آیا ہوا ہے۔ آپ لوگ جا کر بیٹھیں۔ میں ابا اور نانی کو بائیک پر لے کر آ رہا ہوں۔'' جاوید نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

رکشے کا سین کرا سے زور سے چکر آیا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

چچی کے گھر کا ماحول بھی ان کی طرح سادہ اور

بے تکلف تھا۔ اسے نانی کے گھر کی دعوتیں یاد آئیں، کتنا سازشی، گھٹا گھٹا سا ماحول بن جاتا تھا۔ ایک دوسرے کے لیے دل میں نہ تو خلوص تھا نہ محبت۔ بلکہ دکھاوا تھا بس اور یہاں ثروت پھپھو، ان کی بیٹیوں نے آتے ہی چچی کے ساتھ از خود ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

خوش گوار باتوں کے دوران پلاؤ، چکن قورمہ، ٹرائفل، رائیتہ، سلاد سب بن گیا۔

"میں کچھ ہیلپ کرواؤں؟"

عروسہ کو یوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایک دو بار کچن میں جھانکا بھی تو چچی نے پیار سے ڈپٹ دیا۔

"تم تو چیف گیسٹ ہو آج کے دن کی۔ خبردار جو کسی کام کو ہاتھ بھی لگایا تو۔"

وہ مسکرا کر پلٹ گئی۔ سب کچھ بے حد لذیذ ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی ڈھنگ سے نہ کھا سکی۔ عجیب سی طبیعت ہو رہی تھی۔ جاوید نے اس کے چہرے کی پھیکی پڑتی رنگت دیکھی تو اٹھ کر اس کی طرف چلا آیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟" سب کے سامنے وہ محجوب سی ہو گئی۔

"ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟" وہ تشویش لیے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں بس ذرا دل گھبرا رہا تھا۔" اس نے سب کی تسلی کروائی اور کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھا لیا۔ ریکشے میں بیٹھنے کے خیال سے ہی اسے متلی ہونے لگی تھی۔

خالی گلاس ٹرے میں رکھتے جاوید نے بغور اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھا اور اٹھ کر باہر چلا گیا واپسی پر وہ ٹیکسی لے آیا تھا۔

☆☆☆

وہ ماں بننے والی تھی۔ پھوپھو نے سنا تو خوشی سی نہال ہو گئیں، اسی وقت فون کر کے ندرت کو مبارک باد دی۔ وہ مٹھائی اور ڈھیر سارے پھل جوسز وغیرہ لے کر آ گئی تھیں۔

"بہت مبارک ہو بیٹا! اللہ نے اتنی جلدی تمہیں اس خوشی سے نوازا ورنہ کچھ لوگوں کے تو سالوں گزر جاتے ہیں دعائیں مانگتے مانگتے....."

ندرت کا لہجہ ان کی اندرونی خوشی کا غماز تھا۔ عروسہ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تو وہ اس شخص کو دل سے قبول نہیں کر پا رہی تھی کجا کہ اس کی اولاد.....

اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سینے پر آ پڑا ہو۔

"بس اپنا بہت سارا خیال رکھنا اب۔ کھانے پینے میں کوئی لاپروائی نہیں برتنی۔"

ندرت کا یہ روایتی ماؤں والا روپ اسے محض دکھاوا لگ رہا تھا۔ انہیں بھلا کب سے میری فکر ہونے لگی۔

اس کے روکھے، کھنچے کھنچے رویے کو پھوپھو نے بھی محسوس کیا جسے اس کے مزاج سے زیادہ خرابی طبیعت پر محمول کیا۔

وہ تو ویسے بھی اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ جس دن سے یہ خوش خبری ملی تھی انہوں نے اسے اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ جاوید کے خیال رکھنے کا اپنا انداز تھا۔ اس کے لاکھ چڑنے، کڑھنے کے باوجود برابر اس کے آرام اور خوراک کا غیر محسوس طریقے سے خیال رکھے جاتا۔ ان ہی دنوں، پتا چلا فریحہ خالہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اس خوشی میں قریبی عزیزوں کو دعوت پر مدعو کیا تھا۔

فریحہ خالہ نے بطور خاص کال کر کے اسے معہ فیملی آنے کی تاکید کی تھی۔ اس کا جانے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن پھوپھو نے سہولت سے سمجھایا اریبہ کی ہونے والی سسرال کی حیثیت سے ان کے ساتھ اب دوہری رشتے داری ہے اسے لازمی جانا چاہیے۔

وہ بددلی سے جانے پر تیار ہو گئی۔

"بائیک پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جبران

سے کہتی ہوں تمہیں گاڑی پر لے جائے گا۔'' ندرت کال پہ کہہ رہی تھیں۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود آجاؤں گی۔'' اکھڑ پن سے کہتے اس نے کال کاٹ دی تھی۔ اور جان بوجھ کر جاوید کے ساتھ بائیک پہ بیٹھ کر ہی گئی۔

فریحہ خالہ کا گھر کیا تھا شان دار محل نما کوٹھی تھی۔ کھانے کا بہترین انتظام کیا گیا تھا۔

ہر کام کے لیے الگ سے ملازم۔ ایسی شان وشوکت والی زندگی۔ اریبہ کی گردن میں سریا سا آ گیا تھا۔

''تم کیوں مہمانوں کی طرح ایک ہی جگہ پر ٹک کر بیٹھ گئی ہو۔ بھئی سب کو اپنا نیا گھر دکھاؤ۔''

فریحہ خالہ کے کہنے پر وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سدرہ، اقصیٰ وغیرہ نے ناچاہتے ہوئے بھی اس گھر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تھا۔ جس کے کونے کونے کی تزئین وآرائش پر پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔

''عمیر نے ڈیسائیڈ کیا ہے ہم اوپر والا پورشن لیں گے۔''

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اریبہ اترا کر سب کو بتا رہی تھی۔

''ویسے عروسہ تمہاری پھوپھو کا میرا مطلب ہے تمہارا گھر تو بہت چھوٹا ہے نا؟ بالکل ڈربہ نما۔ ہم نے تو خیر نہیں دیکھا کسی سے کہتے ہوئے سنا ہے۔ تمہارا بے بی ہوگا تو پھر آئیں گے۔''

عنائیہ سنہری ریلنگ پر ہاتھ جماتی کہہ رہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی لوگ، وہی باتیں۔ دعوت کے اختتام تک عروسہ کی بس ہوگئی۔

''کتنے بجے تک لینے آجاؤں؟''

جاوید کی کال تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ عروسہ چڑ گئی۔

''مجھے آپ کے ساتھ اس پھٹ پھٹی پر بیٹھ کر اپنا مزید مذاق نہیں بنوانا۔ جران چھوڑ دے گا مجھے۔'' اس کی اگلی بات سنے بغیر غصے سے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

دعوت پر ہی فریحہ خالہ نے کہا تھا وہ بہت جلد عمیر کی اریبہ کے ساتھ شادی کرنے والی ہیں۔

''میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے۔ خوب دھوم دھام سے کروں گی۔ اس لیے سب ابھی سے اپنی تیاریاں شروع کردیں۔''

سب کو گپ شپ کے لیے نیا موضوع مل گیا تھا۔ ندرت چاہتی تھیں شادی عروسہ کی ڈلیوری کے بعد ہو۔

''اس حالت میں بھلا وہ کیسے بہن کی شادی انجوائے کرسکے گی؟''

''عروسہ اور انجوائے؟''

دبی دبی مسکراہٹیں ابھری تھیں۔ بہرحال شادی اس کی ڈلیوری کے بعد ہی رکھی گئی۔

جاتی گرمیوں کی ایک خوش گوار سی صبح کو اس نے صحت مند بچی کو جنم دیا۔ پھوپھو نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی۔ جاوید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

''اس کا نام کیا رکھیں؟'' اریبہ پوچھ رہی تھی۔

''طوبیٰ جاوید!'' جاوید نے فوراً کہا۔ اس کی شدت سے خواہش تھی اس کی پہلی اولاد بیٹی ہی ہو۔

''ماشاءاللہ! بہت پیارا نام ہے۔''

''اللہ نصیب اچھے کرے۔''

کمرہ بھانت بھانت کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔ عروسہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی رہی۔ پھوپھو نے ہی تھوڑی دیر بعد اس کے آرام کے خیال سے سب کو اٹھ کر باہر بیٹھنے کا کہا۔ آہستہ آہستہ کمرہ خالی ہوتا گیا۔ خاموشی ہوجانے پر اس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اپنے پہلو میں دیکھا آنکھیں کھول کر نئی دنیا کو دیکھتی وہ معصوم پری ماں کے اندر ممتا کے جذبات جگانے میں ناکام رہی تھی۔

گھر بھر کو طوبیٰ کی صورت میں جیسے ایک کھلونا مل گیا تھا۔ اسے نہلانے، دھلانے کا کام پہلے دن

سے ہی پھوپھو نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ وہ بہت خوشی اور چاؤ سے پوتی کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتیں۔ کالج سے واپس آنے کے بعد ازکی، پاکیزہ اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتیں۔ پھوپھو لوریاں سناتے، مومن اسے اٹھا کر پورے صحن میں چکر لگاتا۔

اس نے تمام تر نقوش ماں کے چرائے تھے۔ عروسہ اسے دیکھتی اور منہ پھیر لیتی۔ اس کی بے زاری کا وہی عالم تھا۔

اس روز جاوید کمرے میں آیا تو طوبیٰ رو رو کر ہلکان ہوئی جارہی تھی۔ اس نے فوراً اسے کاٹ سے اٹھا کر کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ عروسہ کچن میں اپنے لیے چائے بنارہی تھی۔ طوبیٰ کے رونے کی آواز اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھی لیکن نظر انداز کیے وہیں کچن میں بیٹھ کر اطمینان سے چائے ختم کی پھر کپ دھو کر رکھا اور کمرے میں آگئی۔

"کہاں گم تھیں یار؟ رو رو کر بچی کا حلق سوکھ گیا۔"

"بچے روتے ہی ہیں اس میں کون سی بڑی بات ہے۔" تیکھے لہجے میں بولتے طوبیٰ کو جاوید کے ہاتھ سے لیا وہ روتے روتے ہی سوگئی تھی۔

"اسے بھوک لگ رہی تھی شاید۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو پھوپھو نے اس کو فیڈر بنا کر دیا تھا۔" عروسہ نے اسے بیڈ پر لٹا کر کمبل اوڑھایا۔

جاوید اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اور ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا تھا۔ جاوید نے محسوس کیا عروسہ جان بوجھ کر بیٹی کو نظر انداز کرتی ہے۔ وہ کئی بار دبے لفظوں میں اسے ٹوک چکا تھا لیکن عروسہ اپنی روش بدلنے پر تیار ہی نہیں تھی۔ اس نے اسے جنم دے دیا تھا اس کے نزدیک یہی اس کا بہت بڑا احسان تھا۔ اور جاوید سوچتا نجانے کیسی برف جمی ہے اس کے جذبات پر جو پگھلنے میں ہی نہیں آرہی۔ اریبہ اور عمیر کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی تھی۔

دونوں طرف سے تیاریاں عروج پر تھیں۔

ندرت کے بار بار بلانے پر عروسہ وہاں جاتی اور جلتے کڑھتے واپس آجاتی۔ اریبہ کی قسمت اسے نئے سرے سے رشک وحسد میں مبتلا کردیتی۔ فریحہ خالہ نے اس کی بری کے کپڑوں وغیرہ پر پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ خاندان والے ایسی شان داربری دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ بارات کا لہنگا، اریبہ نے عمیر کے ساتھ جا کر خود پسند کیا تھا۔

یہ بات کال پر ندرت نے اسے بتائی تھی۔ اس نے بددلی سے فون رکھ دیا۔ کچھ دیر تک یونہی لابی میں کرسی پر بیٹھی رہی۔ جاوید کی نظر پڑی تو اسی طرف چلا آیا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ خیریت؟"

"کیوں یہاں بیٹھنا منع ہے؟" کھڑے ہوتے ہوئے تنک کر پوچھا۔

"یار! تم تھکتی نہیں ہو کونین کی گولیاں چبا چبا کر؟"

"آپ کو کس پاگل نے مشورہ دیا ہے مجھ سے بات کرنے کے لیے؟"

"میرے دل نے، سدا کا پاگل ہے۔"

اُف اس شخص کی مسکراہٹ، وہ تنتنا کر آگے بڑھنے کو تھی کہ جاوید نے روک لیا۔

"اچھا سنو تو سہی، اریبہ کی شادی کی شاپنگ میں کروانے لے جاؤں یا خود کروگی؟ کتنے پیسے دوں؟"

"آپ کتنے دے سکتے ہیں؟"

"جتنے تم کہو۔" جاوید نے والٹ نکالا۔

"پچاس ہزار۔" وہ آرام سے بولی۔ جاوید نے والٹ سے سارے پیسے نکالے۔ ہزار۔ پانچ سو کے چند نوٹ۔ عروسہ کے لبوں پر تمسخرانہ تبسم اتر آیا۔

"بڑے بڑے دعوے کرنے سے پہلے اپنی "حیثیت" دیکھ لینی چاہیے۔"

جاوید کا چہرہ سرخ پڑا تھا۔ "ابھی میرے پاس یہی ہیں۔ رکھ لو۔ باقی کل دے دوں گا۔"

اس کی ہتھیلی پر سارے پیسے رکھتا وہ باہر نکل گیا

تھا۔

☆☆☆

اریبہ کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ خلاف معمول ندرت نے ہر رسم میں عروسہ کو آگے کیا لیکن اپنے احساس کمتری، عدم اعتماد اور موازنے کے چکر میں الجھی وہ اُکھڑی اُکھڑی سی رہی۔

اریبہ رُخصت ہوگئی تھی۔

ندرت نے اسے کچھ دن اپنے پاس رکنے کے لیے اصرار کیا لیکن اسے عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ ان کے اصرار کے باوجود نہیں رکی اور طوبیٰ کا بکھرا سامان اٹھا اٹھا کر بیگ میں ٹھونستی رہی۔

واپسی کا سارا راستہ وہ ماں کا اداس، تھکا تھکا چہرہ اپنے ذہن سے بار بار جھٹکنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

''آ گئی ہماری شہزادی۔'' طوبیٰ کو دیکھتے ہی مومن نے نعرہ بلند کیا۔

''شکر ہے بھابھی! آپ آ گئیں۔ ورنہ میں طوبیٰ کو لینے وہاں پہنچنے والا تھا۔ اپنی شہزادی کے بغیر دل ہی نہیں لگتا اب ہمارا.....'' مومن نے آگے بڑھ کر طوبیٰ کو اس سے لے لیا تھا۔

وہ بھی چاچو کو دیکھ کر ہمکنا شروع ہوگئی۔ وہ ان سب سے بہت مانوس ہوگئی تھی۔

''اپنی پھوپھو کے پاس آئے گی طوبیٰ؟''

پاکیزہ نے دونوں بازو پھیلائے۔ مومن نے اسے اٹھا کر ہوا میں بلند کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

انہیں آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر وہ پھوپھو کو سلام کر کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

بیگ کھول کر ایک ایک چیز اپنے ٹھکانے پر رکھنے لگی۔

زندگی پھر سے پرانی ڈگر پر لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

اریبہ عمیر کے ساتھ ہنی مون منانے مالدیپ گئی تھی۔ واپسی پر سب کے لیے بہت خوب صورت اور مہنگے گفٹ لے آئی تھی۔

ندرت کی کال آئی۔ اریبہ اور عمیر شام کو کھانے پر آ رہے تھے۔ انہوں نے عروسہ اور جاوید کو بھی بلایا عروسہ نے منع کر دیا۔

''میں نہیں آسکوں گی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں؟'' ندرت تشویش سے پوچھ رہی تھیں۔

عروسہ نے گہری سانس لی۔ ساری فکر، ساری پریشانی محض ڈھکوسلا۔ اس نے سر جھٹکا۔ طوبیٰ اُمی دو سال کی تھی جب وہ پھر امید سے ہوگئی۔

ان دنوں پاکیزہ اور تیمور کے نکاح کی بات چل رہی تھی۔ تیمور جاب کے سلسلے میں ریاض جا رہا تھا۔ رمشہ چچی چاہتی تھیں اس کے جانے سے پہلے اس کا اور پاکیزہ کا نکاح کر دیا جائے۔

گو کہ نکاح سادگی سے ہو رہا تھا۔ گھر کے افراد کے علاوہ قریبی عزیزوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ پھر بھی اچھی خاصی رونق لگ گئی۔

اریبہ اس دن کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ گو کہ اس نے بہت خوب صورت جوڑا پہن رکھا تھا، قیمتی جوتے، بیگ..... لیکن اس کے چہرے پر وہ پہلے والی شادابی نہیں تھی۔

''فریحہ آپا نہیں آئیں نہ ہی سُنا؟'' موقع پا کر ندرت نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

''اپنی مرضی کی مالک ہیں امی، وہ۔ ایسے معمولی فنکشنز میں جانا انہیں اپنے اسٹینڈرڈ کے خلاف لگتا ہے۔''

''پھر بھی عروسہ کے سسرال کا معاملہ ہے اور کچھ نہیں تو عمیر کو تو آنا چاہیے تھا۔''

اریبہ خاموشی سے اپنی کیوٹکس کو کھوجنے لگی۔ اسی بات پر تو اس کی عمیر کے ساتھ اچھی خاصی جھڑپ ہو چکی تھی۔

''میں تمہیں تو وہاں جانے سے نہیں روک رہا.....''

''خاندان کی بات ہے عمیر! میرا اکیلے جانا

مناسب نہیں لگتا۔ سب تمہارا پوچھیں گے۔ میں کس کس کو جواب دوں گی؟ خالہ اور رُشنا کو میں فورس نہیں کرسکتی۔ لیکن تمہیں تو میرے ساتھ چلنا چاہیے؟''

''کم آن یار! کہہ دینا عمیر کو اس قسم کے فنکشنز میں جانا پسند نہیں۔ ویسے مجھے تم سے اس قدر دقیانوسیت کی امید نہیں تھی۔''

''بات دقیانوسیت کی نہیں ہے عمیر! ہم دنیا میں رہتے ہیں تو ہمیں دنیا کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔'' اس کا انداز شائستہ اور نرم ہی تھا۔ لیکن اور بہت سی باتوں کی طرح وہ عمیر کو ساتھ چلنے پر قائل نہیں کر پائی تھی۔

سب نے عمیر کا پوچھا ضرور تھا جتایا کسی نے نہیں۔ لیکن وہ خود کو بہت آکورڈ محسوس کرتی رہی۔

''اچھا کوئی بات نہیں تم زیادہ محسوس مت کرو۔''

ندرت نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کی پشت سہلائی۔ اریبہ بدقت مسکرائی۔

عروسہ کے اندر اس ایک خیال نے جیسے چٹکی سی کاٹی جسے اس نے سر جھٹک کر نظر انداز کردیا عمیر اور جاوید کا بھلا کیا موازنہ؟

☆☆☆

اس نے اس بار بھی صحت مند بچی کو جنم دیا تھا۔ نیلی آنکھوں، سنہرے بالوں والی بے حد خوب صورت بچی۔ وہ کئی ثانیوں تک پلک جھپکے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''یہ تو بالکل گڑیا کی طرح ہے۔'' ازکی نے پیار سے اس کے پھولے پھولے گالوں پر انگلی پھیری۔

''اس کا نام کیا رکھیں؟'' مومن پوچھ رہا تھا۔

''حورین!'' عروسہ فوراً بولی تھی۔

''بھئی ہمارے لیے تو یہ گڑیا ہے'' اس کے کانوں میں اذان دینے سے پہلے سر پر سفید جالی والی ٹوپی جماتے پھوپھا نے کہا۔

عروسہ کو لگا وہ پہلی بار ماں بنی ہے۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز گڑیا ہی تھی۔ اس کے سارے کام وہ خود کرتی۔ اس کے ذرا سے رونے پر بے چین ہوجاتی۔ اپنی تمام تر ممتا اس نے گڑیا پر لٹادی تھی۔ گڑیا کا فیڈر، گڑیا کے کپڑے، گڑیا کا بستر، گڑیا کے کھلونے..... طوبیٰ نہیں نہیں تھی۔

وہ ماں کی نظروں میں ہمیشہ نظر انداز ہوتی آئی تھی۔ اب تو جیسے وہ اس کے وجود سے ہی غافل ہوگئی تھی۔ پھوپھو کو اس کا یہ رویہ تکلیف دیتا، جاوید نے بھی کئی بار ٹوکا۔ لیکن اس معاملے میں وہ کسی کی بھی سننے کی روادار نہیں تھی۔ گڑیا کے معاملے میں وہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ کئی بار طوبیٰ کو بھی جھاڑا۔

اس دن وہ گڑیا کا فیڈر بنانے کچن میں گئی ہوئی تھی۔ واپس کمرے میں آئی تو سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے قدموں تلے جیسے کسی نے زمین کھینچ لی۔

''پاگل ہوگئی ہو؟ ایسے کیوں اٹھایا ہوا ہے اسے؟ اگر یہ گر جاتی تو؟''

جلدی سے آگے لپک کر طوبیٰ کے ہاتھوں سے پھسلتی گڑیا کو تھام لیا۔ دوسرے ہاتھ سے طوبیٰ کو پرے دھکیلا۔

''خبردار! دوبارہ اس کے قریب بھی پھٹکیں تو.....''

''مما! گڑیا رو رہی تھی.....'' طوبیٰ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تو مجھے آکر بتا نہیں سکتی تھیں؟'' وہ دھاڑی تو طوبیٰ خوف زدہ سی دو قدم پیچھے ہٹی۔ اندر آتے جاوید کو لمحہ لگا تھا صورت حال سمجھنے میں۔

''یہ کیا طریقہ ہے عروسہ، کیوں ڈانٹ رہی ہو بچی کو؟''

اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سسکتی ہوئی طوبیٰ کو سینے سے لگالیا۔

''دیکھ نہیں رہے آپ یہ کیا کر رہی تھی؟ اگر گڑیا گر جاتی اس کو چوٹ لگ جاتی تو؟''

''تو یہ بات آرام سے بھی سمجھائی جاسکتی ہے۔''

''ہاں تاکہ یہ پھر سے یہی حرکت کرتی۔'' عروسہ نے گڑیا کو گود میں لٹا کر فیڈر اس کے منہ میں

دیا۔ جاوید نے تاسف سے اسے دیکھا۔ طوبیٰ ابھی تک ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ ماں کے اس غیر متوازن رویے کی وجہ سے اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ لیکن عروسہ یہ بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

ازکیٰ کے کالج میں کوئی فنکشن تھا۔ وہ طوبیٰ کو بھی تیار کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

پھوپھا نرسری سے بہت ساری موسمی سبزیوں کی پنیری لے آئے تھے۔ پھوپھو باغیچے میں پنیری لگانے میں مصروف تھیں۔

جاوید دوپہر کو کھانا کھانے آیا تو عروسہ نے کچھ سوچ کر گڑیا کے کپڑے بدلے، خود بھی تیار ہو گئی۔

"مجھے امی کے ہاں چھوڑتے جائیں گے؟"

کچن کے دروازے پر کھڑی وہ پوچھ رہی تھی۔

"زہے نصیب!" سالن کی پلیٹ پرے کھسکاتا وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ آخر کار عروسہ کو سواری اور ڈرائیور دونوں پر اعتبار آ ہی گیا تھا۔

"میں گڑیا کو لے کر آتی ہوں۔" اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتی وہ کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

جاوید اسے گیٹ پر ہی اتار کر اسٹور چلا گیا تھا۔

"واپسی پر ممانی سے سلام دعا کر لوں گا۔" عروسہ نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

امی کے گھر میں اس وقت ہو کا عالم تھا۔ صحن، برآمدہ، لاؤنج سب سنسان پڑے تھے۔ وہ قدرے حیران سی ہوتی آگے بڑھی۔

"مجھے فریحہ آپا سے یہ امید نہیں تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ....."

اس نے آہستہ سے قدم اندر رکھا۔ ندرت بیڈ پر نیم دراز، رقت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی اریبہ افسردہ سی بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا ہے سب خیریت تو ہے نا؟" اس نے باری باری دونوں کا پریشان چہرہ دیکھا۔

"عروسہ آئی ہے؟ جاوید چھوڑ گیا ہے؟ اندر کیوں نہیں آیا؟"

اس پر نظر پڑتے ہی ندرت ایک دم سیدھی ہو بیٹھیں۔ "گڑیا کو وہاں کیوں بٹھا دیا ہے لاؤ مجھے دو۔"

اریبہ نے بیڈ سے اٹھ کر کارپٹ پر بیٹھی گڑیا کو اٹھا لیا۔

"ماشاء اللہ! بہت پیاری ہے۔"

"طوبیٰ بھی بہت پیاری ہے اور سمجھ دار بھی۔" ندرت بولیں۔ اور ایسا اکثر ہوتا تھا جب بھی کوئی گڑیا کی تعریف کرتا ندرت اسی وقت طوبیٰ کی بھی تعریف کر دیتیں۔

"اس دن تمہارے ابا بھی کہہ رہے تھے۔ عروسہ کی بڑی بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ بہت حساس اور دردمند دل کی مالک ہو گی۔"

عروسہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ "آپ بتائیں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

ندرت نے گہری سانس اپنے اندر اتاری۔ اریبہ کے مسکراتے لب بھی سمٹ گئے۔

"بات کیا ہوئی ہے جب سے اریبہ کی شادی ہوئی ہے فریحہ آپا نے تو ماتھے پر آنکھیں رکھ لی ہیں۔ ویسے کتنا پیار جتاتی تھیں اور شادی ہوتے ہی خالہ سے ساس بننے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔"

"ہونہہ! وہ لاڈ پیار سب دکھاوا تھا۔ ڈھکوسلا۔ بلکہ ان کی زندگی میں کچھ اہمیت رکھتا ہے تو وہ یہی دکھاوا، نمود و نمائش ہی ہے۔ اسی لیے انہوں نے شادی پر اتنا خرچہ کیا تاکہ لوگوں کو متاثر کر سکیں۔ انہوں نے وہ سب کچھ میری محبت میں نہیں بلکہ دنیا کی واہ واہ سمیٹنے کے لیے کیا تھا۔"

اریبہ دکھ سے بول رہی تھی۔

"انہیں ہر کام میں محض اپنی برتری جتانا، دوسروں کو نیچا دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ میرے ساتھ تو یوں برتاؤ کیا جاتا ہے جیسے میں کسی جنگل سے اٹھ کر آ گئی ہوں۔ ہر بات پر جتاتی ہیں اتنی مہنگی برانڈڈ

چیزیں میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ غلطی سے کوئی گلاس، یا پلیٹ ٹوٹ جائے تو کئی دنوں تک باتیں سناتی رہتی ہیں کہ فرقان خالو یہ سیٹ جرمنی سے لے کر آئے تھے۔ اتنے قیمتی سیٹ کو خراب کردیا۔ اس چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ، اس چیز سے دور رہو۔ ملازماؤں کے سامنے بے عزت کرکے رکھ دیتی ہیں۔"

اریبہ بار بار پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارتی رندھے لہجے میں بول رہی تھی۔ عروسہ شاکڈ بیٹھی تھی۔ کوئی اتنا دوغلا کیسے ہوسکتا ہے؟ اتنی خوب صورت خالہ کا اتنا بدصورت روپ؟

"تو تم مت ہاتھ لگایا کرو ان کی چیزوں کو۔ تمہارا اپنا سامان کم ہے کیا؟"

ماں کی بات پر وہ تلخی سے ہنسی۔ "میرا سارا سامان انہوں نے اسٹور میں رکھوادیا تھا کہ انہیں اتنی معمولی چیزوں کو استعمال کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

اریبہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ خالہ کے بدلتے رویوں نے اسے اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ ان کی نظر میں اریبہ تو کچھ تھی ہی نہیں اور اپنی ذات کی نفی برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔

"تم کوئی جاب کرلو اریبہ! ایم بی اے کے بعد جاب کرنا تو تمہارا سب سے بڑا خواب تھا۔"

عروسہ نے گود میں سوئی گڑیا کو تھپکتے ہوئے کہا۔ کچھ بھی تھا اس نے اریبہ کو اس قدر شکست خوردہ حالت میں دیکھنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔

"میں نے بات کی تھی لیکن خالہ اور عمیر دونوں نے اسی وقت انکار کردیا۔ یہ بات ان کے لیے شرمندگی کا باعث ہے کہ میں چند ہزار کی نوکری کے لیے باہر نکلوں۔"

اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔ یوں جیسے کہنے کے لیے اور کچھ بچا بھی نہ ہو۔

"عروسہ! گڑیا کو بیڈ پر سلادو۔ کب سے ایسے گود میں لیے بیٹھی ہو۔ تھک جاؤ گی۔"

ماں کی بات اس نے سنی ان سنی کردی تھی۔

"باجی! کھانا لگادیا ہے۔" سلمٰی نے اندر جھانک کر اطلاع دی۔

"اچھا سنو سلمٰی.....!" ندرت نے بیڈ سے نیچے اترتے ہوئے سلمٰی کو روکا۔ پھر عروسہ کی طرف دیکھا۔

"تم شام تک رکو گی نا؟ جاوید لینے آئے گا تو میں سوچ رہی تھی سلمٰی سے کھانے پر کچھ خاص بنوالوں؟" کایا پلٹ رہی تھی۔ بہت کچھ تھا جو بدل رہا تھا۔ دیکھنے کا زاویہ، سوچنے کا انداز.....

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شام سے پہلے واپس چلی جاؤں گی۔"

گڑیا کو بیڈ پر سلاتے وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔ وہ جب سے اس گھر سے رخصت ہوکر گئی تھی ماں کے ساتھ اس کا بے گانگی بھرا رویہ جوں کا توں تھا۔ ایک ان دیکھا فاصلہ تھا۔ ندرت جتنا اسے سمیٹنے کی کوشش کررہی تھیں عروسہ اتنا ہی شعوری کوششوں سے وہ فاصلہ بڑھا دیتی۔ عصر ڈھلنے کو تھی جب جاوید اسے لینے آیا۔ طوبیٰ بھی اس کے ساتھ تھی۔

"السلام علیکم! ممانی جان کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

وہ احتراماً ہمیشہ ان سے جھک کر ملتا تھا۔ اور ایک وہ تھا ان کا سگا بھانجا..... ندرت کے حلق میں نمکین گولہ سا اٹکنے لگا۔ انہوں نے سلمٰی کو چائے بنا کر لانے کا کہا۔ جاوید نے شائستگی سے منع کردیا۔

"ابھی ذرا جلدی میں ہوں پھر بھی فرصت میں آؤں گا تو مل کر کھانا بھی کھائیں گے۔ چائے بھی پئیں گے۔ بہت دن ہوگئے ماموں جان سے بھی تفصیلی ملاقات نہیں ہوسکی۔ چلیں عروسہ؟"

بات کرتے کرتے اس نے عروسہ کی جانب دیکھا جو پہلے ہی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"طوبیٰ! تانو کو سلام نہیں کیا بچے آپ نے؟"

گڑیا کو آگے بٹھاتے ہوئے طوبیٰ کو نرمی سے سرزنش کی تو وہ عادتاً ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔

"ذرا تمیز نہیں ہے اس لڑکی کو۔ جتنا سمجھالو کوئی

فائدہ نہیں....."

عروسہ نے تیز نگاہوں سے اسے گھورا تو اس نے مارے شرمندگی کے ناخن کترنا شروع کردیئے۔ ندرت کے دل کو دھکا سا لگا۔ ایک بھولا بھولا بسرا منظر زندہ جاوید ہو کر پھر سے نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

بائیک اسٹارٹ کرنے سے پہلے جاوید نے گردن گھما کر عقب میں بیٹھی عروسہ سے پوچھا۔

"ٹھیک سے بیٹھ گئی ہو؟ چلیں اب؟"

کمرے کی کھلی کھڑکی سے اریبہ نے نظر بھر کر یہ منظر دیکھا تھا۔

☆☆☆

جاوید دروازے پر ہی انہیں اتار کر واپس اسٹور چلا گیا تھا۔

پھوپھا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ گھر پر آرام کررہے تھے۔ ورنہ جاوید کی غیر موجودگی میں اسٹور پر جا کر بیٹھ جاتے۔ بغیر کسی اشد مجبوری کے جاوید اسٹور بند نہیں کرتا تھا۔

عروسہ نے اسے چار بجے لینے آنے کے لیے کہا تھا تو وہ اسٹور بند کرکے فکس چار بجے اسے لینے پہنچ گیا تھا۔ وہ چاہتا تو انکار کردیتا لیکن اس نے پہلے بھلا کب عروسہ کو کسی کام کے لیے انکار کیا تھا؟

عروسہ سوچنا نہیں چاہتی تھی اس لیے سر جھٹکتی اندر بڑھ گئی۔ پھوپھو کال پر کسی سے بات کررہی تھیں۔ اس پر نظر پڑی تو الوداعی کلمات کے بعد فون بند کردیا۔

"راشدہ کا فون تھا۔ ازکی کے رشتے کے لیے کہہ رہی تھی۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ تمہاری رمشہ چچی کے جاننے والے ہیں۔ کہہ رہی تھی وہ لوگ کل ازکی کو دیکھنے آنا چاہتے ہیں میں نے کہا عروسہ سے پوچھ کر جواب دوں گی، کل اس کی کوئی مصروفیت نہ ہو....."

پھوپھو از خود بتانا شروع ہوگئیں۔ وہی مخصوص نرم انداز..... عروسہ کے لیے دیے اکھڑے رویے کے باوجود وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اس سے مشورہ ضرور کرتی تھیں۔

حالانکہ شروع شروع میں عروسہ نے، اپنے رویے سے انہیں زچ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ ایک دن پھوپھو تنگ آ کر اس کی شکایت امی اور ابا سے جا کر کریں تاکہ انہیں بھی پتا چلے زبردستی شادی کروانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ لیکن پھوپھو نے کبھی اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔

امی، ابا سے شکایت کرنا تو دور، وہ تو اس کے اکھڑپن پر بھی کبھی اپنے ماتھے پر شکن نہیں لائی تھیں۔

کبھی کبھار بہت سامنے کی بات، بہت صاف منظر ہم دیکھ نہیں پاتے۔ بے جا ضد اور انا کی عینک آنکھوں پر چڑھائے اس منظر کی خوب صورتی سے ہماری بصارت اور بصیرت محروم ہی رہتی ہیں۔ اس محرومی کا الزام ہم بہت آرام سے اپنی خراب قسمت کے سر پر تھوپتے چلے جاتے ہیں۔

"تم بتاؤ بیٹا! کیا جواب دوں ان لوگوں کو؟"

اس کی سوچوں سے بے خبر پھوپھو پوچھ رہی تھیں۔ عروسہ سے اس وقت ان سے نگاہ ملانا دوبھر ہو گیا تھا۔ آہستہ آواز میں نگاہیں نیچے کیے محض اتنا ہی بول سکی۔

"آپ انہیں کل بلالیں پھوپھو!"

اپنی منتشر سوچوں میں گھری وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

پھوپھو نے انہیں کال کرکے کل آنے کا عندیہ دیا۔ پھوپھو کھانا بہت اچھا بناتی تھیں۔ ازکی اور پاکیزہ ان کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔

"پاکیزہ! تم پلیز گڑیا کو سنبھال لو۔ یہ میں کرلوں گی اور ازکی تم یہاں کیا کررہی ہو۔ جا کر اچھے سے تیار ہو جاؤ وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

عروسہ نے کچن میں آتے ہوئے اس قدر بے تکلف اور اپنائیت بھرے انداز میں کہا کہ وہ دونوں ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ ان کی حیرت پر شرمندگی محسوس کرتی وہ آگے بڑھی۔

"لائیں پھوپھو! یہ میں کر دیتی ہوں۔" اس

نے کفگیر پھوپھو کے ہاتھ سے لے لیا۔
''اور میں نے تم دونوں سے کچھ کہا ہے؟''
اپنی جھینپ اور ان کی حیرت مٹانے کے لیے وہ اس بار مصنوعی رعب سے بولی تو دونوں مسکرا اٹھیں۔ اور ''جی بھابھی!'' کہتی کچن سے باہر چلی گئیں۔
باقی کا سارا کام اس نے منٹوں میں نمٹا لیا تھا۔ کچن سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ شاور لے کر کپڑے بدلے اور گڑیا کو تیار کرنے لگی۔
''مما! میرے کپڑے چینج کر دیں۔'' طوبیٰ کب سے اس کا سر کھائے جا رہی تھی۔
''ٹھیک ہیں تمہارے کپڑے۔ کل ہی تو چینج کیے تھے۔'' گڑیا کو سرخ ڈالس والی پھول دار فراک پہناتے وہ مصروف لہجے میں بولی۔
''گڑیا کے بھی تو آپ نے چینج کیے ہیں نا؟ تو پھر میرے کیوں نہیں؟'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔
''میرا سر مت کھاؤ طوبیٰ! جاؤ جا کر ڈریسنگ ٹیبل سے ٹالکم پاؤڈر اٹھا کر مجھے دو۔''
گڑیا کے بالوں میں آہستہ سے برش پھیرتی وہ بولی۔ طوبیٰ اس سے مس نہ ہوئی۔
اکھڑی اکھڑی سی تن کر سامنے کھڑی رہی۔
''نہیں پہلے آپ مجھے بھی گڑیا کی طرح تیار کریں۔''
عروسہ نے کھینچ کر تھپڑ اس کے رخسار پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ اندر آتے جاوید نے بروقت سنبھال لیا۔ ''عروسہ!'' وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
''بابا! مما نے مارا ہے۔'' طوبیٰ زور زور سے روتی اس سے مزید لپٹ گئی۔
''بہت افسوس کی بات ہے۔ اتنی بے دردی سے کون مارتا ہے بچوں کو؟''
''آپ اس کو نہیں دیکھ رہے؟ کتنی ضدی اور خود سر ہو گئی ہے۔ ایک بات نہیں مانتی میری۔''
عروسہ غصے سے بولی۔ اٹھ کر ٹالکم پاؤڈر اٹھایا اور گڑیا کی گردن پر آگے پیچھے چھڑکنے لگی۔
''اگر یہ نہیں مان رہی تھی تو تم مان لیتیں اس کی۔ بچوں کی خواہشات، ان کی نفسیات سمجھنے کے بجائے ہر وقت ان پر حکم چلانے، ان پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ضدی اور خود سر تو بنیں گے ہی۔ کبھی کبھار ان کی بھی سن لینی چاہیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟''
طوبیٰ کو خود سے الگ کرتا وہ اس کے آنسو صاف کرتا مدہم لہجے میں بول رہا تھا۔
''اس کو ڈانٹنے کے بجائے آپ مجھے برا بھلا کہہ رہے ہیں تاکہ اسے اور شہہ ملے۔''
''میں تمہیں برا بھلا نہیں کہہ رہا عروسہ! صرف سمجھا رہا ہوں کہ.....''
''ہاں سمجھنے کی ضرورت تو صرف مجھے ہی ہے۔''
باہر سے مہمانوں کی آواز آ رہی تھی۔ گڑیا کو اٹھا کر وہ دونوں باپ بیٹی پر ایک کٹیلی نگاہ ڈالتی باہر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

رمشہ چچی بھی مہمانوں کے ساتھ آئی تھیں۔ عاشر، تیمور کا بہت اچھا دوست تھا۔ انہیں ازکی بہت پسند آئی تھی۔ عاشر کی ماں، بہنیں تو لگے ہاتھوں اسے منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ہی جانا چاہتی تھیں۔ لیکن پھوپھو نے سوچنے کے لیے کچھ دن کی مہلت مانگ لی۔ کوکہ رشتہ رمشہ کے توسط سے آیا تھا اس لیے چھان بین کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن پھوپھو سب سے صلاح مشورہ کے بعد ہی انہیں حتمی جواب دینا چاہتی تھیں۔
پھوپھا خرابی طبیعت کی وجہ سے زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکے تھے۔ البتہ جاوید سارا وقت وہاں موجود رہا۔ باتوں باتوں میں کئی بار عروسہ کو بھی بیچ میں گھسیٹنے کی کوشش کی وہ دل ہی دل میں تلملاتی بظاہر مسکرا کر سر ہلا دیتی۔ جاوید کے لبوں پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ اپنی تمام تر ترجیح ادائیوں کے باوجود وہ اسے دل سے پیاری تھی۔
پھوپھو بہت خوش اور مطمئن تھیں۔ سب سے مشورہ کرنے کے بعد رشتہ اوکے کر دیا گیا۔
ابھی صرف نکاح ہو رہا تھا۔ شادی تیمور کے

واپس آنے پر دونوں کی ایک ساتھ ہونا طے پائی۔
عروسہ سبزیاں کاٹ رہی تھی جب اریبہ کی کال آئی۔ وہ اسے امی کی خرابی طبیعت کا بتا رہی تھی۔
"کیا ہوا ہے انہیں؟" چاہ کر بھی وہ لہجہ سرسری نہ بنا سکی۔
"بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے جبران اور ابا انہیں بروقت ہاسپٹل لے گئے۔"
میں ان کے پاس ہوں۔ تم آؤ گی نا؟"
"ہاں دیکھتی ہوں۔" مبہم جواب دے کر اس نے کال بند کر دی۔
"اریبہ آج بھی آپ کے لیے مجھ سے زیادہ اہم ہے۔ اسے بلا لیا مجھے نہیں بلوا سکتی تھیں؟" وہ دل ہی دل میں ماں سے شکوہ کناں ہوئی۔ دل میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی لیکن وہ دھونے والے کپڑے جمع کر کے انہیں دھونے بیٹھ گئی۔
"عروسہ بیٹا! ندرت بھابھی کی طبیعت خراب ہے۔ تمہیں ان کے پاس جانا چاہیے۔ ہم لوگ شام میں آ جائیں گے۔ یہ کپڑے رکھ دو۔ پاکیزہ دھو لے گی۔"
"میں بھی شام میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔" کپڑے جھٹک جھٹک کر تار پر پھیلاتی وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔ پھوپھو نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جانتی تھیں عروسہ ہمیشہ وہی کرتی ہے جو اس کا دل چاہتا ہے۔ اسے سمجھانا بے کار تھا۔
کپڑے دھونے کے بعد وہ ادھر ادھر کے غیر ضروری کاموں میں لگی رہی لیکن دل کو کسی طور قرار نہیں مل رہا تھا۔ جاوید کی نگاہوں سے اس کا اضطراب چھپا نہیں رہا تھا لیکن وہ دانستہ چپ رہا۔
عروسہ کی پیچیدہ نفسیات پرت در پرت اس پر کھلی تھی۔ وہ چاہتا تھا اپنے اندر چھڑی جنگ سے خود ہی لڑے اور لڑ کر جیتے۔ جب وہ کھانا کھا کر اسٹور پر جانے کے لیے بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا تب وہ گڑیا کو ساتھ لیے تقریباً بھاگتے ہوئے دروازے تک آئی تھی۔
"مجھے امی کے ہاں چھوڑ دیں گے؟"
جاوید نے اثبات میں سر ہلایا۔
"مما! میں بھی ساتھ چلوں گی۔" طوبیٰ بھاگتے ہوئے آئی تھی۔ بحث کا وقت نہیں تھا۔ طوبیٰ کے بیٹھنے کے بعد عروسہ خاموشی سے بائیک پر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

اریبہ ماں کے لیے کچن میں سوپ بنا رہی تھی۔ طوبیٰ اور گڑیا دونوں آتے ہی بھاگ کر کچن میں گھس گئیں۔
"عروسہ آئی ہے؟" اس کے اندر قدم رکھتے ہی ندرت نے بند آنکھوں پر رکھا بازو ہٹایا۔ اس کے دل کو یک دم کچھ ہوا تھا۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال سی لگ رہی تھیں۔ کہنی کے بل تھوڑا سا اوپر کو اٹھ بیٹھیں۔
"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" عروسہ ان کے قریب تک گئی۔
"اب ٹھیک ہوں۔" وہ نقاہت سے مسکرائیں۔ عروسہ کی نظر ان کے سفید ہاتھوں پر پڑی جن پر رگیں ابھر آئی تھیں۔ بے اختیار اس کا دل چاہا ان کا کمزور ہاتھ تھام لے۔
"ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟" ندرت نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔
اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔
"تمہیں ناراض ہونا چاہیے۔ احتجاج کا حق تو بہرحال تم رکھتی ہو۔" عروسہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔ اس بات کا احساس مجھے بہت دیر سے ہوا۔ جب تم اس گھر سے چلی گئیں۔ تمہاری پڑھائی ادھوری چھوڑ دینے پر ہمیشہ تمہیں ڈی گریڈ کرتی رہی حالانکہ تم نے گھر کے سارے کام بخوبی سنبھال لیے تھے۔ لیکن مجھے یہ سب کبھی دکھائی ہی نہیں دیا۔ تم پھوہڑ اور بدسلیقہ نہیں تھیں۔
میں یہ بھول گئی کہ ہر بچہ ایک جیسی ذہانت لے

pklibrary.com

کر پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک کی شخصی خوبیاں، خامیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ سب کو ایک ہی پیمانے سے پرکھنا بہت بڑی بے وقوفی ہے اور میں یہ بے وقوفی تواتر سے کرتی رہی۔ تم غیر معمولی نہ سہی اتنی معمولی بھی نہیں تھیں۔ تمہاری شخصیت کی خامیاں میری تربیت کا نقص ہیں۔ میں نے ہمیشہ تمہارا دل دکھایا..... میں اچھی ماں ثابت نہیں ہو سکی نا؟"

عروسہ کو احساس ہی نہیں ہوا کب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

"اپنی ماں کو معاف کر دو بیٹا! تم تو میری بہت سمجھ دار اور سلجھی ہوئی بیٹی ہو جسے اپنی کم فہمی کی وجہ سی میں نے ضدی اور خود سر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

عروسہ نے بے ساختہ ان کا وہی ہاتھ تھام لیا۔

"مائیں بیٹیوں سے معافی نہیں مانگتیں امی! انہیں معاف کرتی ہیں۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ....."

آج سارے فاصلے سمٹ گئے تھے۔ بے گانگی کی دیوار، گلے شکووں کی بیلوں سمیت زمین بوس ہو گئی تھی۔ ان کے سینے پر سر رکھے اس نے آج سارے آنسو بہا ڈالے تھے۔

"تم وہ غلطی مت کرنا بیٹا! جو میں نے کی۔ قسمت ہر ایک پر مہربان نہیں ہوتی ....." اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے انہوں نے مدھم سی سرگوشی کی۔ باہر سے اریبہ اور بچیوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اریبہ نے خوش گوار حیرت میں گھر کر اندر کا منظر دیکھا جیسے بارش کے بعد سب کچھ دھل کر نکھر گیا ہو۔

"اچھا بس اب شور نہیں کرنا۔ نانو کی طبیعت خراب ہے۔" اریبہ نے سوپ کا باؤل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گڑیا کو اشارہ کیا تو اس نے سعادت مندی سے "جی ریبا خالہ" کہہ کر سر ہلا دیا۔

"نانو کی طبیعت کے سارے دلدر آج دور ہو گئے ہیں۔" ندرت نے تکیے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے سکون سے کہا۔ عروسہ باؤل اٹھا کر انہیں اپنے ہاتھوں سے سوپ پلانے لگی۔ اریبہ نے بچیوں کے لیے پاستا بنایا ہوا تھا۔ وہیں بیٹھ کر انہیں کھلانے لگی۔ عروسہ کے سوال پر اس کا ہاتھ لمحہ بھر کے لیے کانپ سا گیا۔

"ویسے امی! آپ کی طبیعت اچانک اتنی خراب کیسے ہو گئی۔ پہلے تو کبھی بلڈ پریشر اتنا ہائی نہیں ہوا؟"

فریحہ خالہ نے پہلے پہل ڈھکے چھپے لفظوں میں اور بعد میں اٹھتے بیٹھتے برملا بچے کا تقاضا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اریبہ خاموش ہو جاتی۔ ایک آدھ بار ندرت نے بھی کہا۔ "پہلا بچہ جتنی جلدی ہو جائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔ لڑکی کی اپنے سسرال اور شوہر کی زندگی میں حیثیت مستحکم ہو جاتی ہے۔"

اریبہ خاموش رہی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ عمیر کا اگلے پانچ سالوں تک بھی فیملی بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

"اوہ پلیز یار! تم نے کیا ٹپکل عورتوں کی طرح بچہ بچہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ابھی ہماری شادی کو بھلا عرصہ ہی کتنا ہوا ہے؟"

کبھی جھنجھلا کر تو کبھی غصے سے ٹال کر وہ اس موضوع سے جان چھڑوا لیتا تھا۔

"میں نہیں چاہتا ابھی ہماری کپل لائف ڈسٹرب ہو۔ جانتی ہو بے بی آنے کے بعد سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔" اس کی اپنی سوچ تھی۔

"بے بی آنے کے بعد لائف مکمل ہو جاتی ہے عمیر!" اریبہ اسے سمجھاتے سمجھاتے اب تھکنے لگی تھی۔

وہ بے حد خوبرو تھا لیکن من موجی، لاپرواہ اور غیر ذمہ دار۔ سب سے زیادہ دل دکھانے والی چیز وہ دوسروں کو سمجھنے، ان کا خیال رکھنے کے احساس سے نابلد تھا۔ اریبہ نے اپنا نصیب سمجھ کر سمجھوتہ کر لیا تھا۔

وہ فریحہ خالہ کی ہر زیادتی پر خاموش ہو جاتی۔ لیکن اس دن اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ فون پر اس کی ماں کو اس کے بانجھ ہونے کا طعنہ دے رہی تھیں۔

''شادی کو دو سال ہو گئے ہیں ابھی تک خوش خبری کی کوئی امید نہیں۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے عمیر اس سے نسل آگے چلنی ہے۔ لیکن یہاں تو کوئی آثار ہی نہیں۔ بانجھ پن بھی تو بہت عام ہو گیا ہے آج کل اور.....''

اریبہ کا دماغ بھک سے اڑا۔ طیش کے عالم میں وہ آگے بڑھی اور موبائل ان کے ہاتھ سے لے کر کال ڈس کنکٹ کر دی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' فریحہ خالہ نے غصے سے کھول کر اسے دیکھا۔

''غلط بات مت کریں خالہ! میں بانجھ نہیں ہوں۔'' موبائل ان کے ہاتھ میں تھماتی وہ تیز تنفس کے ساتھ بولی۔

''اچھا تو پھر ابھی تک کوئی خوش خبری کیوں نہیں؟''

''یہ آپ اپنے بیٹے سے پوچھیں۔'' اس نے سیڑھیاں اترتے عمیر کی طرف اشارہ کیا جس کے سینے بجاتے ہونٹ پھیل گئے۔ ابرو اچکا کر ان دونوں کو دیکھا۔

''وائس پرابلم؟''

''مجھے اپنا پوتا چاہیے۔ ویٹس اٹ۔'' فریحہ خالہ نے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ بازار سے کوئی کھلونا لینے کی بات کر رہی ہوں۔

''واٹ دا ہیل۔'' عمیر جی بھر کے بدمزہ ہوا۔

''دوسروں کو میرے بانجھ پن کے جھوٹے قصے سنانے کے بجائے آپ کے لیے یہ جاننا زیادہ ضروری ہے کہ آپ کا اکلوتا بیٹا ہی ابھی فیملی بڑھانے میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔''

ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بے خوفی سے بولی تھی۔

''یہاں ہماری بیڈ روم لائف کیوں ڈسکس کی جا رہی ہے؟'' عمیر جھنجلایا۔

''یہ تم اپنی ماں سے ہی پوچھو؟'' اریبہ تن فن کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار اتنا شدید غصہ آیا تھا۔

فریحہ خالہ نے ذرا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔ فون کر کے ندرت کو وہ بے نقط سنائیں کہ ان کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر گیا۔ جبران اس وقت اکیڈمی سے واپس لوٹا تھا۔ ماں کو بے ہوش پڑا دیکھ کر پہلے باپ کو کال ملائی پھر اریبہ کو۔ بروقت ہاسپٹل پہنچ جانے سے انہیں فوری ٹریٹمنٹ دے دیا گیا۔ طبیعت تو سنبھل گئی تھی لیکن آپا کی باتوں نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

عروسہ دم بخود سی ان کا لفظ لفظ سنتی رہی۔ اریبہ سرخ چہرہ لیے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ عروسہ نے سوپ کا باؤل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر انہیں لٹا دیا۔

''اچھا آپ پریشان نہ ہوں۔ اریبہ کے حصے کی خوشیاں اس کو ضرور ملیں گی۔ کسی کو اللہ آزما کر دیتا ہے تو کسی کو دے کر آزماتا ہے۔ لیکن ہر آزمائش کے بعد ایک انعام ضرور اس کا ہوتا ہے۔''

اس نے ایک حوصلہ دلاتی مسکراہٹ سے اریبہ کو دیکھا تھا۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

جاوید کے ساتھ سب ہی ندرت کی طبیعت پوچھنے چلے آئے تھے۔

''ارے اماں! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ ویسے ہی آج کل آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں اوپر سے یہ ہماری ٹوٹی پھوٹی گلیاں..... آپ کی بہو ماشاء اللہ اب بالکل ٹھیک ہے۔'' دادی کو آتا دیکھ رک ابا فوراً آگے بڑھے تھے۔

''کامران نے بھی یہی کہا لیکن میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کہا خود جا کر دیکھوں گی تو ہی دل کو قرار آئے گا۔''

جبران نے ابا کے ساتھ مل کر ہانپتی کانپتی دادی

کو تخت پر بٹھانا چاہا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔
"نہیں بیٹھوں گی بہو کے پاس۔"
ندرت اٹھ بیٹھیں۔
"کیسی طبیعت ہے اب؟ اللہ میری عمر بھی تمہیں لگا دے۔ اپنے بچوں کی خوشیاں، کامیابیاں دیکھنا نصیب کرے۔" وہ گلوگیر لہجے میں دعائیں دیتی رہیں۔ ندرت کے اندر قطرہ قطرہ آنسو گرنے لگے۔

ایک سلونی سی شام ان کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ پھوپھو اور چچی نے جوس، فروٹ کے تھیلے خود اندر جا کر رکھے۔ پرہیزی کھانوں کے ڈبے عروسہ کے حوالے کیے۔

ندرت نم آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں زندگی بھر انہوں نے منہ نہیں لگایا تھا۔ ہمیشہ انہیں خود سے کم تر سمجھا اور اب وہی کیسے ان کے بیمار ہونے پر دوڑے چلے آئے۔ بھابیوں نے کال پر ہی خیریت پوچھ کر فرض ادا کر لیا تھا۔ دونوں بھائی بھی بس کھڑے پاؤں دو بول خیریت کے پوچھ کے چلتے بنے تھے۔

نانی کو فائقہ ممانی کا دلاور کئی منتوں کے بعد یہاں چھوڑ گیا تھا۔ جاتے جاتے کہہ گیا۔
"میرا آج کرکٹ کا فائنل ہے۔ واپسی پر لینے نہیں آؤں گا۔ جبران سے کہیے گا وہ آپ کو چھوڑ جائے گا۔"

فائقہ اور فضا بھابھی کی آئے روز کی چپقلش کی وجہ سے نانی کے گھر کا ماحول بہت گھٹن زدہ رہنے لگا تھا۔ ندرت نے وہاں جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اریبہ کی شادی کے بعد تو تقریباً جانا چھوڑ ہی دیا۔

"اماں! آپ یہیں رک جائیں نا میرے پاس۔" نانی کو واپسی کی تیاری کرتے دیکھ کر وہ لجاجت سے بولی تھیں۔ "یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی آپ کو۔"

ماں کی وجہ سے انہیں اس گھر میں جانا پڑتا تھا جہاں اب جانا نہیں چاہتی تھیں۔

"میں جانتی ہوں بیٹا! یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن مائیں اگر شادی شدہ بیٹیوں کے در پر پڑی رہیں تو بیٹوں کے اونچے شملوں پر گرد پڑنے لگتی ہے۔ میں نہیں چاہتی میرے بیٹوں کو دنیا کے سوال جواب کا سامنا کرنا پڑے۔"

ندرت کی آنکھوں میں ریت سی چبھنے لگی۔ وہ بھی تو ماں تھیں اکبری، کتنے مان اور تیاری کے ساتھ بیٹے کے گھر رہنے کے لیے آتیں اور ہر بار ٹوٹے مان، چپ چپ لبوں کے ساتھ واپس لوٹ جاتیں۔

"لیٹ جاؤ بہو! ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ زیادہ دیر بیٹھنا تمہاری طبیعت کے لیے ٹھیک نہیں۔" حال کا خوش گوار جھونکا انہیں چھو کر گزر رہا تھا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں اماں! لیکن آپ میری ایک بات سن لیں۔ آج آپ آ ہی گئی ہیں تو اب میں آپ کو واپس نہیں جانے دوں گی۔ آپ کی محبتوں، آپ کے وقت پر صرف کامران کا ہی نہیں کچھ حق ہمارا بھی تو بنتا ہے نا؟ ہمیں بھی اپنی خدمت کا موقع دے کر اپنی عاقبت سنوارنے کا حق دے دیں....."

بہو پہلی بار اتنی محبت، اتنے مان سے حق جتا رہی تھی۔ ان کا بوڑھا دل خوشی کے بے پایاں احساس سے سرشار ہونے لگا۔

☆☆☆

عروسہ اور اریبہ نے مل کر کھانا تیار کر لیا تھا۔ ازکی سلاد کاٹنے بیٹھ گئی۔ رمشہ چچی نے رائتہ بنا کر باؤل میں ڈالا۔ پاکیزہ نے اٹھ کر بڑے کمرے میں دسترخوان لگا دیا۔

"واہ ہماری بھابھی کے ہاتھ کے پکے کھانے نے آج پورے محلے کی بھوک جگا دی ہوگی۔" مومن نے گڑیا کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"سارا کریڈٹ اپنی بھابھی کو ہی مت دیں۔ میں بھی اس میں برابر کی شریک ہوں۔" اریبہ نے فرضی کالر جھاڑے۔

"بھئی، یہ تو انگلی کٹوا کر زبردستی شہیدوں میں شامل ہونے والی بات ہوگئی۔"

کامران چچا اسے چھیڑتے ہوئے بولے۔ بہت خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

عروسہ چائے بنانے کے لیے اٹھی تو اریبہ بھی اس کے پیچھے کچن میں آ گئی۔

''تم کتنی لکی ہو عروسہ؟''

ٹرے میں کپ رکھتے عروسہ کے ہاتھ تھمے۔ اس نے زندگی بھر اریبہ پر یا تو رشک کیا تھا یا پھر حسد اور آج وہی اریبہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''تمہیں قدر کرنے والے لوگوں کا ساتھ ملا۔ دو پیاری بچیاں اور جاوید بھائی جیسا مخلص، محبت کرنے والا شخص......''

''محبت؟'' عروسہ تحیر زدہ رہ گئی۔ کئی بار اس کے دل نے چپکے سے سرگوشی کی تھی۔ لیکن وہ ہر بار ڈپٹ کر اسے خاموش کرا دیتی۔ مجھ جیسی عام سی لڑکی سے بھلا کوئی شخص کیسے محبت کر سکتا ہے؟ جاوید کے جذبات کی تو اس نے کبھی پذیرائی نہیں کی۔ نہ ہی اسے کبھی یہ حق دیا کہ وہ اس پر اپنی چاہ جتا سکے۔

اریبہ کہہ رہی تھی ''انہیں دیکھ کر تو کوئی اندھا بھی اندازہ لگا سکتا ہے وہ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔''

عروسہ کے آس پاس گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔ کتنا خوب صورت جاں فزا سا احساس تھا۔ چاہے جانے کا احساس وہ اپنی ہی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔

ندرت نے کہا۔ ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں بیٹا! تم دونوں اپنے اپنے گھر جاؤ۔''

عروسہ نے تو اسی وقت جانے کی تیاری پکڑ لی تھی۔ جبکہ اریبہ نے کہا۔

''میں ضرور جاؤں گی امی! لیکن ابھی نہیں ظالم کو اس کے ظلم کا احساس نہ دلانا خود اپنے ساتھ زیادتی ہے۔ میں جانتی ہوں برداشت اور صبر کے بغیر زندگی نہیں گزرتی لیکن جس صبر میں جبر ہو اس کا تو اجر بھی نہیں ملتا۔ انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہونے دیں۔''

ندرت نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

☆☆☆

سبزے سے ڈھکا وہ گھر پہلی بار عروسہ کو کسی جنت سے کم نہیں لگا تھا۔ اور اس گھر کے مکینوں کو بھی پہلی بار ہی دل نے اپنا سب کچھ مانا۔

تیمور اگلے ماہ پاکستان آ رہا تھا۔ ازکی اور پاکیزہ کی شادی کی ایک ساتھ تیاریاں شروع ہو گئی تھیں جاوید نے مومن کو قسطوں پر نئی بائیک خرید کر دی تھی۔ وہ صحن میں گنگناتا اسے چمکانے میں مصروف تھا۔

عروسہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی جب گڑیا کے حلق پھاڑ کر رونے کی آواز آئی۔ جلدی سے چولہا بند کر کے وہ اپنے کمرے کی جانب لپکی۔

''بری بات بیٹا! گڑیا آپ کی چھوٹی بہن ہے۔ آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ آپ نے جان بوجھ کر اسے دھکا دیا......''

گڑیا کا بازو سہلاتا جاوید ساتھ ساتھ طوبیٰ کو بھی سمجھا رہا تھا۔ جو سامنے منہ پھلائے کھڑی تھی۔ ''مجھے گڑیا اچھی نہیں لگتی۔''

عروسہ کے قدم دروازے پر ہی جم گئے۔

''لیکن کیوں بیٹا؟ یہ تو اتنی پیاری ہے۔''

''بس مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

اتنی جارحیت، اتنی ناپسندیدگی، عروسہ کو لگا وہ طوبیٰ نہیں بلکہ ایک اور عروسہ سامنے آ کھڑی ہے۔ وہی اکھڑ پن، وہی ہٹ دھرمی......

''مما صرف گڑیا سے پیار کرتی ہیں۔ انہیں مجھ سے بالکل بھی پیار نہیں ہے۔''

وہ منہ بسورتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گڑیا بیڈ سے ٹانگیں لٹکائے اب مزے سے بسکٹ کتر رہی تھی۔ جاوید نے ہاتھ بڑھا کر ساری دنیا سے خفا کھڑی طوبیٰ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''ایسی بات نہیں ہے میری جان! مما آپ دونوں سے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''نو بابا آپ غلط کہہ رہے ہیں۔'' اس نے شدت سے باپ کی بات جھٹلائی۔

''میں نے خود دیکھا ہے مما کو صرف گڑیا اچھی لگتی ہے۔ ہمیشہ سے...... سارے ٹوائز صرف گڑیا

pklibrary.com

کے لیے، مجھے صرف ڈانٹ ملتی ہے۔ میں گڑیا کی طرح پیاری نہیں ہوں نا؟''

عروسہ نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا۔ اس کی نگاہ میں زمین آسمان گھوم کر رہ گئے تھے۔ جس غیر متوازن رویے کی وجہ سے وہ زندگی بھر ماں سے متنفر رہی تھی۔ شعوری، لاشعوری طور پر خود بھی وہی رویہ اختیار کیے رکھا۔

''یا اللہ! یہ میں کیا کرتی رہی۔ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بچی کی ذہنی صحت اس کی شخصیت بگاڑتی رہی۔ اپنی محرومیوں کا بدلہ اپنی بیٹی سے لیتی رہی؟'' دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ وہیں دیوار کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

''عروسہ! بس کرو یار! دیکھو بچیاں پریشان ہو رہی ہیں۔''

ہوش میں آنے کے بعد بازو آنکھوں پر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ طوبیٰ، گڑیا، تو ایک طرف جاوید بھی اس کے اس طرح رونے پر پریشان ہو گیا تھا۔

''کوئی بات ہوئی ہے؟ کوئی پریشانی ہے مجھے بتاؤ۔'' وہ متفکر سا اس کے قریب بیڈ کے کنارے بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

''میری کوئی بات بری لگی ہے؟'' عروسہ کو اور شدت سے رونا آیا۔

''یار رونا بند کرو۔ دیکھو بچیاں کسی قدر پریشان ہو رہی ہیں تمہیں اس طرح دیکھ کر.....''

اس نے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا۔ دونوں پریشان صورتیں اس کے بے حد قریب کھڑی تھیں۔

''مما! آپ مجھ سے خفا ہیں؟ میں نے گڑیا کو دھکا دیا۔ آئی پرامس آئندہ آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔ آپ کی ہر بات مانوں گی۔ گڑیا کو بھی کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ پلیز رو میں نہیں۔''

طوبیٰ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

عروسہ نے اٹھ کر اسے گلے لگایا۔

''تم تو میری سب سے پیاری بیٹی ہو۔ ساری دنیا سے پیاری.....'' روتے ہوئے وہ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔

''آپ کیوں رو رہی ہو؟'' عروسہ نے اس کے آنسو اپنی ہتھیلیوں پر چنے۔

''میں رو نہیں رہی بیٹا! خوش ہو رہی ہوں۔'' نم آنکھیں لیے وہ مسکرا رہی تھی۔

''میری جان! میری کل کائنات ہو تم دونوں۔'' دوسرے ہاتھ سے گڑیا کو قریب کر کے دونوں کو ایک ساتھ اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''چلو بیٹا! آپ کی مما اب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ باہر جا کر کھیلو۔''

جاوید کا طمانیت بھرا لہجہ بشاشت سے بھرپور تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہنستی، کھلکھلاتی باہر نکل گئی تھیں۔

''تم آرام سے لیٹ جاؤ، تب تک میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے آتا ہوں۔''

جاوید ایک نرم گرم نگاہ اس کے چہرے پر ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''جاوید!'' عروسہ نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام کر روکا۔ وہ سرشار اس کے قریب بیٹھ گیا۔ عروسہ نے ابھی تک اس کا سانولا بھاری ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

''جانتے ہیں اس وقت میرا کیا دل چاہ رہا ہے؟''

''جاوید کو اس کے انداز چونکا رہے تھے۔ وہ تو اس کے منہ سے پہلی بار اپنا نام سن کر ہی سرشار ہو گیا تھا۔

''اگر اللہ اپنے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو آج میں اپنے مجازی خدا کو سجدہ کرتی۔'' جاوید دم بخود رہ گیا تھا۔ دلبری اور خود سپردگی کے ساتھ کیسا خوب صورت انداز تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں پر ماتھا ٹیکے محبت سے کہہ رہی تھی۔

''آپ کا شکریہ جاوید!''

☆☆

ریحانہ وقاص

صابر اور عطیہ

شام تک صالحہ آپا کی بہو کے بھاگ جانے کی خبر، جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل چکی تھی جس نے سنا، انگلیاں دانتوں تلے دبالی۔

"ہائے ہائے اس کی تو کبھی نہ نظریں اٹھیں اور نہ کبھی زبان، سوائے سلام دعا کے۔ لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی دبا رکھا تھا صالحہ آپا نے بے چاری کو۔ جو

pklibrary.com

تنگ آ کر بھاگ ہی گئی۔" کھی کھی کھی کی آوازیں صالحہ آپا کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہی تھی۔ جو سنتا جوق در جوق چلا آتا۔ کچھ دل دکھانے کے لیے اور کچھ دل رکھنے کے لیے۔

☆☆☆

"اپنا مارے گا تو سائے میں ڈالے گا۔ بس میں نے اپنے اکلوتے لعل کا رشتہ رضیہ! تیری بیٹی سے ہی کرنا ہے۔ بس اب تو تاریخ دے دے۔ میرے سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ ایک ہی ایک تو پتر ہے میرا۔"

صالحہ اپنی دیورانی سے جواب سننے کے لیے فون کان سے لگائے کرسی پر سکون سے بیٹھ گئیں۔

"ہاں ہاں باجی! ہم نے کب انکار کیا ہے۔ جم جم آؤ آپ ادھر لاہور ـــــ ہمیں خدمت کا موقع تو دیں۔ رہی تاریخ کی بات تو میں شمع کے ابا سے بات کر کے پھر آپ کو بتاتی ہوں۔"

ادھر ادھر کی باتیں کر کے رقیہ نے فون بند کر دیا۔ رقیہ نے بیٹی سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی جو اس شادی پر دل و جان سے انکاری تھی۔ لیکن جس کے لیے انکاری تھی، اس میں آگے بڑھ کر شمع کو اپنے گھر میں اجالا کرنے کی ہمت نہ تھی اور یوں شمع گھر کے دروازے پر آ کر صابر کے نام سے جوڑ کر ملتان روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

گھر میں تھا ہی کون، صالحہ آپا بے چاری سارا دن گھر میں ادھر ادھر کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھتیں دو بیٹیاں دیار غیر میں بیاہ کر فارغ ہو چکی تھیں بس اب بیٹا بچا تھا جو صرف نام کا ہی صابر نہیں تھا۔ سیرت میں بھی صابر تھا۔

شمع کے آنے سے اسے اپنی زندگی گل و گلزار لگنے لگی تھی، حالانکہ وہ اسے کچھ خاص گھاس نہیں ڈالتی تھی۔

صالحہ آپا کے سامنے، کچھ لحاظ رکھ لیتی لیکن کمرے میں جاتے ہی رویہ بدل جاتا۔ لیکن مجال ہے کبھی اف بھی کی ہو۔

☆☆☆

"یہ لو بہو! گھر کی چابیاں اور سنبھال لو چولہا چکی۔ اب ہماری ذمہ داریاں ختم۔ تم جانو اور گھر جانے۔ ہم تو بس ریٹائرمنٹ لے رہے ہیں۔"

صالحہ آپا، نے شادی کے دو ہفتے بعد ہی شمع کو گھر کی مالکن بنا دیا اور دو چار سہیلیوں سے دوستی رکھی اور باقی اللہ اللہ کرنے لگیں۔ اللہ نے جلد ہی گود ہری کر دی اور بیٹی سے نواز دیا، جس کو صابر اور دادی دل و جان سے لگائے رکھتے۔

"پچھلے کچھ مہینوں سے شمع کا اپنے میکے جانے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور فون بھی کچھ زیادہ آنے لگے ہیں صابر پتر!"

صالحہ آپا نے روٹی کھاتے صابر کے کانوں میں رازداری سے اپنی بات انڈیلی۔

"اوہ نہیں نہیں ماں! بے چاری سارا دن تو بچی اور گھر میں مصروف رہتی ہے۔ دو چار منٹ بات کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں۔" صابر نے کہا اور سامنے بند دروازے کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا، جہاں اندر گم شدہ محبت نئے سرے سے طلوع ہو رہی تھی۔

دبی دبی ہنسی کی جلترنگ پورے کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔

☆☆☆

"اماں! میں دوائی لینے جا رہی ہوں۔ صبح سے گڑیا کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

صالحہ جو اپنے کمرے میں ابھی دوپہر کے سونے کی تیاری کر رہی تھیں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہوا تھوڑی دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک تھی۔ دو مجھے میں اس کو دم کر دوں نظر لگ گئی ہو گی میرے چاند کے ٹکڑے کو۔"

"نہیں نہیں اماں! میں بس ابھی دوائی لے کر آتی ہوں۔ اپنی بھی لینی ہے۔ صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے صابر کا انتظار کیا تو تکلیف بڑھ جانی ہے۔ یہ نکڑ پر تو دوکان ہے۔ ابھی یوں گئی اور یوں آئی آپ سو

جائیں آرام سے، دروازہ کھلا رکھیں تاکہ آپ کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔"

یہ کہہ کر شمع نے دروازہ بند کیا اور باہر کی راہ لی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اور صالحہ گومگو کی کیفیت میں تھیں کہ اچھی بھلی بہو اور پوتی کو یکا یک کیا ہو گیا۔

جب دو گھنٹے بعد صالحہ کی انتظار کرتے کرتے بس بس ہو گئی تو چادر پکڑ کر قاضی ڈاکٹر کے کلینک پر جا پہنچیں لیکن وہاں شمع کا نام و نشان نہیں تھا آس پڑوس میں کوئی اس کی سہیلی بھی نہیں تھی۔ خاموش طبیعت نے بھی کچھ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گئیں۔ دو چار آتی جاتی عورتیں گھبرا کر انہیں گھر لے آئیں اور صابر کو بھی دکان سے بلا بھیجا، دکان سے آتے ہی صابر نے ماں کی حالت دیکھتے ہی واویلا مچا دیا کہ شمع کدھر ہے؟

سب ایک دوسرے کی طرف، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ آخر نکڑ کی دکان سے وہ جا کہاں سکتی تھی؟ ڈاکٹر بھی محلے کا تھا جس نے کہا۔ وہ تو دوائی لینے آئی ہی نہیں۔

آٹھ نو گھنٹے گزرنے کے بعد صابر نے پولیس رپورٹ کرنے سے پہلے، شمع کے گھر والوں کو بتانا مناسب سمجھا اور فون کر دیا لیکن آگے سے ملے جواب نے اس کے پیروں تلے زمین کھینچ لی۔

وہ اپنے والدین کے پاس ملتان سے لاہور پہنچ چکی تھی۔

"بیٹا، تم رپورٹ مت کروانا۔ ہم کل آئیں گے۔ بیٹھ کر بات کریں گے۔" چچا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

صابر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔

"وہ لاہور اکیلی پہنچی کیسے؟ کیوں گئی وہ ادھر؟ کیا تکلیف تھی اسے یوں کہ وہ گھر سے نکلی۔ پورے محلے میں تماشا بنے ہوئے ہیں اس وقت ہم ماں بیٹا..... اکیلی نہیں آ سکتی وہ ضرور کوئی ہو گا اس کے ساتھ جو یوں چپ چپاتے نکل گئی۔"

لیکن فون بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج اپنے ساتھ بہت ساری خوشیاں لے کر ڈوب گیا۔ شمع نے صالحہ اور صابر کی من گھڑت ظلم کی وہ داستانیں سنائیں کہ سارا خاندان انگشت بدنداں رہ گیا۔

واپسی کا کوئی راستہ شمع نے نہیں رکھا تھا بلکہ خود اپنے منہ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا، جو صابر نے فوراً پورا کر دیا۔

چاچا، چچی نے سامان سمیٹا اور چلتے بنے۔ صالحہ دن رات صابر کو حوصلہ دیتیں اور صابر صالحہ کو۔

"ماں میں باہر نکلتا ہوں تو لوگوں کی نظریں مجھے چبھتی ہوئی لگتی ہیں۔ برسوں کی بنی عزت کو ایک عورت نے خاکستر کر دیا۔" صابر نے دل گرفتی سے ماں کے سامنے اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا! عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب تک اللہ نہ چاہے کوئی کسی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ کل خالہ بشیراں آئی تھی میرے پاس اور کہی میں چوتھا گھر ہے استانی کا؟ اس کی تین بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں ان میں سے ایک کا رشتہ کہہ رہی تھی پڑھی لکھی، خوب صورت ہیں۔ بس جہیز کی وجہ سے گھر بیٹھی ہیں تم کہو تو میں آگے بات چلاؤں؟"

ماں بھرے لہجے میں، بیٹے کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماں میرا عورت ذات سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ اگر اس نے میرے ساتھ ایسا کرنا تھا تو شادی ہی نہ کرتی۔ میری بھی زندگی خراب کی اور میری بیٹی کی بھی، خرچا پانی پورا بھجوا رہا ہوں۔ بس اللہ سے ڈرتا ہوں۔ کچھ وقت ساتھ گزارا ہے۔ زبان ساتھ نہیں دیتی کہ کچھ برا کہوں یا بد دعا دوں۔" یہ کہہ کر صابر نے اپنے ہاتھ ماں کے ہاتھوں سے چھڑا کر اٹھنے کی راہ لی۔

صالحہ آپا جلدی سے بولیں۔ "بس آخری بار

میری بات مان لو، نہ جانے میری کتنی سانس باقی ہیں جانے سے پہلے تم کو آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔ بس کل ہی یہ سارا معاملہ حل کر لینا ہے میں نے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے خدا سے بیٹے کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

☆☆☆

جب اللہ چاہتا ہے تو سب در کھول دیتا ہے، آسانیاں پیدا کر دیتا ہے اور یہ ہی صابر کے ساتھ ہوا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی شادی ہو گئی۔

ایک نیک سیرت، پڑھی لکھی بیوی ملی جس نے صحیح معنوں میں گھر میں اجالا کر دیا۔ طیبہ نے خدمت کر کے ساس اور شوہر کے دل کو اپنے لیے موم کر لیا۔

شادی کے دو سال، بیٹے کی نعمت کے ساتھ بہت اچھے گزر رہے تھے صالحہ آپا اللہ کا شکر ادا کرتے کرتے سکون سے قبر میں جا سوئیں۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی صابر بے چین سا تھا اسے پتا نہیں کیوں پچھلی رات سے اپنی پہلی اولاد گڑیا کی یاد آ رہی تھی کہ جانے کیسی ہو گی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" طیبہ جو رات سے ہی اسے بے چین دیکھ رہی تھی۔ آخر پوچھ ہی لیا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر کروٹ بدل کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، کچھ دکھ انسان کے صرف اپنے ہوتے ہیں جو کسی کی ساتھ شیئر نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

صبح صبح تیز بیل کی آواز نے دونوں کو جگا دیا۔ اس سے پہلے کہ صابر دروازہ کھولنے جاتا۔ طیبہ فوراً بھاگ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔ سامنے ایک عجیب گندی میلی سی ایک عورت ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ کھڑی تھی دونوں نے ٹوٹی ہوئی چپل پہنی ہوئی تھی۔

سامنے کھڑی عورت کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کو پیچھے کرتی اس کے پیچھے کھڑے صابر کے قدموں میں گر گئی۔

"مجھے معاف کر دو، خدا کے لیے معاف کر دو میں نے تم پر بہتان لگائے، تم سچے تھے۔ نیک تھے۔ پارسا تھے۔ میں جھوٹی، غلط اور بہتان لگانے والی تھی۔ تمہیں رسوا کر کے میں کہیں کی نہیں رہی۔ اللہ نے تمہارے ساتھ انصاف کیا۔ جس کے لیے میں نے اتنے گناہ کمائے اس نے میرے ساتھ وفا نہیں کی۔ مجھے گلے کا کینسر ہو گیا ہے۔ تم مجھے جو پیسے بھیجتے ہو۔ اس سے دال روٹی لے لیتی ہوں بھائی پوچھتے نہیں۔ یہ اپنی امانت اپنی بیٹی لے لو۔ میں اسے لے کر کہاں جاؤں۔"

صابر حیران پریشان کبھی سامنے دروازے میں کھڑے لوگوں کو دیکھتا اور کبھی پیروں میں لیٹی شمع کو، زور زور سے بولنے سے آتے جاتے لوگ گلی کے گھر میں جھانکتے جا رہے تھے اور کچھ تو شمع کو پہچانتے بھی تھے۔ کپکپاتے وجود کو اس نے پیچھے ہٹایا اور دو قدم دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

آج اللہ نے دنیا کے سامنے اس کے دامن پر پڑے سارے چھینٹے صاف کر دیے تھے۔ "میں نے تمہیں معاف کیا اس اللہ کے لیے جو دلوں کا حال بہتر جانتا ہے۔"

صابر کی آواز پر اس نے گردن اٹھا کر دونوں ہاتھوں کو معافی کے انداز میں جوڑ لیا۔

"یہ کل بھی میری بیٹی تھی آج بھی میری ہے، میں نے صرف تمہاری خوشی کے لیے اسے اپنے پاس نہیں رکھا تھا۔"

صابر کے یہ کہنے کی دیر تھی طیبہ نے بچی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ بچی بھی سہمی سہمی سی اس کے گلے لگ گئی۔

صابر نے تشکر بھری نگاہ، آسمان کی طرف ڈالی اللہ نے اسے بہتر سے بہترین نوازا تھا جو ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح ایک بار پھر گھر کی دہلیز پار گئی۔

☆☆

pklibrary.com

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ھیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بنا پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔

ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ھے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے "PK44ABPA0010000015680030" کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ افریقہ، یورپ -/22000 روپے، ایشیا امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/25000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس اپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

pklibrary.com

فرح بخاری

شام شہر یار

مکمل ناول

میاندم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے تھے، ندرت بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی تحریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی کیا تھا لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔

تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میاندم ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔

حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال خان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بد دماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔

رضوانہ اور ندرت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ اور دوسری مومن چلا رہا ہے راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

pklibrary.com

وسیلہ اور منصب اس طوفان میں ملتے ہیں۔ اتفاقاً وسیلہ ایک پتا پوچھتے منصب سے ٹکراتی ہے وہ اسے مختصر راستے سے اپنے گھر لے کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس پر شک کرتی ہے بعد میں اسے منصب کے گھر اسی پتے کی غرض سے جانا پڑتا ہے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔

تحریم کی شادی میں وسیلہ منصب اور رمشہ کو انوائٹ کرتی ہے۔ منصب اور رمشہ کو وسیلہ اچھی لگتی ہے تحریم اور مومن پوری فیملی کے ساتھ کالام گھومنے جاتے ہیں اسی سفر میں وسیلہ اور منصب کی پھر ملاقات ہو جاتی ہے۔

ارحم رضوانہ اور ان کی فیملی کو ڈھونڈ لیتا ہے اور شہناز اور دادی کو بھی ان سے ملوانے لاتا ہے۔ رضوانہ کا خوف ختم ہو جاتا ہے، شہناز ارحم کے لیے وسیلہ کا رشتہ مانگتی ہے۔ منصب کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

مومن کی شادی ایلیا سے ہو جاتی ہے وہ اس رشتہ کو قبول نہیں کر پاتا کیوں کہ اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ تانیہ عیسیٰ کے بھائی کا علاج کرتی ہے۔ وہ اس لڑکی کی شادی کا پتا چلنے پر خودکشی کر لیتا ہے۔ عیسیٰ اس سب کا ذمہ دار ڈاکٹر تانیہ کو سمجھتا ہے۔ اس کے کلینک پر توڑ پھوڑ کی جاتی ہے۔ وہ مینگورہ چھوڑ کر میاندم آجاتے ہیں۔ شہناز شادی میں دادی کو نہیں لاتی۔ منصوبے کے تحت وہ وسیلہ کو اپنی نیم پاگل بہن کے ساتھ تہ خانے میں بند کر دیتی ہے۔

وسیلہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے، منصب اپنے طور پر کسی کے ذریعے معلوم کرواتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ارحم چترال میں رہ رہا ہے اور دوسری شادی بھی کر چکا ہے، وہ مومن کو اعتماد میں لے کر ساری صورت حال بتاتا ہے۔

مومن رضوانہ اور ایلیا کے ساتھ تھانہ آتا ہے۔ وسیلہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوتی ہے، اس کی دماغی حالت خراب ہوجاتی ہے وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ منصب کی مدد سے مومن شہناز اور ارحم کے خلاف رپورٹ درج کرواتا ہے۔ ارحم اور شہناز اپنی ملازمہ کے ذریعے ہاسپٹل میں وسیلہ کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں، عین وقت پر منصب آجاتا ہے۔

مومن وسیلہ کو میاں دم لے آتا ہے۔ یہاں اس کا علاج ہوتا ہے لیکن اس کی دماغی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے تانیہ کی مدد لی جاتی ہے۔

دادی منصب کو بتادیتی ہیں کہ وہ ان کا پوتا ہے، شہناز اسے مارنے کا پروگرام بناتی ہے اس لیے وہ منشی کی بیوی سے رضوانہ کا بیٹا تبدیل کردیتی ہیں۔ تاکہ اس کی جان بچ جائے۔

دسویں قسط

"مجھے یقین ہے تانیہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگی اور ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اور ہاں۔ تم کیا کہہ رہے تھے کہ بہت کچھ ڈسکس کرنا ہے۔"

"یار، سب سے بڑی پرابلم تو وسیلہ کا گھر کی خواتین کے ساتھ رویے کا ہے۔ میں گھر پر نہ ہوں تو ان کے لیے مینج کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ پھوپھو الگ پریشان رہتی ہیں۔ دوسرا مسئلہ گھر میں جگہ کی کمی کا پیش آرہا ہے۔ اس کے لیے تو خیر میں نے کامران سے بات کرلی ہے۔ ہم نے پھوپھو کے اکیلے پن کی وجہ سے گھر کرائے پر چڑھایا تھا۔ کامران کے لیے اب میں کسی دوسری جگہ گھر دیکھ رہا ہوں۔ وہ بھی ہماری مجبوری سمجھ رہا ہے۔"

"صحیح کررہے ہو مومن، اور وسیلہ کا اپنے گھر جانا اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ اگر اسے پرانی باتیں کچھ کچھ یاد ہیں تو اپنے گھر، اپنے کمرے میں واپس جانا بہت مددگار ثابت ہوگا۔"

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہاں صرف پھوپھو اور وسیلہ ہوں گی۔ اور پھوپھو سے تو وہ ڈرتی اور چھپتی ہے۔ اور ہرگز ان کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔"

"ہوں۔" منصب نے بھی لب بھینچے۔ "ایلیا اور مامی کا جانا بھی کسی کام کا نہیں، وہ انہیں بھی پسند نہیں کرتی۔" وہ اپنے آپ میں بڑبڑایا تھا۔

"تم گھر آجاؤ منصب؟" مومن نے ایک دم ہی کہہ دیا تو منصب نے چونک کر سر اٹھایا۔

"میں.....؟" وہ حیرت زدہ تھا "کیا یہ اتنا آسان ہے مومن؟"

"آسان یا مشکل مجھے نہیں پتا منصب..... لیکن یہ بہت ضروری ہے۔"

"تم سمجھ نہیں رہے مومن۔" اُس نے بے چینی سے جگہ بدلی "امی اور باقی گھر والے اس حقیقت کو مان بھی جائیں کہ میں اس گھر کا فرد ہوں، ہم باقی دنیا کو کیسے یقین دلائیں گے۔ اور کون مانے گا۔ اتنا بڑا سچ۔ جو دنیا کے نزدیک معلوم نہیں سچ ہے بھی یا نہیں اور۔"

"پلیز منصب۔ اس وقت صرف وسیلہ کے متعلق سوچو۔ میرے پاس اس وقت میرے علاوہ کوئی نہیں ہے جسے وہ اپنا سمجھے۔ اور مجھے صرف تمہاری نہیں رمشہ کی بھی ضرورت ہے۔ تمہیں اس نے اگر صرف پہچانا تھا تو رمشہ اور تانیہ کو اس نے اپنی نئی دوست سمجھا ہے۔ وہ مجھ سے کئی بار ان دونوں کے متعلق پوچھ چکی ہے۔ ایسے میں اگر تم گھر آجاؤ تو رمشہ مستقل اس کے پاس آجائے گی۔ پھر تم خود سوچو، وہ رمشہ کا خون اس کی سگی بہن ہے۔ تم دور رہ کر رمشہ پر بھی کیوں ظلم کررہے ہو۔"

"کیونکہ ہماری زندگی آپ سب سے دور رہتے گزری ہے۔" منصب بے ساختہ کچھ تلخ ہوا، پھر خود ہی سر جھٹک کر ہاتھ تھکے تھکے انداز میں اپنی

گود میں گرائے۔

"میں صرف وسیلہ کے نہیں۔ ارحم اور حویلی والوں کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں مومن! وہاں بھی کوئی نہیں جانتا کہ رشتوں کی نوعیت بدل چکی ہے۔ اور اگر جان جائیں تو یقین مرتے دم تک نہیں کریں گے۔ ایسے میں ارحم کی بیوی کے ساتھ میرا ایک ہی گھر میں رہنا۔" اس نے سوالیہ مومن کی طرف دیکھا تو اس نے بھی ایک گہرا سانس کھینچا۔

"بات تمہاری ٹھیک ہے منصب! لیکن سب سے پہلے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ تم حویلی والوں کے پریشر سے باہر نکل آؤ۔ اور وہ اس لیے کہ تم حویلی کے مالکوں میں سے ایک ہو۔ اور تمہیں یہ بات روزانہ کے حساب سے خود کو یاد دلانی ہوگی۔ جہاں تک کسی کو یقین دلانے کی بات ہے تو سب سے پہلی بات یہ کہ دادی حیات ہیں۔ وہ خود کافی ہیں، دوسرے یہ کہ "سچ" بہرحال ایک ورتھ (قیمت) رکھتا ہے، اس کی حقیقت کو کوئی لاکھ جھٹلائے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اس لیے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ سب سے پہلے رمشہ کو یہ سچ بتاؤ، اس کے بعد تانیہ کو بتا کر اس سے صلاح مانگو، وہ یقیناً ایک بہت اچھی مشیر ہے۔ اور ہاں، پھوپھو کا گھر دو تین دنوں میں فارغ ہو جائے گا۔ میں تانیہ سے مشورے کے بعد ان کو وہاں شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔ تم کسی وقت تانیہ کو گھر لے آنا۔ میں اور ایلیا اس سے سیٹنگ وغیرہ کے متعلق ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کیا پرانا ماحول پیدا کرنا واقعی کچھ ہیلپ کرے گا۔ یا ہمیں کچھ اور سوچنا چاہیے۔"

"او کے۔ میں تانیہ کو جلد ہی آپ کے ہاں لے آتا ہوں۔ اور۔" وہ ذرا دیر کو رک کر مسکرایا "بڑے بھائی کے باقی مشوروں پر بھی عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"جی۔ یہ بہت ضروری ہے۔" مومن نے مصافحہ کرتے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اور جانے کی اجازت لے لی۔

☆☆☆

"پھوپھو کی طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے گھڑی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے امی کو دیکھا۔ انداز کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ گھر آتے ہی تین تین مریضوں کا حال پوچھنا پڑتا تھا اور اعصابی طور پر مومن خود کو بہت ڈھیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ روزانہ کا حال اگر آج کل وہ منصب سے شیئر نہ کر رہا ہوتا تو حالت شاید کچھ اور دگرگوں ہوتی۔ کھانا وہ منصب کے گھر سے کھا کر آیا تھا۔ اور اب چائے پی کر پہلے کچھ دیر ابو کے پاس بیٹھ کر ان کی طبیعت کا پوچھا تھا۔ اسلام آباد سے واپسی پر دواؤں اور تھراپی کی وجہ سے ان کی حالت بہت بہتری کی طرف مائل تھی۔ اب وہ باتیں کرنے کے دوران اٹکتے بہت کم تھے۔ چار پانچ لفظ تو بڑی روانی سے بول جاتے تھے۔ ہاتھ بھی اب ایک فٹ اوپر تک اٹھا لیتے تھے۔ انگلیوں کے اشارے پہلے کی نسبت زیادہ پختہ ہو گئے تھے۔ اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اب ان کی گردن ایک سائیڈ کو ڈھلکی نہ رہتی تھی۔ گردن کا تناؤ نائنٹی پرسنٹ واپس آ چکا تھا۔

وہ خود بھی اپنی طبیعت اور اپنے نئے علاج سے بہت مطمئن تھے۔ اور اب وہ مومن اور ندرت کی مدد سے لان میں چہل قدمی بھی شروع کر چکے تھے۔ ان کے ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ چند ماہ کے اندر وہ مکمل فٹ اور تندرست محسوس کریں گے۔ دوسرا نمبر رضوانہ پھوپھو کا ہوتا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں وسیلہ کے متعلق اچھی اچھی خبریں سناتا۔ آج کل وہ بھی اس بات سے خوش تھیں کہ وہ اپنے گھر میں واپس شفٹ ہونے والی تھیں۔ اس کے بعد وہ وسیلہ کے پاس بیٹھتا، لیکن وسیلہ سے صرف اس کی طبیعت کے متعلق بات ہوتی۔

تانیہ آج کل پورے انہماک سے ذہنی امراض کی اسٹڈی کر رہی تھی۔

وسیلہ کی چوٹ کے متعلق اسے پورا یقین تھا کہ وہ جلد کسی نتیجے پر پہنچ کر مشورہ دے گی کہ ایسے پیشنٹ کے ساتھ کس طرح ڈیل کرنا چاہیے۔

اور چوتھا آج کا اہم کام کامران کے پاس جانا تھا۔ وہ لوگ اگلے روز یہ گھر چھوڑ رہے تھے۔ مومن کو

pklibrary.com

اسی سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں۔ وہ پھوپھو کی طبیعت پوچھ کر کمرے سے باہر نکلا تو ایلیا چائے لیے سامنے آگئی۔ دن بھر کے بعد وہ اسے اب دکھائی دی تھی۔ گہرے مونگیا کلر میں وہ کوئی ساحرہ لگ رہی تھی، وہ زیادہ نہ سوچتے نظر چرا کر پھوپھو کے کمرے میں آگیا۔ ایلیا بھی ٹرے لیے وہیں آگئی۔ ندرت مامی بھی اس کی امی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ٹرے میں تین کپ تھے اس نے سامنے میز پر رکھ دیے۔ عابی اور ریاو ہیں میٹرس پر بیٹھے بلاکس سے کھیل رہے تھے۔ وہ چائے رکھ کر ان کے پاس جا بیٹھی۔

"وسیلہ کی چائے؟" ندرت مامی نے سوالیہ ایلیا کو دیکھا۔

"آپی نے کھانا لیٹ کھایا ہے مامی۔ اور ابھی میں گئی تو وہ سو رہی تھیں۔ جب جاگیں گی تو بنا دوں گی۔"

"اور تم؟" انہوں نے معلوم نہیں کیا پوچھا تھا۔ مومن نے امی کے سوال پر ایک نظر یونہی ایلیا کو دیکھا لیکن اس نے بنا کوئی جواب دیے سر جھکا لیا۔

"یہ تو چائے نہیں پیتی۔" امی نے ندرت کو یاد دلایا، وہ یہی سمجھیں کہ ندرت اس سے چائے کا پوچھ رہی ہیں۔

"نہیں، میں کھانے کا کہہ رہی ہوں۔ اس نے ہم سب کو کھانا دیا لیکن خود نہیں کھایا تھا۔"

"کیوں، ایلیا کھانا کیوں نہیں کھایا؟" رضوانہ بھی اسے تشویش سے دیکھنے لگیں جبکہ وہ بری طرح نروس ہوگئی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس موضوع پر بولا جائے اور مومن نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ وہ کھانے کے موضوع سے گریز کر رہی تھی۔ وجہ البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

"کیا بات ہے۔ کھانا کیوں نہیں کھایا؟" ایلیا جوں ہی اپنے کمرے میں گئی، وہ بہانا کر کے اُٹھتے فوراً اس کے پیچھے آیا، لیکن جواباً ایلیا نے بنا کچھ کہے خاموشی سے ایک نظر اسے دیکھا۔ جس پر مومن مزید چونکا۔ ایلیا کی نظر کچھ کہتی، کچھ جتاتی ہوئی سی لگی۔ جیسے کہتی ہو، خود یاد کریں۔ لیکن کیا۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بھی سمجھ نہیں پایا

"یار بتاؤ نا۔ کیا وجہ ہے؟" وہ پھر اس کے سامنے آگیا۔

"صبح آپ نے کیا کہا تھا؟" اس نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

"صبح۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ناشتے کے ٹائم۔ کچن میں؟"

"ہوں۔" وہ نیچے دیکھنے لگی۔

"یاد نہیں۔ صبح تو بہت ساری باتیں ہوئیں۔"

"آپ نے کہا تھا، آئندہ ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔" اس نے جھکے سر کے ساتھ یاد دلایا تو مومن نے بے ساختہ نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔ وہ تو منصب کے گھر سے کھانا کھا کر آیا تھا

"سوری یار۔ منصب نے روک لیا کھانے پر۔"

"اور آپ کو یاد بھی تو نہیں تھی اپنی بات۔" وہ شکوہ کر کے پلٹ گئی۔

"کیسے یاد ہوگی۔ ابھی آج پہلا ناشتہ ہی تو کیا ہے ایک ساتھ۔ عادت بناؤ گی تو بھولے گی ہی نہیں۔"

"جی!" وہ سعادت مندی دکھاتے فوراً تائید کرنے لگی۔ مومن نے کچھ دیر اس کی بے تکی مصروفیت کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے اُونچا کرتے اپنے سامنے سیدھا کھڑا کیا۔

"اتنا کنسرن دکھا کر میرے چین آرام کی دشمن نہ بنو۔"

"جی!" وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ جملہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔

"ابھی میں بہت اُلجھا ہوا ہوں، چاہوں بھی تو اپنی خواہشات کے لیے وقت نکالنا ممکن نہیں، وہ کیا کہتے ہیں۔"

"ابھی کچھ دن لگیں گے، خواب کو تعبیر ہونے میں۔" وہ مسکرایا۔

"میرے ساتھ ایسا ہی کچھ ہے، کتنی باتیں، کتنے انکشاف ہیں جو صرف تم سے شیئر کرنے کے ہیں۔ لیکن یہ سارا حسن فرصت مانگتا ہے، جو ابھی

میرے ذہن و دل کو بھی حاصل نہیں۔ جانتی ہو ایلیا۔" وہ اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو انگلی سے ہٹانے لگا۔ "اِن سب میں ایک بات ایسی ہے جو تمہیں حیران کردے گی، اور جسے بتانے کے لیے میں بہت بے تاب ہوں، لیکن کاش وہ وقت قدرت مجھے جلد نصیب کردے۔"

"جی مجھے اندازہ ہے۔ اور میں چاہتی ہوں آپ کی ہر پریشانی بانٹ سکوں۔"

"بانٹ ہی تو رہی ہو میری جان۔ پہلے دن سے اور کون ہے جس نے میرے بوجھ اپنے سر لیے ہیں۔"

"بوجھ کیسے؟" وہ اسے دیکھنے لگی۔

"میری اولاد، میری فیملی۔"

"نا۔" ایلیا نے بے ساختہ انگلیاں اس کے لبوں پہ رکھ کر روکا "نہ بچوں کو بوجھ سمجھتے ہیں، نہ فیملی کو۔ اللہ پاک ناراض ہوگا۔ پھر میں بچوں کے لیے اور آپ کی فیملی کے لیے پرائی تو نہیں تھی کہ" بات اس کے منہ میں رہ گئی اور مومن نے اسے ہلکا سا اپنی طرف کھینچا۔

"اور مومن۔ وہ کیا ہے تمہارا؟"

"ابھی نہیں۔" وہ مسکرائی تو ہونٹوں پر شرمیلی لیکن شرارتی سی ہنسی بھی تھی "میں بھی تب ہی بتاؤں گی، کیونکہ۔" وہ ذرا سا رکی "حیران کرنے کے لیے میرے پاس بھی کچھ ہے۔"

"اچھا۔؟ وہ گہری نظر سے دیکھنے لگا" پھر تو اُس خوب صورت وقت کو قریب لانے کے لیے محنت بھی ڈبل کرنی پڑے گی۔"

"ہوں۔ تو کیا اِسی لیے آپ نے عروبہ کو بلا بھیجا ہے؟ وہ ایک دم خفا ہوتے اس سے دور ہٹ گئی جبکہ مومن نے وہیں رُک کر اس نئی اچھوتی بات کو سوچا۔ اس نے امی سے کہا تھا کہ کل صبح کامران وغیرہ گھر فارغ کردیں گے۔ پھر عروبہ بچوں کو سنبھال لے گی اور ایلیا فیروزہ مل کر گھر صاف کریں گی۔ اب لگتا تھا امی نے یہی بات ایلیا کو بتائی تھی۔ لیکن یہ ایلیا۔ اس نے باہر جاتی ایلیا کو دروازے میں روکا۔"

"اے لڑکی۔ تم عروبہ سے جیلس ہوتی ہو۔ ہاں؟"

"وہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ تو میں کیا جیلس بھی نہیں ہوسکتی؟" وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"یہ کس نے کہا؟" وہ اب حیران تھا۔

"اور کس نے۔ آپ کی خالہ ہر بار کچھ نہ کچھ کہہ جاتی ہیں۔ اس روز کہنے لگیں، تمہیں بچے پالنا تو آتا نہیں تھا، صاف لگ رہا ہے مقصد کچھ اور تھا۔"

"خالہ نے ایسا کہا؟" اُسے یقین نہیں آیا۔

ایلیا نے تبصرہ نہیں کیا اور چپ کھڑی رہی۔

"اچھا، کہنے دو۔ جب میں مطمئن ہوں ہمارے بچوں کی طرف سے تو وہ کون ہیں فکریں لگانے والی۔"

"میں بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ مہمان بن کر جب دل چاہے یہاں آئیں لیکن آپ گھر کے معاملات میں کوئی احسان نہ لیا کریں۔ میں اور فیروزہ سب کچھ کرلیں گے۔ بچوں کو سنبھالنے کے لیے امی اور مامی ہیں نا۔"

"ٹھیک ہے زوجہ محترمہ، لیکن جب تک آپ سمجھائیں گی نہیں مجھے پتا کیسے چلے گا۔"

"اگر آپ مجھ سے بات کرتے تو میں رمشہ کا نام لیتی۔ وہ اتنی ناس، اتنی کوآپریٹو ہے کہ کہتی تم بچوں کا خیال رکھو میں اور فیروزہ گھر صاف کرتے ہیں۔"

"ہاں واقعی۔ مجھے بالکل خیال نہیں آیا۔"

"بس، تو آپ آئندہ میرے مشوروں پر ہی چلا کریں۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"حاضر جناب!" وہ ہلکا سا جھکا اور ایلیا بڑے دل سے ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ یہ بندہ تو کتنا اچھا ہوگیا تھا۔ سڑو بھی نہیں لگتا تھا۔ غصہ اور اکڑ بھی اب کہاں رہے تھے۔ ہلا کو تو سچ مچ مومن بن گیا تھا۔ وہ کھلکھلاتی ہوئی کچن میں داخل ہوگئی۔

☆☆☆

"کیا حال ہیں وسیلہ۔ طبیعت کیسی ہے؟"

تانیہ نے فیچ پلنگ کے کنارے رکھا اور آگے بڑھ کر وسیلہ سے مصافحہ کیا۔ آج وہ دو دن بعد یہاں

آئی تھی۔ وہ بھی ایک خاص مقصد کے تحت، بہت اچھی طرح کچھ پلان کر کے اور باقیوں سے مشورہ کر کے، منصب اور مومن کے ساتھ اس کی لمبی نشست ہوئی تھی۔ جس میں وسیلہ کے متعلق بہت کچھ ڈسکس اور طے کیا گیا تھا۔

تانیہ اب ڈاکٹر تانیہ کی حیثیت سے وسیلہ کا باقاعدہ علاج شروع کرنے والی تھی۔ اور آج جب رمشہ یہاں آنے والی تھی تو وہ بھی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ مومن سے پتا چلا کہ رضوانہ آنٹی کا گھر کرائے داروں سے خالی کرا لیا گیا ہے اور ان دنوں ایلیا وہاں کی کلیننگ اور سیٹنگ کر رہی تھی۔ تانیہ سے جب مشورہ کیا گیا تو اس نے یہی کہا کہ وسیلہ کی یہاں سے رخصتی کے وقت جیسی گھر کی ڈیکور اور سیٹنگ تھی، بعینہٖ وہی رکھی جائے۔ کیونکہ نہیں کہہ سکتے کہ کب کون سی بات وسیلہ کے دماغ کو ایسے چھو جائے کہ اسے پرانی ہر بات یاد آ جائے۔ اور یہیں ڈسکشن کے دوران تانیہ کے دماغ میں وہ اچھوتا آئیڈیا آیا تھا جس پر وہ ابھی وسیلہ سے بات کرنے والی تھی۔ رمشہ ایلیا کی طرف چلی گئی تھی اور وہ وسیلہ سے ملنے اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

''آ۔ آپ!'' وہ اُسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے دماغ پر زور دے رہی ہو۔

''میں تانیہ۔ آپ کو بتایا تھا نا۔ ہم یہیں پاس میں نئے آئے ہیں۔''

''جی جی۔ وہ ایک دوسری لڑکی بھی تھی۔'' وسیلہ یاد دلائے جانے پر شرمندہ ہوئی۔

''جی، اس کا نام رمشہ ہے۔ وہ بھی آئی ہے۔ اور آپ سنائیں۔ زخم تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک لگ رہا ہے۔'' وسیلہ نے اس کے پیر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اب ڈریسنگ بند کر دی تھی۔ اس کے حساب سے اب چوٹ والی جگہ کو اوپن رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

''اور سنائیں۔ وہ مومن بھائی آتے رہتے ہیں؟'' تانیہ نے محتاط قسم کا آغاز لیا۔ اُسے اب وسیلہ کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دینا تھا تاکہ پتا چلے کہ وہ اندر ہی اندر کیا سوچتی رہتی ہے اور کیسا محسوس کرتی ہے۔ یہ دیکھنا بھی بہت ضروری تھا کہ آیا اس کی کیفیت اب تک وہی ایک سی ہے یا ہر بدلتے دن کے ساتھ مختلف ہوتی رہتی ہے۔

''جی بس ان کا وہی ہے۔'' وسیلہ نے عجیب ناگواری کا منہ بنایا ''آتے تو ہیں لیکن مجھے یہاں سے نکالنے کی بات نہیں کرتے۔''

''نہیں وسیلہ۔ ایسی بات نہیں ہے، بس مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ویسے میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ کل میں اور رمشہ میامدم جا رہی ہیں تو ہم کوشش کریں گے کہ آپ کو بھی یہاں سے نکال لے جائیں۔''

''اچھا، سچ!'' وسیلہ ایک دم پلنگ سے اُٹھ گئی۔ ''ایسا ہو سکتا ہے تانیہ؟''

''آپ دعا کریں وسیلہ! کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں۔ آپ بس تیار رہنا۔'' تانیہ نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت وسیلہ کو اپنا پلان بتایا اور وسیلہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''میں بہت خوش ہوں تانیہ! اور میں آپ کو اپنی امی اور بہنوں سے ملواؤں گی۔ آپ۔'' وہ ذرا سا رُکی ''آپ وہاں مجھ سے ملنے آئیں گی نا؟''

''ہاں بالکل۔ ضرور آؤں گی۔ آپ کی امی اور بہنوں سے ملنے کا مجھے بھی بہت شوق ہو رہا ہے۔ کیا نام ہیں آپ کی امی اور بہنوں کے؟'' تانیہ نے بنا سوچے یونہی پوچھ لیا۔

''ہاں۔ امی!'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی ''آں..... مجھے آتا ہے.....'' اس نے جیسے وقت مانگا۔ اور سوچنے بھی لگی لیکن ذہن پہ زور دینا جیسے تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے تانیہ کی طرف دیکھا تو چہرے پر مایوسی سی تھی۔

''شاید میں بھول رہی ہوں، اور بہنوں کے نام۔'' وہ پھر سوچنے لگی۔ اور اس بار چہرا ہاتھوں میں دیے رونے ہی لگ گئی۔

''مجھے اُن سب کے نام کیوں بھول گئے۔''

''ارے کوئی بات نہیں وسیلہ..... آپ آج کل دوائیں لے رہی ہیں نا..... تو حالت ایسی ہی نیند اور

سکون والی ہو جاتی ہے...... ایسے میں یہ نارمل ہے۔ اٹس او کے۔"

تانیہ نے فوراً دل میں ارادہ کیا کہ اب وہ ایسے حساس سوال ہرگز نہیں پوچھے گی۔ اُسے اب وسیلہ سے معمول کی عام گفتگو کرنی تھی جس سے وہ اچھا اور بہتر محسوس کر سکے۔

"میں منصب کو کال کرتی ہوں، انہوں نے ہمیں لینے آنا تھا۔"

"منصب!" وسیلہ نے زیرلب دہرایا تو تانیہ نے موبائل اُٹھاتے چونک کر وسیلہ کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے ذہن پر زور دے رہی تھی۔

"وہ جو اس دن وردی میں آئے تھے۔ مومن بھائی کے دوست۔" تانیہ نے یاد دلانے کی کوشش کی تو وسیلہ کو بھی یاد آ گیا، مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"وہ رمشہ کے بھائی بھی ہیں نا!" تانیہ نے مزید بتایا۔

"تو۔ وہ نہیں جائیں گے میاندم؟"

"آں۔ وہ۔" تانیہ نے جیسے سوچنے کا وقت لیا "ارے نہیں، یہاں تو وہ کسی کام سے آئے ہوئے تھے۔ وہ تو میاندم پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر ہیں۔ شاید وہی ہمیں لے کر جائیں۔"

"میں بہت خوش ہوں، میاندم جانے کے لیے۔" وہ بچوں کی طرح نہ صرف فوراً چہکی بلکہ خوشی سے اس کی پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ تانیہ کا دل موم کی طرح پگھلا — وسیلہ کی مکمل صحت یابی کے لیے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ اور اس وقت تانیہ کو حقیقتاً اپنی کامیابی سے کہیں زیادہ وسیلہ کے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی تھی۔

وہ معصوم پری سی لڑکی خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کتنی اذیت جھیل رہی تھی اور نہ جانے اس حال کو پہنچتے کتنا کچھ اور بھی سہہ چکی تھی۔

☆☆☆

مومن گھر میں داخل ہوا تو ہر طرف عجیب سی گہما گہمی نظر آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سامنا رمشہ سے ہوا۔ وہ ریبا کو اٹھائے یہاں وہاں ٹہل رہی تھی۔

مومن الٹے قدموں باہر نکلا۔ وسیلہ کی طرف آیا تو وہاں تانیہ کو بیٹھے دیکھا۔ امی کے کمرے میں پھوپھو اور امی جانی کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ نہیں دکھائی دی تھی تو وہ آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا قرار۔

وہ بابا کو سلام کر کے کچھ دیر ان سے بات چیت کر کے باہر نکلا اور درمیانی دروازے سے پھوپھو کے گھر میں داخل ہوا۔ کامران وغیرہ پچھلے روز ہی گھر خالی کر کے جا چکے تھے۔ پورچ تک دھلا ہوا گیلا فرش بتاتا تھا بیگم صاحبہ بجی جان سے کام میں لگی ہیں۔ پچھلی رات وہ کہہ رہی تھی، فیروزہ کے ساتھ مل کر صفائی کرے گی۔ وہ محتاط انداز میں چلتا اندر داخل ہوا۔ بڑا کمرا بھی صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کچن میں جھانکا، کوئی دکھائی نہیں دیا۔ باری باری تینوں کمرے دیکھے، وہ بھی خالی ملے۔ واش روم بھی کھلے تھے۔ پتا نہیں وہ دونوں کہیں نظر کیوں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اب کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔

پھوپھو کے گھر کا ایک ہی سامنے کا صحن اور پورچ تھا۔ باقی سب بلڈنگ ایریا تھا۔ وہ آخری کمرے سے نکل کر واپس جانے والا تھا جب کھٹکے کی آواز پر چونکا۔ کمرے کے دائیں ہاتھ کونے میں اسٹور روم تھا، آواز وہاں سے آئی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ دونوں یقیناً وہیں تھی گی۔ وہ اسٹور روم کے دروازے میں آیا۔ کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ اس نے حیرت سے اندر جھانکا۔

"ایلیا...... تم ہو یہاں؟"

"آ۔ آپ......" نیم تاریکی میں ایلیا کی گھبرائی سی آواز سنائی دی۔ وہ پورا اندر داخل ہو گیا۔ باہر سے جتنی روشنی آ رہی تھی، اسی میں نظر آیا کہ ایلیا وہاں اکیلی کھڑی تھی۔

"تم اکیلی ہو یہاں؟" وہ قریب آیا "وہ فیروزہ کہاں ہے؟"

"جی وہ بارہ بجے گھر چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کے لیے کھانا بنانا تھا۔ کہہ رہی تھی تین

بجے تک واپس آجائے گی۔"

"تو یار! تم بھی گھر آجاتیں۔ اکیلی کیا کر رہی ہو؟"

"وہ ہم نے سارا گھر صاف کیا تو بہت سارا فالتو سامان یہاں اسٹور روم میں رکھنے کا تھا۔ میں یہاں آئی تو دیکھا، بلب فیوز ہے۔

میں نے سوچا۔ فیروزہ کے آنے سے پہلے بلب لگا لوں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا بلب سامنے کیا۔ مومن نے دیکھا کہ ایک اونچا لیکن قدرے کمزور سا اسٹول بھی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور جس پر یقیناً اب وہ چڑھنے والی تھی۔

"اکیلے میں کوئی الٹا سیدھا کام مت کیا کرو۔ لاؤ ادھر دو۔" اس نے ہاتھ آگے کیا تو ایلیا نے بلب مومن کی طرف بڑھایا۔

"اور۔ تم تو گیلی بھی ہو۔" مومن کے ابرو تن گئے۔ ایلیا کی آستین سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے نیچے دیکھا۔ پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے۔

"پاگل ہو ایلیا۔" وہ اسے غصے سے دیکھ رہا تھا "تم اس بھیگے حلیے میں بجلی کا کام کرنے والی تھیں۔ کرنٹ لگ سکتا ہے۔ پھر یہ ہلتا جلتا اسٹول۔ اگر تم اس سے گر جاتیں۔ چیخ مارتیں تو آواز بھی کوئی نہیں سن سکتا۔ حد ہے لاپروائی کی۔" وہ بلب کو بستروں کے اونچے ڈھیر پہ پھینک کر غصے سے باہر نکل گیا اور ایلیا کو مدت بعد وہ مومن یاد آیا جو اس کی الٹی سیدھی حرکتوں پر بری طرح چڑ جایا کرتا تھا۔ وہ سخت پشیمان ہوئی۔

مومن تو پھر سے بدل گیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی حالات بدل رہے ہیں، خیالات بدل رہے ہیں۔ زندگی نجانے کیا سے کیا ہونے والی ہے۔ اور۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ مومن تو پرانی ایلیا کو دیکھ کر پھر سے مایوس ہو گیا۔ وہ بہت ہی ڈرتے ڈرتے اسٹور روم سے باہر نکلی۔ مومن دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔

"سوری۔" اس کے منہ سے بڑی دقت کے ساتھ فوری طور پر بس یہی نکل سکا۔ اب غصے بھرے مومن کے سامنے اور کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے سارے پرانے کرتوت یاد آ رہے تھے جنہوں نے ہمیشہ ہی مومن کو اتنا تپایا تھا کہ وہ اس کی صورت تک دیکھنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

"سوری؟" وہ کہتے ہوئے پلٹا تو لہجہ انتہا کا تلخ تھا۔ "بس ایلیا..... صرف سوری....." وہ اس کا بازو کھینچ کر سامنے کھڑا کرتے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں کچھ ہو جاتا تو اس سوری کی نوبت بھی نہ آتی۔ اور میرے بارے میں سوچو۔ کیا میں تمہیں کچھ ہوتا دیکھ سکتا ہوں۔ کیا اب میں کوئی نقصان افورڈ کر سکتا ہوں۔ اینٹ، پتھر یا لوہے کا کچھ رکھا ہے؟" اس نے ایلیا کا بازو جھٹکا۔ "کب تک برداشت کروں اور کیا کیا برداشت کروں۔"

"پلیز مومن۔ معاف کر دیں۔ میں آئندہ۔" وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"آئندہ ایسا کچھ ہونا بھی نہیں چاہئے ایلیا!" وہ اسے قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "ہمارے حالات پہ غور کرو اور ذرا میری حالت کا اندازہ لگاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بابا کو، پھوپھو کو، وسیلہ کو۔ کیسے چٹکی بجاتے پہلے جیسا کر دوں۔ حل ڈھونڈنے بیٹھتا ہوں تو مجبوریاں، رکاوٹیں پہاڑ جیسی سامنے آئی کھڑی ہوتی ہیں۔ ایسے میں بس بچے، امی اور تم جنہیں دیکھ کر لفظ "سکون" سے پہچان ہوئی ہے۔ میری مشکلیں مت بڑھاؤ۔"

"سچ میں یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی، آپ بلاوجہ۔" وہ اپنی طرف سے شاید تسلی دینا چاہتی تھی لیکن مومن نے اسے کھینچ کر اپنے مقابل کھڑا کیا پر، یوں کہ آنکھوں میں، چہرے پر ابھی تک درشتی تھی۔

"بلاوجہ نہیں ایلیا۔ میرا یہ غصہ، یہ وہم بلاوجہ نہیں ہیں۔ ابھی پچھلے روز تمہیں بتایا کہ میرے پاس کچھ ہے تمہیں حیران کرنے کے لیے۔ سوچا تھا وہ بات کسی بہت خوب صورت لمحے میں بتانے کی ہے۔ لیکن مجھے تو شاید موقع محل بھی راس نہیں آتا۔ ابھی آج ایسی سچویشن میں بتانا پڑ رہا ہے۔" اس نے ایک آہ بھری۔

"تمہارے لیے میری پریشانی، میرے وہم اور یہ کنسرن جانتی ہو کیوں ہیں؟"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایلیا کے لیے تو اور کہیں دیکھنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

"تم سمجھتی ہو، مومن کو محبت ہوئی ہے تم سے۔ ہے نا؟" اس نے تائید چاہی "غلط نہیں سمجھتیں..... یہ سچ ہے مجھے محبت ہوئی ہے، لیکن تم نہیں جانتیں ایلیا کہ مومن احمد کو زندگی میں پہلی بار محبت ہوئی ہے۔ سن رہی ہو۔ پہلی بار۔"

اس نے ایلیا کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھایا۔ اور وہ سن تو رہی تھی لیکن سمجھ واقعی نہیں پا رہی تھی۔ تب ہی تو چہرے کا ایکسپریشن ہی نہیں بدلا، وہ اُسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مومن نے بہت قریب سے کچھ دیر جی بھر کر اس کی شکل کو دیکھا، پھر بے ساختہ ہنس دیا۔

"جاؤ ایلیا..... اور اِس بات پہ پوری رات لگا کر غور کرو۔ اسے سمجھو۔ اور جب لگے کہ ہضم ہو گئی ہے تب میں آگے کچھ بتاؤں گا۔" وہ جو خود اپنی کیفیت سے ہمتوں ہوئے بولا یا بولایا پھر رہا تھا۔ آج ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرتے واپس پلٹ گیا۔ اور ایلیا اپنے کانوں میں کچھ نئی نئی دھنوں کی گھنٹیاں سی بجتی سننے لگی۔

☆☆☆

"مومن بالکل صحیح کہہ رہا ہے منصب۔ تمہیں اب وہاں رہنا چاہیے۔ تم چاہے سمجھو یا نہیں لیکن رضوانہ آنٹی، تمہاری بہن، وہ گھر سب کچھ اب تمہاری ذمہ داری ہیں۔"

"اور وسیلہ؟" منصب نے اپنی بھاری پلکوں کا بوجھ ہلکا سا اوپر اٹھایا۔

"مانتی ہوں، ذرا الجھی ہوئی صورت حال ہے لیکن فی الحال تم مومن کی مشکلات پہ غور کرو۔ وہ اس وقت بہت اکیلا پڑ رہا ہے۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میمونہ کل آ رہی ہے نا۔ تو پہلے بہنوں کو بتاؤ۔ اور پھر وہاں۔ ہم سب مل کر بتاتے ہیں۔"

"اور دادی؟" منصب نے سوالیہ ایک نظر ہی دیکھا اور تانیہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی۔

"تو تمہیں لگتا ہے، ان کی موجودگی بھی ضروری ہے؟"

"صرف ضروری نہیں تانیہ۔ یہ ساری بات کہنی ہی انہیں چاہیے۔ ساری بحث، اگر مگر، لیکن ویکن، اپنے آپ سمٹ جائیں گے۔"

"تو پھر؟ کیا لگتا ہے یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں بہت دنوں سے اس سب پر سوچ رہا ہوں۔ دادی وہاں حویلی میں ویسے بھی بڑا مشکل وقت کاٹ رہی ہیں۔ میں میمونہ اور انیس سے کہتا ہوں کہ وہ آنے سے پہلے دادی کو لینے حویلی جائیں۔ اور اگر وہ نہ آنے دیں تو ایس آئی شفقت کی مدد لی جائے۔ میمونہ دادی کو سمجھائے کہ وہ خود پولیس میں بیان دیں کہ وہ اپنی بیمار پوتی سے ملنے جانا چاہتی ہیں اور انہیں جانے نہیں دیا جا رہا۔ ان کے خلاف تو ویسے بھی رپورٹ درج ہے۔ اِدھر وسیلہ کے بیان کا سب کو انتظار ہے۔ میں اس سارے معاملے کو خود دیکھ کر دادی کو بلواتا ہوں۔ اور پھر جانے بھی نہیں دوں گا۔ وہ یہیں رہیں، ہمارے پاس۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔"

"ارے تم لوگ اُٹھو بھی۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ وہاں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" رمشہ کچھ شور ڈالتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو وہ دونوں بھی چونکے۔

"ہاں بالکل۔ شام تو ہونے والی ہے۔ اور یہی ٹائم طے ہوا تھا۔" تانیہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی، پھر منصب کو دیکھا "تم وردی پہن لو۔ یاد ہے نا وہ سب؟"

"ہاں، سب یاد ہے، اور باقی باتیں راستے میں دہرا لیں گے۔" منصب بھی عجلت میں اُٹھا۔

"بس اب دعا ہے کہ اس سب کا اچھا اثر پڑے۔ اور شاید اسے کچھ یاد آ جائے۔" تانیہ کا لہجہ معلوم نہیں کیوں لیکن منصب کو کچھ بجھا بجھا سا لگا۔

"تم کچھ مایوس سی کیوں لگ رہی ہو؟" منصب اسے بغور دیکھتے وہیں رک گیا۔

"اس لیے کہ یہ کوششیں ایک حیلہ ضرور ہیں منصب۔ لیکن مجھے وسیلہ کی ذہنی حالت ابھی اتنی

اسٹیبل نہیں لگتی۔ شاید یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن خیر ہم نے ہمت نہیں ہارنی۔"

"ہاں اور فی الحال ہمیں بس یہی یاد رکھنے کی ضرورت ہے، کہ ہمت نہیں ہارنی۔ اور مجھے لگتا ہے تم وسیلہ کی ذہنی حالت سے زیادہ اپنی ذمہ داری کے حوالے سے نروس ہو۔" منصب نے صاف گوئی سے تجزیہ کیا جس پر تانیہ شرمندہ سی ہنس پڑی، کیونکہ بات یہی تھی۔ اُسے یہ چیلنج اپنی اہلیت کے حساب سے بہت بڑا لگ رہا تھا۔ بہرحال وہ اللہ پاک کی ذات سے مایوس نہ تھی۔

☆☆☆

"اُٹھو وسیلہ۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔"

نیم تاریک اُس تہہ خانے کی قید میں آج یہ کس کی آواز تھی جو اُسے موت سے زندگی کی طرف کھینچتی سی محسوس ہوئی تھی۔ وسیلہ سوتے سے اُٹھی تو ڈھیلے جوڑے میں بندھے بال بکھر کر کندھوں پر آ گئے۔

"کون؟" وہ اپنی آنکھیں پوراز ور لگا کر کھول رہی تھی۔

"میں ہوں تانیہ۔ میرے ساتھ رمشہ ہے۔ اور باہر اے ایس آئی منصب رضا بھی ہماری مدد کرنے کے لیے ریڈی کھڑے ہیں۔" تانیہ کی آواز سرگوشی جیسی تھی اور وہ محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے اسے اپنا پلان بتا رہی تھی۔

یہ پلان تانیہ نے منصب اور مومن کے ساتھ مشورے کے بعد بنایا تھا۔ وسیلہ نے جب اس سے کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس میاندم جانا چاہتی ہے تو انہیں پہلی مرتبہ سمجھ میں آیا کہ وسیلہ اِس جگہ کو کچھ اور سمجھ رہی ہے اور جو جگہ بھی سمجھ رہی ہے اس سے خوش بالکل نہیں ہے اور یہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ تب تانیہ نے مشورہ دیا کہ جب ان سب نے مومن کے گھر سے رضوانہ آنٹی کے گھر شفٹ ہونا ہی ہے تو وسیلہ پر یہ ظاہر کیوں نہ کیا جائے کہ اسے اس ناپسندیدہ مقام سے اس کے گھر، اس کے میاندم لے جایا جا رہا ہے۔ اور اب وہ سب اسی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔

"کیا کرنا ہے؟" وسیلہ اب مکمل بیدار ہو چکی تھی اور تانیہ کو پہچان بھی چکی تھی۔

"ہم تمہیں میاندم لے جانے آئے ہیں۔" تانیہ نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"باہر کوئی نہیں ہے؟" وہ خوف زدہ نظروں سے تانیہ کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں وسیلہ۔ فی الحال تو باہر کوئی نہیں ہے۔ تم بس دیر مت کرو۔ ہمیں ابھی کے ابھی نکلنا ہے۔" تانیہ نے اُسے کندھے سے پکڑ کر اٹھنے میں مدد دی اور اُسی وقت دروازے سے رمشہ نے اندر جھانکا۔

"جلدی کرو۔ منصب انتظار کر رہا ہے۔" اس کی آواز بھی مدھم تھی۔

وسیلہ کے قدموں میں خود بخود تیزی آئی۔ وہ بے چاری لڑکیاں خطرہ مول لے کر اس سے ہمدردی کر رہی تھیں۔ اس نے بھی فوراً پیش قدمی کی، حالانکہ تیزی کے ساتھ اُٹھنے سے سر میں درد کی شدید لہر اُٹھی تھی لیکن وہ سر پر ہلکا سا ہاتھ رکھتے باہر نکل آئی۔ باہر بھی اندھیرا تھا۔ تانیہ اور رمشہ اسے سیدھا گھر سے باہر نکال لائیں۔ اندھیرے میں کچھ ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے ایک جیپ میں لا کر بٹھا دیا گیا۔

"چلیں؟ ایک مردانہ آواز پر وسیلہ نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہ منصب تھا۔ اپنی فل وردی میں ملبوس۔ دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں ملیں، وسیلہ کی آنکھوں میں مسکراہٹ کے ساتھ تشکر اُبھرا اور پھر اس نے پلکیں موند لی تھیں جبکہ منصب مارے دکھ اور شرمندگی کے مسکرا بھی نہیں سکا۔ وسیلہ کی حالت ہمیشہ ہی اسے پچھتاووں میں گھیرنے لگتی، اور پھر وہ پہروں خود کو اس درد سے نکال نہیں پاتا تھا۔

اُس نے خاموشی سے جیپ آگے بڑھائی اور اب اُسے میاندم کا ایک خوب لمبا چکر کاٹ کر وسیلہ کے گھر داخل ہونا تھا۔ مومن نے اس دوران رضوانہ

پھوپھو، امی اور ایلیا کو دوسرے گھر بھیجا۔ وہاں کی سیٹنگ تانیہ کے مشورے کے مطابق بالکل پرانے انداز کی رکھی گئی تھی۔ رضوانہ تو اس قدر حواس باختہ تھیں کہ انہوں نے کپڑے بھی وہی پہن لیے جن میں وسیلہ نے انہیں آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ اور یہ سارا پلان تانیہ نے بنایا تھا۔ وسیلہ چونکہ ابھی تک اپنی ماں اور بہنوں کو پہچان نہیں پائی تھی اور ان سے خوف زدہ رہتی تھی تو یہ سوچا گیا کہ کیا پتا اپنا گھر یاد آنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی امی اور بہن بھی یاد آجائیں

منصب نے ایک نظر پیچھے پلٹ کر دیکھا، گھر نزدیک آنے والا تھا اس لیے تانیہ نے وسیلہ کو آنکھیں کھولنے کو کہا، وہ اسے بتا رہی تھی کہ ہم میاندم پہنچ گئے ہیں۔ اور گھر آنے والا ہے۔ بیک ویو مرر میں نیم تاریکی کی وجہ سے منصب کو وسیلہ کے تاثرات تو دکھائی نہ دے رہے تھے لیکن وہ دل سے دعا گو ضرور تھا کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

☆☆☆

''وہ..... رو رہی ہیں.....'' ایلیا کھڑکی سے کچھ جھانک کر پلٹی تو مومن سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''ایک منٹ یار۔ آرام سے۔'' مومن نے پھر کندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ اب تو اسے لگنے لگا تھا جیسے زندگی کا مقصد ایلیا کو گرنے سے بچانا ہے۔ جب دیکھو وہ کہیں نہ کہیں اوندھی گری ملتی۔

''آپی!'' اس نے آواز نیچی کرتے مومن کو آستین سے پکڑ کر کھڑکی سے دور کھینچا ''تانیہ انہیں ان کے کمرے میں یہ کہہ کر بٹھا آئی تھی کہ اب وہ میاندم میں اپنی امی کے گھر میں ہے اور بالکل محفوظ ہے۔ ''ہم نے کچھ دیر کے لیے انہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ اپنے کمرے کی چیزوں کو دیکھیں اور پہچانیں۔ لیکن آپی تو رو رہی ہیں۔''

''ہوں۔ تو میرا خیال ہے کہ تانیہ کو ہی کمرے میں بھیجتے ہیں۔ وسیلہ صرف اسی کو بتا سکتی ہے کہ اسے کیا مسئلہ ہے۔'' مومن فوراً پلٹ کر بڑے کمرے میں آیا اور تانیہ کو صورت حال بتائی۔

''اللہ کرے سب خیریت ہو۔'' رضوانہ کا تو سن کر ہی چہرا اتر گیا۔

''پریشان نہ ہوں آنٹی۔ کیا پتا وہ ایموشنل ہوگئی ہوں۔'' رمشہ نے تسلی دینے کی کوشش کی، حالانکہ اندر سے دل بہت ڈر گیا تھا۔ تانیہ اس دوران کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''ارے وسیلہ۔ کیا ہوا آپ کو؟'' تانیہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ وہ چہرا ہاتھوں میں چھپائے بہت شدت سے رو رہی تھی۔

''مجھے یہاں سے لے چلیں تانیہ۔ پلیز۔ آپ مجھے اپنے گھر لے جائیں یا کم از کم کسی ہاسپٹل ہی چھوڑ دیں۔ یا۔'' وہ ایک دم بوکھلائی ہوئی سی تھی۔ تانیہ نے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔

''اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ جہاں آپ کہیں گی، وہیں لے جاؤں گی۔ لیکن پہلے مجھے اپنے رونے کی وجہ تو بتائیں۔''

''آ۔ آپ نے کہا تھا، آپ مجھے میاندم لے جا رہی ہیں، میری امی کے گھر۔ تت۔ تو پھر وہ سب عورتیں یہاں کیوں آگئی ہیں۔ وہ سب میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہیں۔ مجھے اُن سے نجات کب ملے گی۔ ملے گی یا نہیں؟''

وسیلہ کے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔ گلے سے ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز اس کی بات کو لگاتار بیچ بیچ میں انکائے جا رہی تھی۔ تانیہ کا دل اس کی بات سنتے ہی بجھ سا گیا۔ تو اُن کا پہلا پلان ناکام ثابت ہوا تھا۔ وسیلہ باوجود اپنے گھر آجانے کے اپنی فیملی کی پہچان نہیں کر پائی تھی۔

''وسیلہ! یہ آپ کی امی، مامی ندرت اور بہن ایلیا ہی ہیں۔ آپ پلیز ذرا اپنے ذہن پہ زور دیں۔'' تانیہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی لیکن وہ جواباً تانیہ کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی دماغی حالت پر شک کر رہی ہو۔

''آپ نہیں جانتیں تانیہ!'' وسیلہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ''آپ یہاں نئی آئی ہیں نا۔ ضرور ان لوگوں نے جھانسا دینے کے لیے آپ کے ساتھ غلط

بیانی کی ہے۔ یہ میری امی وغیرہ نہیں ہیں۔"

"تو یہ کون عورتیں ہیں وسیلہ؟" تانیہ نے سوچا آج پوچھ ہی لے کہ آخر وہ اِن سب سے کیوں اتنا ڈرتی تھی۔

"یہ!" وسیلہ ایکدم کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ایک بند حبس زدہ کمرا یاد آیا۔ سفید آنکھوں والی ایک عجیب سی عورت، اپنا بے ہوش ہو کر گرنا، ایک موٹی تازی عورت کا اسے سیڑھیوں جیسی جگہ سے دھکا دینا، ایک تیز چبھتی آنکھوں والی عورت کا اس پر چیختا چلانا۔ "لیکن۔" وسیلہ نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ "وہ سب عورتیں کون تھیں۔ اور کیا چاہتی تھیں۔ ان کے نام کیا تھے۔ ان سے وسیلہ کا رشتہ کیا تھا اور دشمنی۔" وسیلہ نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اسے چند دھندلے مناظر کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

"وسیلہ! آپ کا شوہر کہاں ہے؟ تانیہ کو اچانک ایک خیال آیا۔ بہت دن پہلے مومن نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ وسیلہ سے ارحم کے حوالے سے اب تک کوئی سوال نہیں کیا گیا۔

"شوہر؟" وہ حیرت سے تانیہ کو دیکھنے لگی پھر ایک دم سے ہنس پڑی "آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے، میری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔"

"تو۔ ارحم؟" تانیہ نے تھوڑا رک کر بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"ارحم؟" وسیلہ نے ماتھا سکوڑ کر کچھ دیر سوچا۔ اس نے تو یہ نام ہی پہلی بار سنا تھا۔

"کون۔ ارحم؟" وہ خالی خالی نظروں سے تانیہ کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں شاید میں ہی بھولتی ہوں۔" وہ اس کے کندھے پر نرم سی تھپکی دیتے مسکرا پڑی۔ اسی وقت مومن نے کمرے میں جھانکا۔ منصب بھی ساتھ تھا۔

"کیا ہوا وسیلہ۔ سب خیریت ہے؟" مومن نے نہایت نرم لہجے میں کہتے قریب آنے کی کوشش کی لیکن وسیلہ نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ مومن نے سوالیہ نظر تانیہ پر ڈالی، جس پر وہ اپنی جگہ سے اُٹھتے باہر کو کھسک گئی۔ اسے مومن کو کچھ بتانا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وسیلہ کے سامنے نہیں۔ مومن نے بھی فوراً پیش قدمی کی۔

باہر آ کر تانیہ نے وسیلہ کی باتیں مومن کے سامنے دوہرا دیں۔

"مجھے لگتا ہے مومن بھائی۔ وہ آپ پر اس لیے غصہ ہے کہ آپ ان سب عورتوں کو یہاں ساتھ کیوں لائے ہیں۔ اس نے ابھی تک اپنی امی وغیرہ کو نہیں پہچانا۔"

"ہوں!" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ہاتھ کمر پہ رکھے "اب اس کا کیا کریں۔"

"میں کچھ کہوں؟" منصب اسی وقت کمرے سے باہر نکلا، دونوں حیرت سے پلٹے۔

"آپ دونوں کے باہر نکلتے ہی وسیلہ نے مجھے روک لیا۔ اور کہنے لگی کہ میں اس کی مدد کروں، اس نے مجھے بھی یہی ساری بات بتائی اور کہا کہ میں اِن تین عورتوں کو کسی طرح اس گھر سے نکال دوں۔"

"اوہ۔ تو اب کیا کہیں وسیلہ سے؟" مومن کے چہرے پر تشویش لہریں لے رہی تھی۔

"میں تو کہہ آیا۔" منصب نے لب بھینچ کر کچھ ہچکچاتے ہوئے مومن کو دیکھا۔

"کیا؟" تانیہ آگے بڑھی۔

"میں نے وسیلہ سے کہا کہ ہم اِن عورتوں کو جان بوجھ کر ساتھ لائے ہیں، کچھ دن ہم انہیں اپنے ساتھ رکھیں گے، اِن پہ نظر رکھیں گے اور پھر جیسے ہی انہوں نے کوئی مشکوک حرکت کی، ان کو پکڑ کر بند کر دیں گے۔ لیکن اس دوران ہم ان سے نارمل رویہ رکھیں گے تاکہ ان کو کچھ شک نہ ہو۔ اور اب پتا نہیں کہ یہ سب ٹھیک ہوا یا غلط۔ لیکن۔"

"بالکل صحیح۔" تانیہ پرجوش ہوئی "اس طرح ہمیں ان تینوں کو کہیں چھپانے اور وسیلہ سے دور کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

"لیکن وہ ان سب سے ڈرتی تو اسی طرح رہے گی نا۔" مومن کچھ مطمئن نہیں تھا۔

"تو پھر یہ اے ایس آئی صاحب ہیں نا۔"
"تانیہ مسکرائی "انہیں لے آئیں یہاں کھینچ کر۔"
"ہاں، اب تو لانا ہی پڑے گا۔" مومن بھی ہنس دیا "اب ڈرامہ رچایا ہے تو ڈائریکٹ بھی خود کریں۔"
"لیکن۔"
"لیکن ویکن کچھ نہیں منصب۔ اب دادی آرہی ہیں تو ہر بات یوں بھی کھلنے والی ہے۔ تم رمشہ اور دادی سمیت یہاں آجاؤ۔ یہاں صرف وسیلہ اور پھوپھو ہیں، دادی اور رمشہ کی وجہ سے وسیلہ گھر میں آزادی سے گھومنا پھرنا کر سکے گی۔ تانیہ وغیرہ اسے میانہ گھمانے لے جایا کریں گی تو اس کا ذہن بہت کچھ سوچنے پر خود بخود مجبور ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام ایلیا نہیں کر سکتی۔"
"میرے لیے تو رمشہ کو بتانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔"
"میں ہوں نا۔ دادی آجائیں پھر میں اور وہ مل کر سمجھالیں گے۔ فی الحال کے لیے ایک چھوٹی سی کامیابی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ وسیلہ اس گھر کو گھر سمجھنے لگی ہے۔ ورنہ آپ کے گھر میں وہ جس کمرے میں تھی، اس سے بھی ناخوش تھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سوچ اس کے اپنے دماغ کے لیے بھی بہت دباؤ کا باعث رہی ہوگی۔"
"ہاں یہ واقعی ایک اچھا سائن ہے۔ اور اب جلد از جلد اس کے آس پاس کچھ نئے چہروں کو لانا بہت ضروری ہے جن سے وہ کسی بھی حوالے سے خوف زدہ نہیں ہے۔"

☆☆☆

عابی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس رات مومن کی سوچیں کئی ان دیکھی گرہوں میں الجھی تھیں۔ دماغ آج کل بیک وقت کئی اطراف میں دوڑتا رہتا۔ اور لگتا ہر سمت آگے بند دیوار سے جا ٹکرائی ہے۔ عابی کب کا سو چکا تھا۔ ریبا کو ایلیا نے نیچے میٹرس پر سلا دیا تھا۔ اور اب وہ امی اور وسیلہ کو دیکھنے ساتھ والے گھر گئی تھی۔ دروازے کی آہٹ پر مومن نے سر اٹھایا تو ایلیا آہستہ قدموں سے چلتے اندر آرہی تھی۔ مومن کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ وہ بچوں کی نیند کے خیال سے احتیاط کر رہی تھی جبکہ بچے اب گہری نیند میں جا چکے تھے۔
"وسیلہ سو گئی؟" اس نے قریب آنے پر ایلیا کی طرف دیکھا۔ وہ جھک کر عابی کے تکیے درست کر رہی تھی۔
"جی۔ آپی سو چکی تھیں۔ اور امی اب سونے لگی تھیں۔" وہ عابی کی جگہ سیٹ کر کے پلٹنے لگی تھی۔
"سنو۔" مومن کی آواز میں بلا کی نرمی تھی۔ وہ چونک کر مڑی۔
"عابی کو وہاں ریبا کے پاس نیچے سلا دو۔"
"جی؟" وہ سمجھ نہیں پائی۔
"ہوں۔ اسے وہاں سلا کر تم یہاں میرے پاس آؤ۔"
"مم۔ مم۔" ایلیا کا حلق سیکنڈز میں خشک ہوا۔ وہ اپنی ہکلاہٹ پر قابو پانے میں بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ مومن نے اگنور کر کے سر اثبات میں ہلایا۔
"ہاں۔ اسے وہاں سلا کر واپس آؤ۔" اس نے نیم دراز ہوتے ہوئے دونوں بازو سر کے پیچھے باندھے اور ایلیا میں بھلا کہاں ہمت تھی کہ مزید کچھ پوچھتی۔ جھک کر عابی کو اٹھاتے نیچے میٹرس پر ریبا سے کچھ فاصلے پر سلا دیا۔ ڈھیلے مرے قدموں سے واپس آئی اور پلنگ کے ذرا سے کونے پر یوں بیٹھ گئی جیسے ون ٹو تھری سنتے ہی دوڑ لگانی ہو۔ مومن نے ایک ترچھی نظر اس کے انداز پر ڈالی۔ چند سیکنڈز سوچا پھر اپنا ایک بازو سر کے پیچھے سے نکالا اور بیڈ پر ٹھکتے ابرو کے اشارے سے اسے قریب بیٹھنے کو کہا۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے پھر گلا تر کیا، جبکہ مومن نے اس کی بات کے جواب میں ذرا سا اٹھ کر اس کے بیڈ پہ ٹکے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی طرف کھینچا۔ اب معلوم نہیں اس کا بولنے کو دل نہیں

چاہ رہا تھا یا مقصد جان بوجھ کر ایلیا کو تنگ کرنا تھا۔ ایلیا کی کہنی ہاتھ کھینچنے سے بیڈ پہ جا لگی، اس نے خود کو سنبھال کر اس بار آگے آتے بیڈ پر آلتی پالتی ماری۔ نظریں خفا خفا اور لب شکوہ اندر دبائے کچھ روٹھے ہوئے سے تھے۔ مومن کی یہ سنجیدہ شرارتیں اُس پر بہت رعب ڈالتیں اور وہ سخت بے بسی محسوس کرتی۔

''نیند تو نہیں آئی؟'' مومن کی طرف سے پہلا سوال آیا جس پر اس نے سر نفی میں ہلایا، اِدھر دل میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آیا جواب ہاں میں دینا چاہیے تھا یا ناں میں۔

''ایک بات پوچھوں ایلیا؟'' مومن کچھ کہتے ہوئے سوتے سے اُٹھ کر بیٹھا تو اس کے اور بھی نزدیک آ گیا۔ ایلیا اس کے ایک دم مقابل آجانے پر بے ساختہ پیچھے ہوئی جس پر مومن کھل کر ہنس دیا، بیچاری سچ مچ مشکل میں تھی۔

''تم نے اپنے بابا کو بہت بچپن میں کھو دیا تھا۔ شاید وہ اب تمہیں یاد بھی نہ ہوں۔ ہے نا؟''

اس نے لہجے کو سنجیدہ کیا تو ایلیا اس کی بات پر حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ اپنی چند سیکنڈز پہلے کی سٹپٹاہٹ بھی کہیں اُڑن چھو ہوگئی۔ مومن کا سوال شاید کچھ بے موقع تھا۔ پھر بھی اس نے کچھ وقت لے کر خود کو سنبھالا۔

''جی! بہت کم دھندلے دھندلے سے مناظر باقی ہیں۔''

''میں سوچ رہا تھا، نہ تم نے زندگی میں باپ کو دیکھا، نہ بھائی کا پیار، بیٹا چھوٹا بھی بہت ہے، اپنا بھی نہیں ہے۔ اور رہا شوہر۔ تو وہ بھی کون سا ہونے برابر ہے۔ تو تمہاری زندگی کے یہ سارے ادھورے پن یہ خلا کیسے پُر ہوتے ہیں؟''

مومن نے آج اُس سے کچھ بہت اہم شیئر کرنا تھا۔ یہ تمہید بھی اس نے کچھ سوچ کر باندھی تھی۔ وہ ایلیا کو کھل کر بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ آج دل کی تمام بھڑاس نکال دے گی، تب اسے بتانا آسان ہوگا کہ۔ لیکن وہ تو رونے لگی تھی۔

''ارے۔ تم رونے کیوں لگیں۔'' وہ بوکھلا ہی گیا۔ سیدھا ہو کر بیٹھتے پہلے اس کا چہرا اونچا کیا۔

''کیا ابو کی یاد آگئی؟'' اس نے پوچھا تو ایلیا نے سر کو نفی میں ہلایا۔

''ہاں۔ تو بھائی کی کمی؟'' اس نے پھر پوچھا جس پر مزید زور سے ناں میں ہلتا سر۔ ''ارے تو میری کوتاہیاں۔'' وہ مجبوراً پوچھ بیٹھا جس پر ایلیا — روتی رہی، آنسو ابھی بھی برسات جیسے بہے جا رہے تھے۔

''ایک دن میں عابی اور ریبا کو لے کر کہیں چلی جاؤں گی۔ پھر آپ کو پتا چلے گا کہ یہ کس کے بچے ہیں؟'' وہ زور زور سے روتے اپنے رونے کی وجہ بھی بتانے لگی جس پر مومن کا قہقہہ نکل گیا۔ اور ایسے کہ وہ دیر تک ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر آگے بڑھ کر بے اختیار ایلیا کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''سوری میری جان۔ رئیلی ویری سوری۔ آئندہ کبھی نہیں کہوں گا۔ بیٹا بھی تمہارا اپنا ہے، بیٹی بھی تمہاری ہے۔''

''کہیں گے آپ۔ کہے بنا رہ ہی نہیں سکتے۔'' اس نے مومن کے بازو پر مُکا مارا۔

''اچھا یار۔ اب ہمارے بچوں کو نہ نیند سے جگا دینا۔ بس چپ کر جاؤ۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک بہت بڑی۔ بلکہ دھماکے دار نیوز ہے۔ ایسی کہ ساری رات تمہیں نیند بھی نہیں آئے گی۔''

''بتائیے۔'' اس نے آنکھیں صاف کرتے کسی حد تک خود کو مصالحت پر آمادہ کیا۔

''اگر تمہیں اِن سب رشتوں میں سے اچانک ایک رشتہ مکمل حاصل ہو جائے تو کیسا لگے گا؟''

''مط۔ لب؟'' ایلیا کو پھر کچھ مشکوک قسم کے گمان ہونے لگے۔ چہرا بھی حدت سے گلابی پڑنے لگا۔ گلا پھر سے خشک اور۔

''یوں دیکھا جائے تو نصیب اِن دنوں تم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔'' وہ کچھ معنی خیزی سے مسکرایا۔ ''یہی دیکھ لو۔ ایک بیچارہ مومن احمد ہے جسے آج کل سوائے ایلیا کے کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں

دیتا۔ لیکن ظالم سماج بھی عین اسی وقت حملہ آور ہوتا ہے۔ دنیا کسی کے دل کو آباد ہوتا کہاں دیکھ سکتی ہے۔ میں اگر ہمارے محبت کے رشتے کو مکمل کرنا چاہتا ہوں تو حالات اس کی قطعی اجازت نہیں دیتے۔ میں جن حساس ترین رشتوں سے جُڑا ہوں، جب تک وہ سب مجھے آسودہ و مطمئن دکھائی نہیں دے جاتے، میرا اپنی خوشیوں کی راہ ہموار کرنا ناممکن ہے۔"

وہ نرمی اور دھیمے لہجے میں بس اپنی رو میں کہتا چلا جا رہا تھا۔ اور ایلیا کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی آج کی باتیں کس وجہ سے ہیں لیکن یہ ضرور سمجھ میں آ رہا تھا کہ ہمیشہ سے کم گو دکھائی دینے والا مومن آج کل بہت کھل کر بولتا تھا اور اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ اس کو سننا کتنا خوب صورت ہے۔

"اگر زندگی کے اس موڑ پر تمہیں پتا چلے ایلیا کہ تمہارا ایک عدد بھائی بھی ہے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

"کوئی منہ بولا بھائی؟" ایلیا نے منہ بنایا "مجھے تو ایسے اَن نیچرل رشتے بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"اصلی بھائی۔ سگے والا۔" مومن مسکرایا تو وہ حیران ہو کر پیچھے ہٹی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ناممکن"

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہے ڈیئر۔" وہ مسکرانے لگا "تم حقیقتاً ایک عدد بھائی رکھتی ہو۔ جو حالات کی ستم ظریفی کہہ لو کہ ایک بچی سے تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ بچی جسے گزرے پچیس برسوں میں تم نے اپنی بہن اور پھوپھو نے اپنی بیٹی سمجھا۔"

مومن کا لہجہ بتاتے ساتھ ہی سنجیدہ اور کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ وسیلہ کا ذکر اِن دنوں یونہی مغموم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اور اب اس کے حوالے سے یہ بدلتی سوچ۔ اگرچہ مومن کو اس سوچ سے آج نہ آئندہ بھی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ وسیلہ جب پھوپھو زاد تھی اس نے تب بھی اسے اپنی بہن سمجھا تھا اور اب اگر وہ پھوپھو زاد سے بالکل ایک غیر لڑکی بن کر سامنے آئی تھی اس کا دل تب بھی اپنی بہن کی محبت سے بھرا تھا۔ ہاں البتہ اس دل میں ایک بھائی کو سامنے کی کشادگی بھی در آئی تھی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اُسے سچ مچ لگنے لگا کہ مومن نیند میں ہے۔

"وسیلہ بچپن میں تمہارے بھائی سے بدل گئی تھی۔" مومن نے کہہ ہی دیا۔

"میرا بھائی؟"

"ہاں اور وہ بچہ منصب تھا جو دراصل تمہارا سگا بھائی اور رضوانہ پھوپھو کا بیٹا ہے۔ تم نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ منصب اور وسیلہ کی سالگرہ ایک دن ہوتی ہے۔ اکچوئلی دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پیدا ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے بدل گئے تھے۔ اس بات کی تصدیق تو تمہاری امی بھی کریں گی کہ نرسری نوریز کی بیوی اور وہ ڈلیوری کے ٹائم ایک ساتھ تھیں۔"

"آپ واقعی کوئی سچی کہانی سنا رہے ہیں۔ مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔"

"کل تمہاری دادی یہاں آ رہی ہیں۔ انہوں نے ہی یہ سچ منصب کو بتایا تھا۔ کیونکہ بچے انہوں نے تبدیل کیے تھے۔ اور اب وہ یہ سچ تمہاری امی کو بتائیں گی۔"

"او۔ اور وسیلہ؟" ایلیا کے اعصاب ایک دم ڈھیلے سے تھے "وسیلہ واپس چلی جائے گی۔"

"وسیلہ کہیں نہیں جائے گی بدھولڑ کی۔ اس کے والدین کی وفات ہو چکی ہے۔ اس کی دو بہنیں ہیں۔ میمونہ اور رمشہ۔ بلکہ تمہاری اطلاع کے لیے۔ اب رمشہ اور منصب ہمیشہ کے لیے یہاں آ جائیں گے۔ اور وسیلہ بھی یہیں رہے گی۔"

"یہ سب کتنا عجیب ہے۔ اور۔ اور اس دن منصب بھائی لان میں اس لیے۔" وہ منہ پہ ہاتھ رکھے ہونقوں کی طرح مومن کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن سے بہت سی باتیں

کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں روکنا چاہتا تھا۔ اسے بے حد افسوس ہے کہ اس کی بڑی بہن اس کی آمد سے پہلے دنیا سے چلی گئی۔"

"میں بھی اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔" ایلیا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"ابھی؟" مومن نے لہجہ سنجیدہ رکھا اگرچہ وہ شرارت ہی کر رہا تھا۔

"جی نہیں۔" ایلیا نے منہ بسورا۔

"کل ملوں گی۔"

"کل پھوپھو کو یہی سب بتانا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ایک ساتھ بہت سارے حیرت بھرے چہرے دیکھنے پڑیں۔ تب ہی تمہیں آج بتا دیا۔"

"امی؟" اُس نے مومن کو دیکھا "کیسے ری ایکٹ کریں گی؟"

"خبر تو خوشی کی ہے۔ اچھی اُمید رکھنی چاہیے۔ شاید فرط جذبات سے لپٹ جانا چاہیے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے سے۔" وہ اب مسکرا رہا تھا۔ اور ایلیا منصب کو تصور میں لاتے حیرت سے اس نئی نئی خبر کو ہضم کرنے لگی۔ آج خوشی سے، حیرت سے۔ نیند تو واقعی نہیں آنی تھی۔

"اب میں سو جاؤں؟" مومن نے بہت قریب سرگوشی کی تو وہ ہوش میں آئی۔ وہ ابھی تک اس کے بیڈ پر براجمان تھی، شاید وہ اسی لیے کہہ رہا تھا۔

"جج جی۔" وہ ہکلانے لگی، لیکن مومن نے جاتی ایلیا کے ہاتھ پر اپنی انگلیاں رکھیں۔

"آج بھائی ملنے کی خوشی میں جاگو۔ اور اللہ وہ وقت قریب لائے جب مومن احمد تمہیں ایک بھی پل کے لیے سونے نہ دے۔"

"واہ جی۔ کیوں سونے نہیں دیں گے۔" وہ سرخ سرخ چہرا لیے مسکراتے ہوئے اُٹھ گئی۔

"ہا۔ اب تمہیں کیا کیا بتائیں۔" وہ ایک حسرت بھری آہ بھرتے اُس کی معصوم ہنسی کو دیکھے گیا۔

☆☆☆

"اب تم مجھے روک نہیں سکتے ارحم! اب میں ان کی ایک نہیں چلنے دوں گی۔" وہ کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔

"ارے اب کیا کرنے والی ہیں آپ؟" ارحم سخت بے زار سا بیڈ پر آڑا لیٹا تھا۔

"تم جیسا بے حس تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" وہ بپھری ہوئی سی بیڈ کے نزدیک آئی "دیکھا نہیں، کیا کچھ سنا کر گئی ہے وہ پولیس والے کی بہن۔"

"اچھا بھلا وہ دادی کو ساتھ لے جا رہی تھی۔ بہت شوق ہو رہا ہے آپ کو مریضہ کی خدمت کرنے کا۔" وہ انہیں شاید ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں تھا۔

"خدمت کریں میرے دشمن۔" اس نے پیر پٹخے۔ "لیکن مصیبت یہ ہے کہ بڑھیا نجانے وہاں جا کر کیا کچھ کہہ دے۔" شہناز بے چینی سے لب کاٹ رہی تھی۔

"دادی نے کچھ دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے؟" ارحم اب ہاتھ سکوڑے ماں سے استفسار کر رہا تھا۔

"نہیں۔ وسیلہ کے تہہ خانے کی اسے بھنک بھی نہیں پڑی۔"

"تو پھر کیا فکر ہے، جانے دیتیں کل۔" ارحم ایک جمائی لے کر سیدھا ہوا اور شہناز نے بیٹے کی لاپروائی کو خوب غصے سے دیکھا۔

"تمہیں کسی بات کی عقل ہوتی تو کیا ہی اچھا تھا۔ وہ میمونہ پولیس کی دھمکی دے کر تمہاری دادی کو ساتھ لے جانے آئی تھی اور میں اتنی آسانی سے اس کے ساتھ روانہ کر دیتی۔ اتنی بے بس تو میں بھی نہیں۔"

"کبھی تو شکر پڑھ لیا کریں کسی بات کا۔ ورنہ سوچیں، وہ وسیلہ بی بی اگر کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں ہوتیں تو۔ میرا اور آپ کا اس وقت کیا حشر ہو رہا ہوتا؟"

"دیکھو ارحم۔ مجھے نہ سکھاؤ، سمجھاؤ۔ ان کے

ساتھ جو ہو رہا ہے نا۔ بہت ہی صحیح ہو رہا ہے۔ سب قدرت کا انتقام ہے جو آج معذور، لاچار بیٹی کو پاس بٹھا کر بھی بے بسی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔"

"بھئی تو آپ بھی اِسی کو کافی سمجھیں نا؟" وہ تنگ آ گیا، "شکر کریں کہ وسیلہ کسی قسم کا بیان نہ اب تک دے پائی ہے اور نہ ہی دینے کی پوزیشن میں ہے۔ مجھے تو سچی سن کر ہی اندر تک چین اتر گیا کہ وہ سب بھول چکی ہے۔ کیا نشانے پر ضرب لگائی ہے آپ نے۔" وہ اب ڈھیٹوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اور اس بار شہناز بیگم کو بھی ہنسی آ گئی کہ یہ تو واقعی بڑا کام ہوا تھا۔ ورنہ وہ ماں بیٹا تو اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو سکتے تھے۔

لیکن ہاں یہ بھی طے تھا کہ وہ اِسی پر قناعت کرنے والی نہ تھی۔ اوپر سے اس میمونہ کا آ کر یہ کہنا کہ وہ دادی کو میاندم لے جانا چاہتی ہے۔ شہناز سے بالکل برداشت نہیں ہوا۔ سایں کو وہ اکیلے تو ہرگز ان لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتی تھی، لیکن ابھی اس کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے کہ فی الحال تو سب کچھ ہمارے حق میں ہوا ہے لیکن آگے کے لیے ایک پل کی بھی کوئی گارنٹی نہیں۔ وسیلہ کی بیماری نے ہمیں وقتی طور پر بچایا ہے ارحم۔" شہناز اب ہاتھ سامنے باندھے حقیقت پسندانہ تجزیہ کر رہی تھی۔

"تو۔ کیا سوچ رہی ہیں آپ۔ اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

"وسیلہ کو واپس لانا پڑے گا۔"

"اررے ے!" وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا "میں یہاں سارہ کو لانے کا سوچ رہا ہوں اور آپ۔"

"محبت کرتے ہو اپنی بیوی سے؟" شہناز کا انداز طنزیہ تھا۔

"آف کورس۔ کیا شک ہے؟" ارحم انہیں نہ سمجھ میں آتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تو مطلب تم اپنے ساتھ ساتھ اُس غریب کو بھی پھنسانا چاہتے ہو۔"

"لیکن۔"

"خاموش رہو ارحم۔ اور غور سے سنو۔" شہناز نے ہاتھ اُٹھایا "سارہ کو یہاں لانے کے متعلق تو فی الحال بھول ہی جاؤ۔ حالات بہت نازک موڑ پر ہیں۔ ہم پر پرچا کٹا ہوا ہے، وسیلہ کو کسی بھی وقت سب کچھ یاد آ سکتا ہے۔ اور تمہاری شادی بھی منظر پر آ سکتی ہے۔ وہ شادی جو تم نے اپنی پہلی شادی کے عین دو دن بعد رچائی۔ پھر تمہاری دادی کو بھی میں نے میمونہ کے ساتھ نہیں جانے دیا۔ سب کچھ ہی ہمیں شک کے دائرے میں کھڑا کر رہا ہے۔ اس لیے اِس سب کو ٹھیک ہو جانے دو۔ اور جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرتے جاؤ۔"

"بتائیں۔" ارحم کا سارا جوش جھاگ کی طرح نیچے جا بیٹھا۔ تھک کر کشن سائیڈ پہ پھینکتے اس نے ماں کو سننا شروع کیا۔

☆☆☆

رضوانہ نے چائے کی پیالی سامنے میز پر رکھی اور دبے قدموں چلتے پردے کی اوٹ میں آ گئیں۔ وسیلہ کا کمرا ان کے بالکل سامنے والا تھا۔ بیچ میں چھوٹا سا کوریڈور تھا۔ فیروزہ چائے دے کر گئی تو انہوں نے اس سے لائٹ آف کر کے جانے کو کہا۔ وہ نیم تاریکی میں سامنے کمرے میں بیٹھی وسیلہ کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ اور وہ چونکہ ان سے گھبرائی تھی تو لائٹ ہی آف کر دی تاکہ وسیلہ انہیں دیکھ نہ سکے۔ اور اس وقت وہ بری طرح چونکی تھیں۔

فیروزہ ابھی کچھ دیر پہلے دھلے ہوئے خشک کپڑے تار سے اتار کر وسیلہ کے بیڈ پر رکھ آئی تھی۔ کاموں سے فارغ ہو کر تہہ لگاتے اسی نے الماری میں بھی رکھنے تھے۔ وسیلہ ان کے سامنے آرام چیئر پر بیٹھی موبائل پر کچھ دیکھ رہی تھی۔ فیروزہ کے کپڑے رکھ کر جانے کے بعد کچھ دیر تک وہ کپڑوں کو دیکھتی رہی تھی اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے ایک شال اُٹھائی تھی۔ سرخ رنگ کی گولڈن کڑھائی والی یہ شال رضوانہ نے تحریم کو اس کے جہیز میں دی تھی۔ اور ان

دنوں ایلیا کے استعمال میں تھی۔ وسیلہ نے سرخ شال کو الٹ پلٹ کر دیکھا تھا، پھر اسے اوڑھ لیا، اب وہ ہلکا ہلکا مسکرانے لگی تھی۔ پھر شال کو لہراتے ہوئے کمرے میں یہاں سے وہاں چلنے لگی۔ اور نجانے پھر اچانک کیا خیال آیا کہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامان کو الٹھل پلٹھل کرتے اس میں کوئی چیز ڈھونڈی۔

رضوانہ بغور اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وسیلہ نے لپ اسٹک کا ڈھکن کھولا اور ہونٹوں پر پھیرا۔ وسیلہ نے لپ اسٹک کے بعد آئی شیڈز بھی لگائے اور کچھ جیولری بھی پہنی۔ اور اب وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ رضوانہ کا پورا دھیان وسیلہ کی طرف تھا جب سامنے میز پر پڑا موبائل بجا۔ رضوانہ نے اونچی آواز پر بوکھلاتے ہوئے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کرلی۔ وہ وسیلہ کے ارتکاز کو توڑنا نہیں چاہتی تھیں

''ہیلو؟'' رضوانہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کیسی ہیں بھابی۔ میں شہناز۔''

''آ آپ!'' رضوانہ کا ہاتھ کانپ گیا۔ ''آپ نے یہاں کال کیوں کی؟''

''کیا کہہ رہی ہو رضوانہ، ظاہر ہے اپنی بہو کی خیریت جاننا چاہتی ہوں۔ بھلے تم لوگوں نے دشمنی نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن میں تو ایسی بے حس نہیں ہوں۔ اب تم لوگ ہم پر پرچا کٹواؤ، چاہے اپنی بیٹی کو زبردستی اپنے ہاں لے جاؤ، اسے اس کے شوہر سے دور کرو۔ میرا اللہ تو جانتا ہے نا کہ ہم نے کچھ نہیں کیا اور وسیلہ کے ساتھ جو ہوا، وہ صرف ایک حادثہ تھا۔''

''جی لیکن ابھی اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوئی۔'' رضوانہ نے لہجہ روکھا ہی رکھا۔

''اللہ پاک وہ دن جلد لائے جب وسیلہ مکمل صحت یاب ہوکر آپ سب کو حقیقت سے آگاہ کردے۔ تب تو یقین کرو گی بھابی کہ ہم بے قصور تھے اور وسیلہ کے ساتھ محض ایک اتفاقی حادثہ ہوا تھا۔'' شہناز کا لہجہ انتہا کا دکھی تھا۔

''لیکن!'' جیٹھانی کے اعتماد پر رضوانہ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

''وہ سب چھوڑو بھابی، مجھے اپنے اللہ پر پورا یقین ہے، ایک دن سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ بتائیں کہ وسیلہ اب کیسی ہے؟ اس کا علاج تو صحیح سے ہو رہا ہے نا؟''

''جی بس وہ ہمیں کچھ اور سمجھ رہی ہے۔'' رضوانہ نے لہجہ محتاط رکھا۔

''کچھ اور؟'' شہناز کا اچانک ہی رنگ اُڑ گیا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، معلوم نہیں وہ گھر کی سب ہی عورتوں سے اتنا ڈر کیوں رہی ہے۔ اور بتاتی بھی کچھ نہیں۔''

''او!'' شہناز نے سکون کا سانس لیا۔ وسیلہ کی خاموشی کی وجہ سے تو وہ بچتی آرہی تھیں۔ اور اس کی خواہش تھی کہ وہ کبھی بولنے کے قابل نہ ہوسکے۔

''اس کا مطلب وہ کسی کو بھی پہچان نہیں رہی؟'' شہناز کا انداز کچھ جاننے جیسا تھا۔ لیکن رضوانہ اس ہوشیاری کو سمجھ نہیں پائیں اور اپنی سادگی میں اقرار کرلیا کہ ہاں وسیلہ نے یہاں کسی کو بھی نہیں پہچانا تھا۔ شہناز کے لیے فی الحال یہ خبر ہی بہت خوش کن تھی۔

☆☆☆

''سوری منصب۔ میں تمہاری دادی کو نہیں لاسکی۔'' میمونہ نے سخت اداسی سے بھائی کو دیکھا۔

''اچھا جناب۔ اب وہ میری سگی والی کیا بن گئیں، میری تمہاری بھی ہونے لگا؟'' منصب ''تمہاری دادی'' کہنے پر مسکراتے ہوئے پلٹا۔

''لوگ کہیں جیلس تو نہیں ہو رہے؟''

''ہاں، بہت زیادہ جیلس۔'' میمونہ پہلے تو بے ساختہ کہہ گئی، پھر نجانے کیا ہوا کہ منہ پھیر لیا۔

رمشہ اور منصب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میمونہ اور انیس کی آمد کے کچھ ہی دیر بعد منصب نے بہنوں کو بھی رشتوں کی حقیقت سے آگاہ کردیا تھا۔ ان کی حیرت کا بھی وہی عالم تھا، لیکن سچ ایسا تھا کہ

جھٹلانا ناممکن تھا۔

"سچ بتاؤ منصب۔ تمہیں دادی کے اتنے بڑے اقدام پر افسوس نہیں ہوا۔ جس نے تمہاری زندگی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ کیا تم اُن سے خفا نہیں ہو؟" رمشہ نے دل میں دبا سوال بھی پوچھ ہی لیا۔

"کیسے خفا ہو سکتا ہوں۔ اُن کے توسط سے مجھے تم جیسی پیاری بہنیں ملیں۔ امی ملیں، بابا ملے۔"

"لیکن ایسے ہی کچھ رشتے تم سے چھن بھی تو گئے۔" میمونہ بھی قریب آئی۔ دونوں بڑی عجیب سی کیفیت میں گھری تھیں۔ منصب نے دونوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر انہیں قریب کیا۔

"تو قدرت نے ملوا بھی تو دیا۔ آج مجھے سب ہی رشتے حاصل ہو گئے نا۔ ماں اللہ نے لے لی، لیکن آج دوبارہ مل بھی گئی۔"

"اچھا ہاں منصب! دادی کے متعلق کیا سوچ رہے ہو؟"

"انہیں میں خود جا کر لے آؤں گا۔ بہت جلد۔" منصب کا انداز حتمی تھا۔

"منصب! ان سب کا بہت برا حشر ہونا چاہیے۔ وسیلہ کی حالت کے ذمہ دار بھی یہی سب لوگ ہیں۔" میمونہ کے چہرے پر نفرت تھی۔

"ہاں۔ ضرور ہوگا ان سب کا حساب۔ لیکن فی الحال وسیلہ کی ذہنی حالت ٹھیک ہونے اور اس کی طرف سے ایک مضبوط بیان آنے تک کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا، اور یہ کن باتوں میں لگا دیا ہے مجھے۔ میں ذرا مومن سے مل آؤں۔ ایک دو ضروری معاملات پر بات کرنی ہے۔"

"یوں کہو۔ اپنی امی سے ملنے کی جلدی ہے۔" رمشہ نے محبت سے بھائی کو دیکھا تو اس نے لب بھینچ کر سر اثبات میں ہلایا۔ آج کل اس کی دلی کیفیت تو کچھ اس سے بھی سوا تھی جتنا اس کی بہنیں سمجھ رہی تھیں۔

☆☆☆

ستمبر آدھا گزر چکا تھا۔ مون سون اگرچہ رخصت ہو چکا تھا لیکن بارشیں اس سال خوب برسی تھیں۔ آج صبح بھی تیز بارش ہوئی اور میاندم تو گرما میں ویسے ہی بھیگا بھیگا سا رہتا۔ وسیلہ کا ہاتھ پکڑ کر فیروزہ اُسے باہر لان میں لے آئی۔ اُسے دھلے دھلے لان میں باہر کرسی صاف کر کے بٹھایا۔ رضوانہ نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے بیٹی کو دیکھا۔

ایک ہی گھر میں رہتے انہیں بیٹی سے سامنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ ان سے ڈر کر دور بھاگتی تھی۔ ندرت اور ایلپا کو بھی اسی وجہ سے دور رہنا پڑتا۔ دن کا سارا وقت فیروزہ کو اس کا خیال رکھنا پڑتا اور باقی کا وقت مومن ہی بھاگتا رہتا۔

سب کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی کہ وسیلہ کو اپنا گھر، اپنا کمرا دیکھ کر بھی کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ وہ کئی طرح کی تسبیحات دم کر کے دور سے پھونکتی رہتیں۔

گزرے ڈھائی تین ہفتوں میں اتنا ضرور ہوا تھا کہ گھر کی پرسکون فضا، اچھی خوراک اور بھرپور نیند نے وسیلہ کے چہرے کی تازگی بہت حد تک لوٹا دی تھی۔ ورنہ پہلے پہل اسے جس حال میں رضوانہ نے دیکھا تھا، اُن کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ سجدے میں گر کر بے ساختہ یہی منہ سے نکلا کہ شکر ہے مالک ان کی بچی انہیں زندہ سلامت واپس مل گئی تھی۔

پہلے تو وہ اسے جیٹھانی کے مظالم سے تعبیر کرتی رہی تھیں لیکن شہناز کی اس دن کی باتوں کے بعد لگا کہ حادثے کے بعد یقیناً وسیلہ کا خون بہت ضائع ہو گیا تھا، تب ہی وہ اتنی کمزور اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔

ادھر شہناز کی سوچ رضوانہ کی طرف گئی اُدھر گیٹ سے داخل ہوتی گاڑی پر اُن کی نظریں ایک دم ساکن ہوئیں۔ وہ حیرت کے ساتھ گاڑی سے اترنے والوں اور لان میں بیٹھی وسیلہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ارحم، شہناز اور اماں جی گاڑی سے اتر کر مسکراتے ہوئے لان کی سمت بڑھے تھے۔

"کیسی ہو میری بچی، میری جان!" شہناز نے

جھک کر وسیلہ کی پیشانی چومتے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے۔

''آپ؟'' وسیلہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''تمہاری آنٹی ہوں وسیلہ!'' شہناز کے اندر معمولی سا ڈر اگر پہچان لیے جانے کا تھا بھی سہی تو اسے اس نے دوسرے رشتے میں لپیٹ کر وسیلہ کو کنفیوز کردیا۔ اِدھر آنٹی سن کر ہاجرہ بی بی نے چونک کر بہو کو دیکھا۔ نہ تائی، نہ ساس، شہناز نے اپنا تعارف آنٹی کہہ کر کروایا تھا۔ اِدھر وسیلہ ہلکا سا سر ہلا کر ارحم کو دیکھنے لگی۔

''اپنی دادی سے ملو وسیلہ۔ کتنا ترس رہی تھیں تم سے ملنے کے لیے۔'' شہناز نے ارحم کا تعارف کروانے کے بجائے وسیلہ کی توجہ دادی کی جانب کروائی کیونکہ وہ وسیلہ سے یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتی تھی کہ یہ تمہارا شوہر ہے اور کسی دوسرے تعارف جیسے کزن وغیرہ کہنے سے اماں جی مزید مشکوک ہوجاتیں۔ تب ہی بڑی لگاوٹ سے بہت عام انداز میں تعارف کروا کہ اندر کی راہ لی۔ اور ہاجرہ بی بی نے پیار سے وسیلہ کو گلے لگا کر اس کے تاثرات دیکھے لیکن وہ اسی اجنبیت سے دادی کو دیکھ رہی تھی۔ پہچان کی اپنائیت آنکھوں میں کہیں دکھائی نہ دی۔ اس لیے وہ بھی اس سے مل کر خاموشی سے شہناز کے پیچھے اندر بڑھ گئیں۔ اور شہناز کے لیے فی الحال یہی کافی تھا کہ وسیلہ نے انہیں نہیں پہچانا تھا۔ اب یہاں سے غائب ہوجانے میں ہی عافیت تھی۔ بلکہ ایک طرح سے ریسک لے کر فائدے میں ہی رہی۔ جو وہ سوچ کر آئی تھی اس کے لیے راہ کچھ اور ہموار ہوگئی تھی۔ وسیلہ نے اُن سب کو نہیں پہچانا تھا۔ ارحم سے تو چلو وہ واقف ہی نہ تھی۔ شہناز نے بھی اپنے ظاہری حلیے میں خوب دکھائی دیتا انقلاب پیدا کیا تھا۔ اس وقت حجاب میں چہرا لپیٹے عینک لگائے جو عورت اس کے سامنے تھی، وہ کسی طور تہہ خانے میں آنے والی شہناز سے لگا نہ کھاتی تھی۔

''کیسی ہو بھابی؟'' شہناز بڑے جوش سے بغلگیر ہوتے ایسی محبت سے رضوانہ کو دیکھ رہی تھی جیسے بچھڑی بہنیں آپس میں ملتی ہیں۔

''آپ!'' وہ بس خالی خالی نظروں سے جیٹھانی کو دیکھ کر رہ گئیں۔ ابھی صبح ہی تو ان سے کال پر بات ہوئی تھی اور اب وہ خود یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ اسی خالی الذہنی سے ساس سے بھی ملیں اور ان سب کو لاؤنج میں لے آئیں۔

''بیٹی کی ماں ہونے کے ناتے تم سب کا فوری طور پر غصے میں آنا جائز تھا رضوانہ۔ میں بھی وقتی طور پر بہت صدمے میں تھی۔ رابطہ بھی اتنے دنوں اس لیے نہیں کیا کہ مجھے اس بات کا شدید افسوس تھا کہ تم لوگوں نے ناحق ہم پر الزام لگائے، پولیس بلائی، لیکن ارحم بہت بے چین تھا۔ اس کا تو کبھی ایک پل بھی وسیلہ کے بغیر نہیں گزرا۔ وہی کہتا تھا کہ ہر بات دل سے صاف کرلوں، پھر میرے گھر کے وہ نوکر جنہوں نے یہ حادثہ اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا، وہ پولیس اسٹیشن بیان دینے بھی گئے۔ ان کی گواہی کے بعد اتنا ہوا کہ ہمیں اپنی بہو سے ملنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ میمونہ وغیرہ سے آپ کی کیا رشتے داری ہے۔''

''جی۔ رضوانہ فوری طور پر کچھ نہیں سمجھیں۔ پھر یاد آیا کہ میمونہ منصب کی بہن ہے۔ ''ان سے تو کوئی رشتے داری نہیں۔''

''تو بھابی! پھر وہ پولیس کی دھمکی دے کر اماں جی کو لینے حویلی کیوں آئی۔۔ بتاؤ بھلا میں کیا اماں جی کو چھپا کر بیٹھی ہوں۔ دیکھ لو، خود ملوانے لے آئی۔''

''اچھا!'' رضوانہ ان کی باتوں پر پریشان ہوگئیں ''مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ اور ارحم۔ تم وہاں دروازے میں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ۔''

''السلام علیکم چچی جان۔'' وہ جو دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ مؤدب بنا فوراً اندر داخل ہوا۔ چہرے پر اداسی کی تہیں یوں جمی تھیں جیسے بیوی کو اس حال میں دیکھ کر سب سے زیادہ متاثر وہی ہوا ہو۔

''بیٹھ جاؤ ارحم۔ باہر کیوں کھڑے تھے۔''

''یہ تو گھر کے اندر بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ تو۔''

''آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔'' پیچھے سے مومن کی بھاری آواز سنائی دی تو تینوں نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں نہ صرف مومن بلکہ اس کے پیچھے منصب بھی کھڑا تھا۔

''بلا اجازت آپ ہمارے گھر میں گھسے بھی کیسے؟'' مومن کے تیور جارحانہ تھے۔ رضوانہ نفی میں ہاتھ ہلانے لگیں۔

''تم غلط کررہے ہو مومن۔'' شہناز کا لہجہ تیز ہوا ''ارحم شوہر ہے وسیلہ کا اور تم اسے اپنی بیوی کے پاس آنے سے نہیں روک سکتے۔ اور میں اماں کو وسیلہ سے ملوانے لائی ہوں۔ جسے تمہارا یہ دوست پولیس کے بل پر بلوانا چاہتا تھا۔ باقی اگر اس رپورٹ پر اچھل رہے ہو جو تم نے ہمارے خلاف لکھوائی تھی تو سن لو کہ وہ خارج ہوچکی۔ گھر میں موجود سب ہی نوکر گواہی دے چکے کہ وسیلہ پر پنکھا ہی گرا تھا۔''

''یہ تو خیر ہونا ہی تھا۔'' وہ طنزیہ ہنسا ''ویسے اب آپ چاہتی کیا ہیں؟''

''ہم وسیلہ کو واپس لے جانے آئے ہیں۔ اس کا بہت اچھا علاج کروائیں گے۔ تمہاری طرح اس غریب کو گھر میں لے کر نہیں بیٹھے رہیں گے۔ ارحم یہاں سے اپنی بیوی کو لیے بغیر ہرگز نہیں جائے گا۔''

''آپ کے بیٹے کے ہاتھ میں تو اب خلع کے پیپرز تھماؤں گا میں۔'' مومن کا لہجہ انتہا کا سرد تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو مومن؟'' رضوانہ نے دہل کر مومن کو دیکھا۔

''کیوں نہیں رضوانہ۔'' شہناز نے آنکھیں نچائیں ''پولیس والے اسے اونچے خواب جو دکھا رہے ہوں گے۔''

''مومن صحیح کہہ رہا ہے، وسیلہ اب کہیں نہیں جائے گی۔ تشریف لے جائیں یہاں سے۔'' منصب نے باری باری اُن دونوں کو دیکھا۔

''پولیس والا بن کر آرڈر دے رہے ہو یار۔'' وہ خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''رشتے بہت ہیں، جو چاہے فرض کرلیں۔'' منصب کے چہرے پر شدید ناگواری تھی۔

''یہی ماحول بنا رکھا ہے میری بہو کے آس پاس؟'' شہناز نے اس بار تنک کر غصے سے رضوانہ کو دیکھا جس پر وہ مزید سہم گئیں۔ گھبرا کر مومن کو دیکھا جس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی دکھائی نہ دی، دوسری نظر غصے سے منصب پر ڈالی، نجانے وہ کیوں ہر دوسرے دن ان کے ہاں ملنے پہنچ جاتا تھا۔

''میں نے کسی کو یہاں نہیں بلایا، اور نہ ہی میں اجازت دوں گی آئندہ کسی کو بغیر اجازت اپنے ہاں آنے کی۔'' رضوانہ کے ذہن پر شہناز کی آمد اور باتوں کا اتنا شدید دباؤ پڑ چکا تھا کہ غصہ انہوں نے منصب پر نکالا۔ شہناز اور ارحم کا منصب کو یہاں دیکھ لینا انہیں بری طرح پریشان کر گیا تھا۔ آخر یہ لڑکا ان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔

''کیوں آئے ہو تم یہاں۔ کیوں میری بچی کا ہنستا بستا گھر اجاڑنے پر تلے ہو۔''

''کیسا ہنستا بستا گھر؟'' مومن نے تعجب سے پھوپھو کو دیکھا۔ اس کی سیدھی سادی پھوپھو واقعی حالات کو جانچنے پرکھنے کی صلاحیت سے محروم تھیں۔

''تم غلطی کررہے ہو مومن!'' پھوپھو کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ وہ بولنا شروع ہوئیں تو ایک دم ہی جذباتی ہونے لگیں ''بنا آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے کبھی بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ سخت گناہ ہے۔ وسیلہ کی چوٹ حادثاتی ہے، اب تو ثابت ہوگیا۔''

''ثابت ہوگیا؟'' مومن نے ماتھا پیٹ لیا۔ ''کس کے جھانسے میں آرہی ہیں پھوپھو۔ انہوں نے اپنے نوکروں سے وہی کہلوایا جو وہ چاہتے تھے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ ہے کوئی ثبوت اس الزام کا؟'' شہناز نے حصہ لیا تو لہجہ رندھ گیا تھا۔

رضوانہ کی بے وقوفی کو اپنے حق میں استعمال کرتے اس نے فوراً ٹون بدلی۔ اپنا اب تک دھونس

جماتا رویہ بھی پشیمان کر گیا۔ یہ بے وقوف عورت تو دو جملوں کی مار تھی۔ اسے اب بھی اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی کو سنوارنے سے سروکار تھا۔ اب تو بس کچھ ایسا کہنا تھا کہ رضوانہ اپنی بیٹی کو ان کے ساتھ روانہ کر دیتیں۔

''ارحم اپنی بیوی کو لے جانے آیا ہے، اسے نہ صرف بسانا چاہتا ہے، بلکہ دل و جان سے اس کے علاج پر پیسہ خرچ کرنا چاہتا ہے۔ آخر ہمیں کس چیز کی کمی ہے۔ ہم وسیلہ کو یہاں سے لے کر ہی جائیں گے۔ چاہو تو رضوانہ کو بھی ساتھ بھیج دو، وہ اپنی کسی کے لیے اپنی بیٹی کے ساتھ ہی رہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ ہم مخلص ہیں اور محبت کے اس رشتے کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ حویلی واپس جا کر وسیلہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' رضوانہ نے اس سے کہیں زیادہ جوش کا مظاہرہ کیا۔

''رضوانہ صحیح کہہ رہی ہیں۔ پھر بھابی آپ بتا رہی تھیں کہ وہ آپ سب سے ڈرتی ہے، جبکہ میں ابھی اس سے مل کر آئی تو وہ مجھ سے بالکل نہیں گھبرائی۔ کیوں اماں جی، آپ نے تو خود دیکھا۔'' شہناز نے ساس کو سامنے کیا اور وہ ایکدم چپ ہی ہو گئیں۔ اب بھلا شہناز کو کیسے جھٹلاتیں، جبکہ وسیلہ واقعی اس سے نہ گھبرائی تھی۔

اور اس بار رضوانہ نے مزید اپنا ارادہ مستحکم ہوتا محسوس کیا۔ انہیں کچھ دنوں سے واقعی ایسا لگنے لگا تھا کہ وسیلہ اپنی سسرال میں ہی خوش رہ سکتی ہے۔ اپنے گھر اپنے سگے رشتوں سے اس کا جی اچاٹ ہو چکا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے شوہر، اپنے گھر میں خوش تھی۔ اور واقعی اس کی چوٹ سوائے ایک حادثے کے کچھ نہ تھی۔

''مجھے لگتا ہے، وسیلہ کو واپس چلے جانا چاہیے۔ اور میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ مجھے یقین ہے میری بیٹی کو سب یاد آ جائے گا۔ اور وہ مجھے پہچاننے لگے گی۔''

''وسیلہ یہیں ٹھیک ہے۔'' ہاجرہ بیگم نے بے ساختہ ہی مداخلت کی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔'' بجائے رضوانہ کے شہناز عجلت میں ان کے قریب آئی۔

''آپ نہیں چاہتیں کہ وسیلہ آپ کے قریب آ جائے۔'' پھر فوراً مومن کے سامنے آئی۔

''دیکھو مومن۔ یہ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوں۔'' شہناز نے مومن کے سامنے آتے دونوں ہاتھ باندھ لیے ''میں جانتی ہوں، وسیلہ تمہارے لیے بہن جیسی ہے، تمہارا اس کے لیے جذباتی ہو کر سوچنا جائز ہے، لیکن دیکھو، بدگمان ہونے میں جلدی مت کرو، ایک اتفاقی حادثے کو ہمارا کوئی منصوبہ مت سمجھو، ہم بھی اولاد رکھتے ہیں، کسی اور کی اولاد پر ایسا ظلم ہوتے دیکھ بھی نہیں سکتی، کچھ کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ آج میں اس لیے یہاں آئی ہوں کہ پرانے گلے شکوے مٹا کر ہم سب کو وسیلہ کی صحت کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ وسیلہ کا ٹھیک ہو جانا ہم سب کی دوریاں مٹا دے گا۔ جب وہ ہی تم سے کہہ دے گی کہ اس کے ساتھ حادثہ ہوا تھا اور تم بلاوجہ اس کے سسرالیوں کے متعلق غلط سوچتے رہے تھے تو پھر باقی کیا رہ جائے گا۔''

''اوکے، تو جب وسیلہ ٹھیک ہو جائے گی اور اپنے منہ سے یہی سب کہہ دے گی، تب اس کو بھیج بھی دیں گے۔'' منصب نے فوراً بھاؤ دیا۔

''تم باہر کے آدمی، کس حق سے مشورے دے رہے ہو؟'' شہناز کو اس کا بولنا قطعاً برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

''پلیز چپ رہو منصب! تمہیں ہمارے گھر کے معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کی زندگی کے بارے میں خود سوچنے دو۔'' رضوانہ پھر طیش میں آنے لگیں۔

''اور کیا سوچا ہے آپ نے اپنی بیٹی کی زندگی کے بارے میں؟'' اس بار مومن نے تحمل سے سننے

کے انداز میں پھوپھو کو دیکھا۔
''وسیلہ اور میں اِن کے ساتھ واپس جائیں گے۔ تم دیکھنا وسیلہ بالکل ٹھیک ہو کر آئے گی۔''
''وسیلہ ان کے ساتھ قطعاً نہیں جائے گی۔'' مومن نے انگلی اٹھائی۔
''مجھ پر اپنے فیصلے مت ٹھونسو مومن!'' رضوانہ بھی غصے میں آ گئیں۔
''مومن صحیح کہہ رہا ہے آ۔ آپ۔'' منصب نے بے ساختہ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن رضوانہ نے سخت غصے سے اسے دیکھا تو وہ کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔
''وسیلہ کہیں نہیں جائے گی۔'' اس بار دادی نے رضوانہ کو دیکھ کر دوٹوک لہجے میں کہا ''میری بات تمہیں ماننی پڑے گی رضوانہ۔ اور میں بھی واپس حویلی نہیں جا رہی۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' شہناز کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ ساس نے کیا کہہ دیا تھا۔ وہ تو منصب کے منصوبے کو خاک میں ملاتے خود ساس کو ملوانے اور اچھا بننے یہاں پہنچ گئی تھی۔ لیکن ہاجرہ بیگم تو یہاں آ کر اب واپس جانے کو ہی تیار نہ تھیں۔
''دادی اگر یہیں رہنا چاہتی ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟'' مومن نے بظاہر عام انداز میں شہناز تائی کو دیکھا۔
''نہیں، میرا مطلب ہے، ہم وسیلہ کو لے جا رہے ہیں نا!''
''وسیلہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گی۔'' مومن کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔
''لیکن وسیلہ ہم سب کو پہچاننے سے انکاری ہے مومن۔ اور اب میں کسی کی نہیں سنوں گی، میری وسیلہ صرف حویلی جا کر ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔''
''اور جو کچھ حویلی میں اس کے ساتھ ہوا، وہ آپ بھول گئیں؟'' منصب بے اختیار ہی بول گیا۔
''مومن! تم اس آدمی کو یہاں سے نکال کیوں نہیں دیتے۔ آخر یہ کیوں میری بیٹی کی زندگی تباہ کرنے پہ تُلا ہے۔''
''کیونکہ یہ آپ کی بیٹی کا، اس گھر کا، ہم سب کا خیر خواہ ہے۔ اور منصب جو کہہ رہا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی وسیلہ کو دوبارہ اس جہنم میں کبھی نہیں دھکیلے گا۔''
''دیکھ لو بھابی۔ جو شخص ہمارے ٹکڑوں پہ پل کر کسی مقام تک پہنچا ہے، آج وہی ہمارے لیے آستین کا سانپ بن رہا ہے۔ تمہارا بھتیجا اس کو نہ صرف شہ دے رہا ہے بلکہ آج اس باہر کے آدمی، دو ٹکے کے منشی کے بیٹے کی باتیں مانی جا رہی ہیں۔ مومن کے سر پر بھی اس کے عہدے کا رعب سوار ہے۔''
''دادی! آپ بتا کیوں نہیں دیتیں۔'' ایلیا جو کچھ دیر ہوئی دروازے میں آ کر رکی تھی۔ زچ ہو کر دادی کو دیکھنے لگی۔
''بس اب کسی کے کچھ کہنے سننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری وسیلہ کا سامان باندھو، اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔ بلکہ ہمیں سامان کی بھی ضرورت نہیں۔ بہو کا ہاتھ پکڑ کر چلے جانا ہی مجھے بہت کافی ہے۔ ارحم اس کا شوہر ہے اور شوہر کے ساتھ اس کے گھر جانے سے بیوی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اور اماں جی آپ بھی بیمار پوتی سے ملنے آئی تھیں نا؟'' شہناز نے کڑی کچھ دھمکاتی ہوئی سی نظر ساس پر ڈالی۔
''تو پھر آپ بھی ساتھ چلیں گی، کیونکہ آپ کی بیمار پوتی کو آپ کی شفقت کی وہاں بہت ضرورت ہے۔'' شہناز تن کر کہتے باہر نکل گئی جہاں وسیلہ ابھی تک صحن میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ارحم بھی ماں کے تیور دیکھتے اب اعتماد سے وسیلہ کی طرف بڑھ گیا تھا۔
''کہا نا۔ وسیلہ کہیں نہیں جائے گی۔'' مومن دروازے کے بیچوں بیچ ہوا ''اور دادی بھی یہیں رہیں گی۔ ان کے ساتھ بھی کوئی زبردستی نہیں کرے گا۔''
''اماں جی آپ چل رہی ہیں ہمارے ساتھ؟'' شہناز نے ایک چبھتی نگاہ ساس پر ڈالی تو اس میں دھونس اور جتاتا ہوا رعب تھا لیکن ہاجرہ بیگم بھی آج

pklibrary.com

نھان کر آئی تھیں۔ انہیں تو بس ایک بار کسی طرح حویلی سے نکلنا تھا اور قدرت نے آج وہ موقع خود شہناز کے ہاتھوں دلوا دیا۔ انہوں نے منصب اور مومن کو بس ایک نظر دیکھا اور یہی بہت تھا۔ وہ دونوں بیک وقت دادی کے سامنے آ گئے

''برائے مہربانی آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ وسیلہ اور دادی ہمارے پاس ہیں۔ اور ہم ان کا پورا خیال رکھیں گے۔'' مومن نے اس بار لہجہ بظاہر نارمل لیکن اتنا حتمی رکھا کہ شہناز کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئی لیکن پھر فوراً ہی لہجے میں اعتماد پیدا کیا۔

''تم غلط کر رہے ہو مومن۔''

''اس میں کچھ غلط نہیں ہے۔ وسیلہ آپ کی بہو اور ارحم کی بیوی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں۔ لیکن شادی کے پانچ چھ ماہ بعد وہ پہلی مرتبہ اپنے میکے آئی ہے اور ہم اسے کچھ دن اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے لڑکی کا بیاہ کیا تھا، اسے بیچا نہیں تھا اس لیے ہمارا بھی اتنا ہی حق بنتا ہے۔ اس لیے بات کو بگاڑنے کے بجائے ہماری مان لینے میں ہی عافیت ہے۔ ورنہ شادی کے اتنی مدت بعد اچانک بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر میکے والوں سے کسی بھی نیکی کی امید کی جا سکتی ہے۔ فی الحال جس کا آپ کو سامنا نہیں کرنا پڑا اور دعا کیجیے کہ آگے بھی نہ ہو۔''

مومن نے اس بار ٹھہر ٹھہر کر کچھ ایسے اپنا مؤقف واضح کیا کہ شہناز کو جواب کے لیے لفظ ہی سوجھ نہیں پائے۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی لیکن پھر چپ ہو جاتی اور آخر اسی خاموشی سے گہرا سانس خارج کرتے باہر نکل گئی۔

ارحم پہلے ہی دروازے میں کھڑا تھا۔ ماں کو آتے دیکھ کر اس سے پہلے باہر نکل گیا۔ دیکھ لیا تھا مومن کسی صورت انہیں وسیلہ کو لے جانے نہیں دے رہا تھا۔ اب تو اسے کچھ اور سوچنا تھا۔ اور اس نئے پلان کا ایک سرا تو خود سامنے کھڑا دعوت تماشا دے رہا تھا۔

وہ منصب کو بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھتے چپ چاپ باہر نکل گئی۔ یہ دیکھے بنا کہ رضوانہ اچانک شوگر لیول لو ہونے سے کرسی پر ڈھے سی گئی تھیں۔

☆☆☆

ایلیا اور ندرت نے بھاگ دوڑ کر کے انہیں کھلا پلا کر ان کا شوگر لیول معمول پر کرنے کی کوشش کی۔ اور پندرہ بیس منٹ بعد اتنا ہوا کہ اب وہ بیڈ پر لیٹی آنکھیں کھولے ان سب کو دیکھ رہی تھیں۔

''سوری پھوپھو!'' وہ پھوپھو کا ہاتھ تھامے اُن کے قریب آ بیٹھا۔ مومن کو اندازہ تھا کہ اس کے سخت رویے نے پھوپھو کو اعصابی طور پر کمزور کیا تھا۔ وہ جو سوچے کھڑی تھیں چونکہ مومن نے ہونے نہیں دیا تھا تو اس لیے بے حد بے بسی محسوس کی تھی۔ اور اپنی بات کے رد کیے جانے نے انہیں توڑ سا دیا تھا۔

''تم نہیں جانتے مومن۔ جو آج میں نے دیکھا ہے۔'' رضوانہ کی آنکھوں کے آگے سرخ دوپٹے کا منظر گھوم گیا۔ انہوں نے وہ ساری بات مومن کو کہہ سنائی، ساتھ ہی اپنے خیالات بھی بتائے کہ وسیلہ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش تھی۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے رضوانہ۔'' ہاجرہ بی بی کرسی قریب لاتے ان کے پاس آ بیٹھیں۔ ''تمہاری بات سن کر مجھے جو منظر یاد آیا ہے اگر میں وہ سب کو بتا دوں تو تم سب اندازہ لگا سکتے ہو کہ حویلی میں وسیلہ کے ساتھ کیا کیا ہوتا رہا تھا۔''

انہوں نے آخری دنوں کی وہ بات سب کے گوش گزار کی جب گلناز وسیلہ کے زیور اور کپڑے پہنے حویلی میں ناچتی پھر رہی تھی۔

''تب میں بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پائی تھی کہ آخر وسیلہ کے کپڑے اور زیور گلے کے ہاتھ کیسے لگے، اور میں اُن دنوں اسی ٹوہ میں ہی لگی تھی لیکن میری طبیعت نے میرا ساتھ نہیں دیا اور دل کا دورہ مجھے ہسپتال لے گیا۔''

''یہ آخر آپ کس پہ بھروسا کر رہی تھیں۔ سُن لیا

کیسی سوچ رکھتے ہیں وہ۔'' ایلیا افسوس سے لب چبا رہی تھی

''آئندہ ان کو اندر ہی نہ آنے دیا جائے۔ ہماری فیملی میں ان لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔''

''ہماری فیملی میں کئی لوگوں کی گنجائش نہیں نکلتی۔'' انہوں نے بے ساختہ ایک چبھتی نظر رمشہ اور ساتھ کھڑے منصب پر ڈالی، عجیب ڈھیٹ لوگ تھے، باوجود کھل کر منع کرنے کے جب دل چاہے منہ اٹھا کر آجاتے تھے۔

''کچھ ان چاہے لوگ آئندہ اسی گھر میں رہنے والے ہیں۔'' ایلیا نے شرارت سے مومن کو ایک نظر دیکھا اور کہنے کی جرات بھی کر ہی لی۔ مومن کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی ہنس پڑے۔ رضوانہ البتہ نا سمجھی سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ جس نے گود میں اٹھائی ریبا آگے بڑھ کر منصب کے حوالے کردی۔ ایلیا کا اتنی بے تکلفی سے منصب کے سامنے جا کھڑا ہونا اور اتنی اپنائیت سے بچہ اسے تھمانا انہیں سخت کوفت میں مبتلا کرگیا۔ وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ ہوئیں کہ مومن آخر اپنی بیوی کے متعلق کیا سوچتا ہوگا۔

''لو اپنے ماموں سے لاڈ اٹھواؤ۔ اور دیکھ لیں بھیا! اب میں کچن کے کام شروع کرنے والی ہوں۔ آپ نے ہی سنبھالنا ہے ریبا کو۔'' اس نے انگلی اٹھا کر وارن کیا اور مومن ہنستے ہوئے منصب کے پہلو میں آیا۔

''چلو بھائی! میں کچھ تمہاری مدد کروادوں۔''

''رہنے دیں۔ بھابی کو میں خود سنبھال لوں گا۔ آپ کچن میں اپنی بیگم کی مدد کروائیں۔'' منصب نے ریبا کو اپنے سینے سے لگایا۔

''اچھا؟'' اس نے باقیوں کی نظر بچا کر باہر نکلتی ایلیا سے ابرو اٹھا کر پوچھا تو وہ ہنس کر باہر نکل گئی۔

''او کے۔ تو میں وہاں مدد کروانے جاتا ہوں۔ اس محاذ پر آج تم اکیلے لڑو۔''

مومن نے پھوپھو کی طرف اشارہ کرتے خود بھی باہر کی راہ لی، مومن نے پہلے رمشہ پھر دادی کو دیکھا جنہوں نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ منصب نے خفا بیٹھی ماں کو لب بھینچ کر کچھ دیر دیکھا پھر ریبا آگے بڑھ کر رمشہ کو تھمائی اور ایک گہرا سانس کھینچ کر رضوانہ کے قریب آیا۔

''آپ کیوں مجھ سے اتنی خفا رہتی ہیں؟ کیا مجھے موقع ملے گا اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کا؟'' وہ ان کے قدموں میں آبیٹھا اور بنا تیاری کے کہنا شروع ہوا تو رضوانہ کا دل بری طرح سلگا۔ وہ جنہیں گھر سے نکالنے کے درپے تھیں، وہ معافیاں مانگ کر گھر میں گھسنے کی راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اور اب وہ اس کی وجہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں، مومن کی خلع والی بات نے سب صاف کردیا تھا۔ انہیں سخت افسوس تھا کہ ان کے اپنے بھتیجے نے ان کی مرضی کے بغیر وسیلہ کے لیے کچھ پلان بھی کرلیا تھا۔ وہ وسیلہ کے لیے منصب کو پسند کرچکا تھا اور اس کے پرانے رویے کو یکسر نظرانداز کررہا تھا۔ وہ اکثر اس بات کو سوچ کر اداس ہوجاتیں کہ اگر وسیلہ کے لیے منصب نے تب ہاں کہہ دی ہوتی تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔

''میرا تمہارا صلح یا ناراضی کا کوئی رشتہ نہیں ہے منصب۔ مجھ سے لاتعلقی برتو، یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔''

''وہ تو اب ممکن نہیں ہے۔'' وہ ان کی طرف دیکھ کر محبت سے مسکرایا تو رضوانہ غصہ پیتے فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہاں بحث بے کار تھی، اب تو جو بھی سمجھانا تھا مومن کو ہی سمجھانا تھا۔

''امی!'' اس نے بازو سے تھام کر رضوانہ کو روکا تو انہوں نے پہلے جھٹکے سے بازو چھڑا دیا۔ پھر وہی ہاتھ منصب کے چہرے پر اٹھا دیا۔

''ابھی میری بیٹی کی طلاق نہیں ہوئی اور تم نے مجھ سے ساس کا رشتہ بھی قائم کرلیا۔''

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆

راضیہ سید

سبق

"ارے بیٹا زری! اچھا ہوا کہ تم یہیں مل گئیں۔ بازار میں چلنا تو الگ رہا فورتھ فلور تک جانے کا سوچ کر ہی دل ہول رہا ہے۔ اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں؟ اتنی سانس پھول رہی ہے کہ کیا بتاؤں؟ اگر تم یہ سامان اوپر رکھنے میں مدد کر دو تو بیٹا بہت مہربانی ہوگی۔" ہاؤسنگ کالونی کے فورتھ فلور پر مقیم نائلہ آنٹی نے زری کو دیکھتے ہی اپنی تھکاوٹ کا ماجرا بیان کر دیا۔

اب رہی زری تو اس کی تو عادت تھی ہر کسی کی مدد کرنے اور دعائیں سمیٹنے کی، سو وہ سیکنڈ فلور پر اپنے فلیٹ کے پودوں کو پانی دینے والا پائپ جلدی سے بند کر کے نائلہ آنٹی کے ساتھ ان کے گھر سب سامان رکھ آئی۔ نائلہ آنٹی بے چاری تو اتنی ممنون ہوئیں کہ دعائیں دیتی رہیں، زری کا تو کچھ نہ پوچھو دل خوشی سے بھر گیا کہ آج صبح کا آغاز اتنا اچھا ہو گیا تو اب سارا دن ہی اچھا گزرے گا۔ لیکن نیچے آتے ہی دادی کو دیکھا تو وہ غصے سے بھری ہوئی تھیں۔

"دادی! کیا ہوا اتنے غصے سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" زری کے معصومیت سے پوچھنے کی دیر تھی کہ دادی کا پارہ مزید ہائی ہو گیا۔

"غصہ نہ کروں تو کیا کروں، میرے بس میں اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟ ایک طرف تمہاری سادگی کو رو رہی ہوں تو دوسری طرف دنیا کی چالاکی پریشان کر رہی ہے۔ ماں باپ ہیں نہیں سب ذمہ داری مجھ پر ہے، تمہاری شادی کی فکر کھائے جا رہی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تمہاری حد سے بڑھی ہوئی خوش اخلاقی خوف زدہ کر رہی ہے۔" دادی بے چارگی سے گویا ہوئیں۔

"دادی! اب بس بھی کریں آپ خود بھی دکھی ہوتی ہیں اور مجھے بھی اداس کر دیتی ہیں۔ زندگی تو جینے کا نام ہے، شادی ہونا بھی ضروری ہے لیکن آپ اور میں کچھ کر تو نہیں سکتے۔ خدا خدا کر کے آج دفتر سے چھٹی ملی ہے اور اوپر سے آپ موڈ آف کر رہی ہیں۔ رہی بات لوگوں کی مدد کی تو کیا ہو گیا اگر میں نے نوید انکل کو پلمبر کا نمبر دے دیا۔

خرم کی امی گھر پر اکیلی تھیں ان کے روکنے پر میں آدھا گھنٹہ ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ شازمہ کی امی الگ بیمار اور بیڈ پر ہیں وہ بے چاری اتنی پریشان ہیں ایک تو ہمارے ہمسائے بھی ہیں سارا دن وہ کام کرتی رہتی ہیں انہوں نے مجھے کہا کہ دو تین ہانڈیاں بنا دو تو کل وہاں چلی گئی تھی اور آپ سے اجازت لے کر ہی گئی تھی ناں پھر اتنا اعتراض کیوں کر رہی ہیں؟" زری کے لہجے میں اکتاہٹ بھی تھی۔

"تمہیں تو سمجھانا ہی بے کار ہے زری۔ شادی بیاہ مانا مقدر کی بات ہے لیکن خود بھی کچھ ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں لیکن تم جو یہ ہر ایک سے سر راہ فری ہو جاتی ہو ان کی مدد کے لیے پیش پیش رہتی ہو تو بیٹا دنیا لڑکیوں کی اس قدر خوش اخلاقی کو پسند نہیں کرتی۔ بلکہ کسی اور ہی رنگ میں لیتی ہے۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ تم اپنی معصومیت کو داغ دار نہ کرو۔

لوگوں کے بہت سے روپ ہیں بیٹا۔ کیا اپنا کیا پرایا سبھی مطلبی ہیں۔ میں تو سمجھا سمجھا کر تھک ہار جاؤں گی لیکن خدا سے یہی دعا کرتی ہوں کہ وقت اور یہ زمانہ تمہیں کوئی سبق نہ سکھا دے۔" دادی اس کے

pklibrary.com

روپے اور ہٹ دھرمی ہے اب بہت مایوس ہو چکی تھیں لیکن وہ بھی ان کی باتیں ہنسی مذاق میں ٹال دیتی تھی۔

☆☆☆

روز تو اس کے دفتر کی روٹین یہی تھی کہ وہ جلدی گھر پہنچ جایا کرتی تھی لیکن آج گھر کے لیے ہفتے بھر کا سودا سلف بھی لینا تھا۔ دادی اماں کو راستے میں ہی کال کر دی تھی کہ وہ پریشان نہ ہوں سو بے فکری تھی۔ خیر سامان پکڑتے سنبھالتے سنبھالتے سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اچانک کچھ آوازوں اور پھر قہقہوں نے اس کے قدم وہیں روک لیے۔ پہلی آواز نمرہ کی امی کی تھی۔

''یار وہ سیکنڈ فلور والی لڑکی بھی وہ جو بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرتی ہے۔ پتا نہیں کیا نام ہے اس کا؟''

''ہاں اس کا نام زری ہے۔ بہت ہی سیدھی، سمجھو اللہ میاں کی گائے۔ میں تو جب بھی سودا سلف لاتی ہوں تم خود بتاؤ اب فورتھ فلور تک کون لائے کوئی مزدور بھی لاتی ہوں تو ۳۰۰ روپے تو پڑ گئے ناں۔ یہ لڑکی ہر دفعہ فری میں ہی سب کر دیتی ہے اور مجال ہے جو اف بھی کرے۔'' نائلہ آنٹی کی آواز آئی۔

''اچھا یہ تو کمال ہو گیا اب میں بھی اپنے گروسری کے تھیلے اسی سے اٹھوالوں گی۔'' نمرہ کی امی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بھئی معاف کرنا میں تو اس کی فری ہونے کی عادت سے عاجز آ گئی ہوں، آنٹی لائیں یہ کر دوں وہ کر دوں۔ ایک دفعہ بجلی کا بل کیا جمع کروا لیا اور پلمبر کا نمبر کیا پوچھا جناب سر ہی ہو گئی۔ میں تو فوراً چوکنا ہو گئی کیونکہ میرے تو تین تین برسرروزگار جوان جہان لڑکے ہیں اور تمہیں تو پتا ہی ہے کہ ایسی لڑکیوں کا در پردہ مقصد کیا ہوتا ہے۔'' نمرہ آنٹی کو زری پر کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میری شازمہ دیکھو بالکل سیدھی ہے، ناپ تول کر بولتی ہے جس طرح کہ باوقار لڑکیوں کو ہونا چاہیے خیر چھوڑو ہم کس کی باتیں لے کر بیٹھ گئے اس کا قصہ شروع کرو تو ختم ہی نہیں ہوتا۔'' شازمہ کی امی جو بقول اس کے تین ہفتوں سے بیمار اور بیڈ پر تھیں اور وہ اس کی منت سماجت پر چار پانچ دن سے متواتر کھانا پکا کر اس کے گھر بھجوا رہی تھی وہ اس کے بارے میں یہ زریں خیالات رکھتی تھیں۔ آج اسے دادی کی بات یاد آ رہی تھی کہ زمانہ دوہرے رویے کا حامل ہے، میری دعا ہے کہ تمہیں وقت نہ سکھائے۔

اپنی آنکھوں میں آئے اشکوں کو، زری نے پلکوں پر ہی روک لیا اور راستے میں کھڑی تمام ہمسائیوں کو سرسری انداز میں، سلام کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

☆☆

نگہت سیما

ماہ الملوک

وہ ماہ الملوک تھی۔

ہر دکھ، ہر پریشانی اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔ اپنے اندر اتار لیتی بنا کوئی گلہ، کوئی شکوہ کیے۔

صرف اپنے ہی نہیں دوسروں کے غم اور دکھ بھی اپنے دل میں اتار لیتی تھی، یوں جیسے اس کے اپنے دکھ ہوں۔

اور کبھی کوئی خوشی ملتی تو دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دھیمے سے مسکرا دیتی تھی نہ خوشی میں آپے سے باہر ہوتی نہ غم میں واویلا کرتی۔

دادا اسے ماہ الملوک کہتے تھے اور وہ زیل شاہ زیب تھی، مرزا شاہ زیب اور مریم شاہ زیب کی اکلوتی بیٹی۔

☆☆☆

لاہور کے ذکی دروازے کی اندرونی اور بیرونی سمت شان دار حویلیاں تھیں، کچھ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی اور کچھ مسلمانوں کی اپنی تعمیر کردہ۔ ان ہی حویلیوں میں سے ایک حویلی مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنائی تھی۔ تایا تایا افراد کے اسکول سے ذرا سا آگے جائیں تو دائیں طرف ایک شان دار حویلی تھی جسے موروں والی حویلی کہتے تھے۔ کیونکہ صدر دروازے کے دونوں اطراف نیلی اور سفید چینی کی ٹائلیں تھیں۔ ان میں مور نقش کیے گئے تھے۔

چھت تک اونچے لکڑی کے پیتل کے کیلوں جڑے دروازے کے دونوں طرف، ٹائیلوں کے اندر نقش ہوئے دونوں مور کئی ٹائلیں ٹوٹ جانے کی وجہ

مکمل ناول

pklibrary.com

سے آدھے ادھورے رہ گئے تھے۔ اس کیلوں جڑے دروازے سے اندر جائیں تو ایک طویل اور کشادہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی میں صدر دروازے کے دائیں بائیں روشن دان تھے۔ جن میں شیشے لگے تھے ان شیشوں سے آنے والی دھوپ اور روشنی سے ڈیوڑھی سورج غروب ہونے تک روشن رہتی تھی۔ البتہ رات میں پیلی روشنی والا بلب جلتا رہتا تھا۔ ڈیوڑھی میں دائیں طرف دو واش روم تھے۔ جو غالباً حویلی کی تعمیر کے وقت ملازموں کے لیے بنوائے گئے ہوں گے۔

وقت کے ساتھ ساتھ حویلی میں جہاں اور

pkilibrary.com

تبدیلیاں ہوئی تھیں انہیں بھی جدید تقاضوں کے مطابق بنا دیا گیا تھا۔ بائیں طرف ایک دروازہ تھا جو مہمان خانے میں کھلتا تھا۔ مہمان خانہ ایک مکمل گھر تھا، سٹنگ، بیڈروم، اٹیچڈ باتھ، چھوٹا سا کچن۔

شاہ زیب بیگ نے اسے جدید تقاضوں کے مطابق فرنشڈ کر رکھا تھا کہ جب وہ جاب میں تھے تو ان کے دوست احباب آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام بھی کرتے تھے لیکن اب بہت کم مہمان خانہ کھلتا تھا لیکن اس کی صفائی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ دائیں طرف واش رومز کے پاس سے سیڑھیاں اوپر پہلی منزل تک جاتی تھیں۔

ہمایوں بیگ کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی یہ سیڑھیاں، عموماً گھر کے ملازمین استعمال کرتے تھے جبکہ گھر کے افراد اندرونی سیڑھیاں استعمال کرتے تھے۔ البتہ آج کل یہ سیڑھیاں گھر کے افراد کے استعمال میں ہی تھیں۔ ڈیوڑھی کے اختتام پر لکڑی کا منقش دروازہ تھا جو ایک کشادہ صحن میں کھلتا تھا۔ صحن میں دروازے کے دونوں اطراف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ کیاریوں کے اختتام پر دائیں طرف آم اور بائیں طرف جامن کا درخت تھا۔ جامن کے درختوں کے ساتھ ہی لیموں کا درخت بھی تھا۔

مشرق اور مغرب دونوں طرف سے چکر دار سیڑھیاں پہلی منزل تک جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کشادہ کچن تھے۔ بھی دونوں کچن بہت آباد رہتے تھے۔ شاہ زیب بیگ اور ظفریاب بیگ کے مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ لیکن اب مدت سے مغربی سمت والا کچن بند تھا۔ مرزا جہاں زیب اس موروں والی حویلی کے تنہا وارث تھے۔ کیونکہ وہ بھی اکلوتے تھے اور ان کے والد بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑے دونوں بیٹے اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ اوپر والی منزل پر رہتے تھے، جبکہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاہ زیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا شاہ رخ پھر دو بیٹیاں اور پھر ایک بیٹا جبکہ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ سو پہلی منزل پر خوب رونق رہتی تھی۔ جبکہ گراؤنڈ فلور پر زیادہ تر خاموشی رہتی تھی۔

مرزا جہاں زیب اور شاہ زیب بیگ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے تھے۔ آزین کی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ حویلی میں کم ہی ٹکتا تھا اور زل شاہ زیب بھی جو سارا دن اکیلی، حویلی کے خالی کمروں میں چکراتی پھرتی تھی۔ آزین کے والد کچھ عرصہ پہلے اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ امریکہ سیٹل ہو گئے تھے۔ یوں گراؤنڈ فلور پر ان دنوں کل چار افراد تھے لیکن نہیں، ان چاروں کے علاوہ گراؤنڈ فلور کا ایک اور مکین بھی تھا۔ جس کا ٹھکانہ ڈیوڑھی تھا۔ یہ شیخو بابا تھا۔ جس کا اصل نام تو شہزادہ سلیم تھا لیکن کئی سال پہلے مرتضیٰ ارباب نے اسے شیخو بابا کا نام دیا تھا۔ اب وہ سب کا شیخو بابا تھا ہولے ہولے سب اس کا اصل نام بھول گئے تھے۔ دراصل ان دنوں مرتضیٰ ارباب کے زیر مطالعہ امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' تھا۔

وہ اپنے کالج میں یہ ڈرامے اسٹیج کر رہے تھے۔ اس روز نہ جانے کس کام سے مرزا جہاں زیب نے شہزادہ سلیم کو آواز دی تھی۔

''شہزادہ سلیم..... آہ میرا شیخو۔ آؤ باپ کے گلے لگ جاؤ۔''

وہ ڈرامے میں شہزادہ سلیم کے باپ بادشاہ اکبر کا کردار ادا کرنے والا تھا اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، اپنے مکالمے بولتا رہتا تھا تو یوں شہزادہ سلیم کو شیخو بابا کا نام مل گیا تھا سب کو شہزادہ سلیم کی نسبت بلانے میں زیادہ آسان لگا تھا۔

اس کی عمر تقریباً چھبیس ستائیس سال ہو گی۔ لیکن جب وہ اٹھارہ انیس سال کا تھا تب سے سب کا شیخو بابا تھا۔ مہرین، ماہ وش اور بلال اورنگ زیب تو اکثر اسے صرف بابا کہہ کر ہی بلا لیتے تھے حالانکہ وہ بابا تو کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا۔ سیاہ بال زلفوں کی صورت کندھوں تک

بکھرے رہتے تھے۔ مغل شہزادوں جیسی آنکھیں، گورا رنگ، اونچی ناک، زمل کا خیال تھا۔ کہ وہ ضرور کسی مغل شہزادے کی اولاد ہوں گے۔ ڈیوڑھی میں ہر وقت اس کی چارپائی بچھی رہتی تھی۔ جب کسی کام سے باہر جاتا تو بستر لپیٹ کر پائینتی رکھ دیتا تھا۔ جب گھر میں ہوتا تو اسی چارپائی پر لیٹ کر میر وارث شاہ، جنگ نامہ حامد اور ایسی ہی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں اخبار بھی نظر آتا تھا۔

حویلی کے حالیہ مکینوں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شیخو بابا کون تھا کہاں سے آیا تھا۔ اس کا خاندان کہاں تھا، ماں، باپ، بہن بھائی تھے یا نہیں۔ وہ تقریباً شاہ رخ کا ہم عمر تھا۔ یا شاید ایک سال بڑا یا چھوٹا ہو۔ کسی نے کبھی اس سے اس کی عمر نہیں پوچھی تھی بس خود ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ نوجوان نسل نے ہوش سنبھالنے کے بعد اسے یہاں ہی دیکھا تھا۔ بڑوں میں سے کسی کو علم بھی ہو تو کسی نے ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کی چارپائی کے ساتھ، دیوار میں بنے طاقچے پر انٹر کام رکھا رہتا تھا۔ حویلی کے مکینوں کے باہر کے سب کام اس کے ہی ذمے تھے۔

زمل شاہ زیب سوچتی تھی، اگر شیخو بابا نہ ہوتا تو حویلی کے مکینوں کے باہر کے کام کون کرتا۔ سارے کام رک جاتے، دوپٹے رنگوانے سے لے کر سبزی گوشت تک لانا اس کے ہی ذمے تھا۔ حویلی اور ڈیوڑھی میں ایسے کئی طاقچے تھے۔ لاہور میں جب بجلی نہیں آئی تھی تو شاید ان طاقچوں میں، لالٹین یا لیمپ رکھے جاتے ہوں گے یہ زمل کا خیال تھا اور کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

اور یہاں، اس موروں والی حویلی کے گراؤنڈ فلور میں بڑا سکون تھا لیکن مشرقی سیڑھیوں کے تیسرے پوڑے پر، بیٹھی ہوئی زمل شاہ زیب نے سوچا کہ زندگی اتنی بے رنگ اور بور کیوں لگتی ہے شاید اس لیے کہ زندگی میں کرنے کو کچھ خاص نہیں۔ یونی ورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھی۔

اور زمل شاہ زیب کو لگتا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں کبھی بھی اتنی طویل نہیں ہوتی تھیں جتنی اس بار لگتی تھیں۔ اوپر والے ان دنوں کم ہی نیچے آتے تھے ان

الف لیلہ
ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1500 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کی اپنی زندگیاں اور اپنی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ مرزا جہاں زیب ان دنوں اپنی کتابوں کی مرمت میں مصروف تھے اور وہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ان کے کمرے سے ملحق ہی ان کا اسٹڈی روم تھا، دیوار گیر الماریوں میں سینکڑوں نایاب کتابیں تھیں۔ الماریوں میں دیوار کی طرف سے سیم آ گئی تھی، جس نے بہت سی قیمتی اور نایاب کتابوں کو تباہ کر دیا تھا اور زیب النسا مخفی کا دیوان ڈھونڈتے ہوئے زل نے ہی دادا کو بتایا تھا کہ کتابوں کو شاید دیمک لگ گئی ہے اور پھر دادا کے ساتھ مل کر اس نے سب کتابوں کو دھوپ لگوائی تھی۔ کچھ کتابیں تو بالکل راکھ ہو گئی تھیں۔ بوسیدہ اوراق الگ کر کے کتابوں کی مرمت کی جا رہی تھی۔

اور شاہ زیب بیگ تو مریم کے بعد گوشہ نشین ہی ہو گئے تھے۔ ”اور پتا نہیں ابا ایسے کیوں ہو گئے ہیں اتنے چپ چپ اتنے خاموش، جانے ان کے دل میں کیا ہے۔ کیا سوچتے رہتے ہیں۔“

کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ ابا اس سے باتیں کریں۔ اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھیں، اس کی کامیابیوں پر خوش ہوں وہ اماں کو یاد کر کے اداس ہو تو اسے گلے سے لگا کر تسلی دیں۔ وہ جب چھوٹی تھی تو وہ بہت کم گھر آتے تھے۔ تب بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ابا اس سے اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھیں اور وہ اپنے انعامات انہیں دکھائے لیکن تب بھی ابا آتے تو محض، اس کا رخسار سہلا کر ذرا سا مسکرا کر اسے دیکھتے اور بس ان کا زیادہ وقت مہمان خانے میں ہی گزرتا تھا، ہمیشہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی مہمان ہوتا تھا۔

وہ دور دور سے انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ وہ اتنے شان دار اتنے بارعب لگتے تھے۔ وہ چاروں بھائیوں میں سے سب سے زیادہ وجیہہ اور خوب صورت تھے۔ اور اب جب کہ وہ گھر پر ہوتے تھے تب بھی، ہاں! تب بھی وہ اس سے اتنے ہی بے نیاز تھے جتنے کہ پہلے بلکہ اب تو وہ خود سے بھی بے نیاز تھے۔ گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھے خلاؤں میں جانے کیا تکتے رہتے تھے۔ اگر وہ ان سے کھانے اور کپڑے بدلنے کے لیے نہ کہے تو شاید وہ ہفتوں نہ کھانا کھائیں نہ کپڑے بدلیں۔ حالانکہ کتنے ویل ڈریسڈ ہوتے تھے شہزادوں کی سی آن اور شان والے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر دیوار کے ساتھ بنی پھولوں کی کیاریوں میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھا۔

اور آزین...... آزین پتا نہیں کہاں ہوتا ہے آج کل۔ صبح ناشتہ کر کے جو گھر سے نکلتا ہے تو شام کو ہی اس کی شکل نظر آتی ہے۔ پچھلے سال اس نے ایم بی اے کیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں تلاش کے باوجود ابھی تک اسے اپنے مطلب کی جاب نہیں ملی تھی۔ دائیں کہنی گھٹنے پر ٹکائے اور دائیں ہاتھ کی ہی ہتھیلی پر تھوڑی ٹکاتے ہوئے اس نے سوچا اسے آزین سے پوچھنا تو چاہیے کہ وہ صبح سے شام تک کہاں غائب رہتا ہے اور مرتضیٰ یا ارباب تایا کی آفر کیوں نہیں قبول کر لیتا۔ ارباب تایا نے کہا تھا کہ فارغ رہنے کے بجائے وہ ان کی فیکٹری جوائن کر لے۔

ان کی فیکٹری میں مختلف جوسز، دودھ اور ایسی ہی دوسری پروڈکٹ کے ڈبے وغیرہ بنتے تھے جبکہ مرتضیٰ اپنا الگ کام کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس کئی پلان تھے اور وہ چاہتا تھا کہ آزین اس کے ساتھ پارٹنر شپ کر لے لیکن آزین ایسا نہیں چاہتا تھا۔

”پتا نہیں کیوں...... اور دادا بھی اسے نہیں سمجھاتے تھے کہ اس طرح فارغ رہنا اچھا نہیں ہے۔ بی بی اماں کہتی تھیں فارغ دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ لیکن دادا تو اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے دادا کا لاڈلا جو ہوا۔“ اس نے برا سا منہ بنایا۔

”اور کیا ہو کہ بی بی اماں ان چھٹیوں میں آ ہی جائیں۔ ان بور اور اکتا دینے والے شب و روز میں بی بی اماں کے آنے سے ہی کچھ ہلچل ہو جائے بی بی اماں ہوتی تھیں تو دن بھر آس پاس کی گھروں اور حویلیوں سے خواتین ان سے ٹوٹکے نسخے اور کچھ نہ کچھ پوچھنے آتی رہتی تھیں۔“

بی بی اماں کی والدہ کم عمری میں موروں والی حویلی میں آئی تھیں۔ دادی نے اسے بتایا تھا کہ انہیں شاہ زیب کے لیے رکھا گیا تھا کہ شاہ زیب اور اختر بانو کی عمروں میں بس سوا سال کا ہی فرق تھا اور دو

pklibrary.com

چھوٹے بچوں کو سنبھالنا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دادی کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں خانساماں غلام شبیر اپنی بھانجی شاہ جہاں بیگم کو لے آیا تھا۔ جس کے والدین دو سال پہلے آگے پیچھے چل بسے تھے اور دودھیال میں کوئی رکھنے کو تیار نہ تھا۔ یوں شاہ جہاں بیگم موروں والی حویلی میں آئیں تو ادھر ہی ہو رہی تھیں۔ دادی نے ہی ان کی شادی کروائی تھی۔ بی بی اماں ان ہی کی بیٹی تھیں۔ جوانی میں بیوہ ہوئیں تو حویلی میں آ گئیں۔

اولاد کوئی بھی نہیں۔ شاہ جہاں بیگم اور بہن بھائیوں نے دوبارہ شادی کے لیے بہت کہا لیکن وہ تیار نہ ہوئیں۔ شاہ رخ سے لے کر زمل تک سب ان کی گود میں ہی پلے تھے، پتا نہیں کب کس نے انہیں پہلی بار بی بی اماں کہا تھا کہ پھر سب ہی انہیں بی بی اماں کہنے لگے تھے۔ چھ ماہ پہلے وہ اپنی چھوٹی بہن کے پاس قصور چلی گئی تھیں کہ وہ بیمار تھیں، شاید کینسر تھا انہیں اور وہ بار بار انہیں بلاتی تھیں کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں۔

''اللہ کرے بی بی اماں ہی آ جائیں تو یہ بوریت کچھ تو کم ہو۔'' اس نے صحن میں چاروں طرف نظر دوڑائی تب ہی کوئی اوپر سیڑھیوں سے دبے پاؤں اترتا، اس کے پیچھے والے قدمچے پر آ کر بیٹھ گیا وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھی اس کے مخصوص کلون کی خوشبو سے پہچان گئی تھی کہ وہ آزین ہے۔ یوں بھی اوپر والے تو نہیں آنے جانے کے لیے ڈیوڑھی والی سیڑھیاں ہی استعمال کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار جب انہیں زمل سے کوئی کام ہوتا یا دادا سے ملنا ہوتا تو تب ہی اندرونی سیڑھیوں کو استعمال کرتے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں۔ تم اس وقت اوپر سے کیسے آ رہے ہو۔''

''سیڑھیوں سے اپنے پاؤں پر چلتا ہوا۔'' وہ مدھم سا مسکرایا تھا۔

''میرا مطلب ہے اس وقت تو تم نے باہر جانا ہوتا ہے اپنے دوستوں کی طرف۔'' اس نے اب بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''ہاں آج موڈ نہیں بنا کہیں جانے کا۔ مرتضیٰ کی طرف گیا تھا۔'' وہ ایک سیڑھی نیچے اتر کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

''دادا جان کیا کر رہے ہیں۔''

''اپنی کتابوں کی مرمت کر رہے ہیں جو صفحات صحیح تھے۔ ہم نے انہیں جوڑ کر آج کور چڑھانے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ردی کا یہ ڈھیر سنوار کر بھلا کیا کریں گے آپ لوگ۔'' اسے یہ سب فضول لگتا تھا۔

''کیا مطلب ردی کا ڈھیر۔'' زمل نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

''قلمی نسخے، قیمتی اور نایاب کتابیں تمہاری نظر میں ردی کا ڈھیر ہیں۔''

''ہاں تو بھلا دادا جان کے بعد کس نے ان بوسیدہ کتابوں کو سنبھال کر رکھنا ہے۔'' اب وہ ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں..... میں رکھوں گی سنبھال کر.....'' اس نے تفخر سے کہا۔

''اتنا قیمتی خزانہ ہے یہ تم کیا جانو ان کی قدر۔''

''اور یہ قیمتی خزانہ ایک دن بے کار چلا جائے گا۔'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

''ایسے ہی بیکار چلا جائے گا۔ میں اسے پنجاب لائبریری کو ڈونیٹ کردوں گی مرنے سے پہلے۔''

اسے آزین کا اس طرح کہنا برا لگا تھا وہ ایک بار پھر کیاریوں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ جہاں اب بھی خاکستری چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ کیاریوں کے پاس ہی مٹی کی سکوریوں میں، وہ صبح صبح ہی باجرہ اور پانی ڈال کر رکھ دیتی تھی۔

''تمہاری یہ چڑیاں بہت شور کرتی ہیں۔ صبح سویرے جگا دیتی ہیں تم یہ باجرہ اور پانی کہیں کسی اور جگہ نہیں رکھ سکتیں زمل۔''

اس نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں کیاریوں کے آس پاس پھدکتی چڑیوں کو دیکھا۔ زمل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا وہ بدستور کیاریوں

کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"ناراض ہو۔"
"کیوں۔"
زمل نے اپنی پلکیں اٹھائیں اتنی خوب صورت، اتنی لمبی گھنی پلکیں، لمحہ بھر کے لیے تو وہ پلکوں کے اس گھنے جنگل میں الجھ سا گیا تھا اور نظریں ان جنگلوں سے نہیں ہٹا سکا تھا۔
"تمہاری اور دادا جان کی کتابوں کو بے کار جو کہا ہے۔"
"اس میں بھلا ناراض ہونے کی کیا بات ہے سب کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے کسی کے لیے کوئی چیز قیمتی ہو سکتی ہے اور کسی کے لیے وہی چیز بے کار یہ تو دل سے جڑے احساسات ہوتے ہیں جو کسی چیز کو قیمتی بناتے ہیں اور کسی کو بے قیمت۔"
"شاید تم صحیح کہتی ہو۔"
وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا تھا۔
"آزین تم صبح کے گئے رات کو گھر آتے ہو کیا کرتے پھر رہے ہو آخر اور یہ تمہارے آخر کون سے دوست ہیں جو سارا دن فارغ ہوتے ہیں۔"
زمل نے آج پوچھ ہی لیا تھا۔
"تو گھر میں سارا دن رہ کر کیا کروں۔ چچا جان گوتم بدھ بنے جانے کس دھیان گیان میں گم رہتے ہیں۔ دادا اپنی کتابوں میں گم اور تم ...... تم کبھی دادا جان کی مددگار بنی ہوتی ہو اور کبھی اوپر والوں کے دکھڑے سن رہی ہوتی ہو مجھے تو تم ملتی ہی نہیں ہو۔"
اس نے گلہ کیا تھا یا یوں ہی بتایا تھا۔ زمل نے رخ موڑ کر بغور اسے دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں تھیں اور اندر کی تلخی اس کے چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی تھی۔
"تم آخر سب سے اتنے خفا کیوں ہو زین۔"
زمل کے لہجے میں نرمی تھی گداز تھا۔
"دوسروں سے نہیں خود سے خفا ہوں زمل، اپنے آپ سے ناراض رہتا ہوں۔"
"کیوں زین، کیوں خفا ہو خود سے۔" وہ بے چین سی ہوئی تھی۔
"کوئی مسئلہ ہے کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔ مجھ سے تو شیئر کر سکتے ہو نا۔ اور کسی سے نہ بھی کرو تو مجھ سے تو۔"
"کوئی مسئلہ نہیں ہے زمل، بس جاب نہ ملنے کی وجہ سے تھوڑا اپ سیٹ رہتا ہوں بس۔"
اب اس کے لہجے میں نرمی تھی۔
"جاب تو ملتی ہی ہے تمہیں لیکن تم پتا نہیں کیا چاہتے ہو۔ مرتضیٰ بتا رہا تھا کہ تمہیں ایک بہت اچھی جاب ملی تھی پچھلے ہفتے لیکن۔"
"اور مرتضیٰ نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ تنخواہ کتنی کم دے رہے تھے۔" اس نے تلخی سے اس کی بات کاٹی تھی۔
"تو ابتدا میں تو ایسا ہی ہوتا ہے زین۔ وقت کے ساتھ بڑھ جاتی ہے۔ جب انہیں تمہاری کارکردگی۔ تمہاری ذہانت کا اندازہ ہو جاتا تو خود ہی بڑھا دیتے تمہاری تنخواہ۔"
زمل کا انداز سمجھانے والا تھا۔ آزین خاموش ہی رہا تو کچھ دیر بعد زمل نے پھر مشورہ دیا۔
"تم مرتضیٰ کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ کم از کم تب تک جب تک تمہیں مطلب کی جاب نہیں ملتی۔"
"یہ مرتضیٰ آخر آج کل تمہارے ساتھ ہر بات کیوں ڈسکس کرنے لگا ہے۔"
اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلی تھیں۔
"نہیں میرے ساتھ تو نہیں وہ تو دادا جان سے کہہ رہا تھا تو میں نے سنا۔"
زمل کا انداز نارمل تھا۔
"اور دادا جان نے کیا کہا؟"
اس کی سوالیہ نظریں زمل کی طرف اٹھیں جن میں اب بھی ہلکی سرخی تھی۔
"انہوں نے کہا تھا زین زیادہ بہتر سمجھتا ہے کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے۔" زمل نے بتایا تو ایک طنزیہ سی مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے اس کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔
"دادا جان کو ایسے ہی کہنا چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ مرتضیٰ کیوں چاہتا ہے کہ میں اس

pklibrary.com

کے ساتھ پارٹنرشپ کرلوں۔"

"کیوں۔"

زمل نے بے اختیار پوچھا۔

"اس لیے کہ تایا جان اسے اپنا بزنس کرنے کے لیے ایک دھیلا تک دینے کو تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ پچھلے چھ ماہ میں وہ بزنس کے نام پر تایا جان سے کافی پیسہ لے کر ڈبو چکا ہے۔ اور اب اس کی نظر کرم مجھ پر ہے کہ میں اپنے والد محترم سے بیس پچیس لاکھ منگواؤں بزنس کے لیے اور میں ایسا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

اس کا انداز حتمی تھا اور زمل جانتی تھی کہ بیس پچیس لاکھ تو بہرحال بڑی رقم ہے وہ تو ایک دھیلا تک اپنے باپ سے لینے کو تیار نہیں تھا۔

اور پتا نہیں جاب کب ملے گی زین کو اور جب تک جاب نہیں ملے گی وہ یوں ہی رہے گا چڑچڑا اور تلخ سا، زمل نے سوچا۔

اور پتا نہیں یہ جن دوستوں میں سارا دن بیٹھا رہتا ہے وہ کیسے ہیں؟ کس قماش کے آج کل تو کسی پہ بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ کیا پتا کوئی دہشت گرد ہوں اور کل کو خودکش حملہ کروادیں اس سے۔

"یہ تم کون سا مسئلہ فیثاغورث حل کررہی ہو۔"

اسے سوچوں میں گم دیکھ کر آزین نے پوچھا تو اس نے سادگی سے اپنی سوچ اسے بتادی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ زمل نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور دیکھے چلی گئی۔ کتنے دنوں بعد وہ اس طرح ہنسا تھا۔

"تم بھی نا زمل شاہ زیب! میں کوئی اٹھارہ سال کا بچہ ہوں جو وہ مجھے جنت کا لالچ دے کر خودکش جیکٹ پہنادیں گے۔"

وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"تم فارغ رہنے کے بجائے ایم فل کیوں نہیں کرلیتے۔" اپنی جھینپ مٹانے کے لیے زمل نے فوراً مشورہ دیا تھا۔

"میں دادا جان کا مزید دست نگر نہیں رہنا چاہتا مشورہ بیگم۔" اس کے لہجے میں کچھ دیر پہلے کی خوشگواریت باقی تھی۔

"اچھا بتاؤ کیا پکایا ہے۔ مجھے کھانا کھا کر جانا ہے۔"

یخنی پلاؤ پکایا ہے۔ ابھی دم دے کر آئی تھی۔ رائتہ سلاد، پودینے کی چٹنی ہے۔ کل کے شامی کباب بھی ہیں کہو تو وہ بھی تل دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

آزین نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ کتنا خیال رہتا تھا اسے اس کا اور ایک وہ تھا کہ کبھی کسی موقع پر اس کے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا۔ حالانکہ اس سالگرہ پر وہ اسے کوئی خوب صورت گفٹ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ساری بچت دوستوں کو ولیج میں کھانا کھلانے پر صرف ہوگئی تھی۔

"ساجدہ..... ساجدہ پلیز چولھا بند کردینا۔"

زمل نے کچن کی صفائی کرتی لڑکی کو آواز دے کر کہا اور آزین کی طرف دیکھا۔

"کھانا کب تک کھاؤ گے۔"

"کچھ دیر تک کھالوں گا۔ ہاں شاید رات کو دیر سے آؤں پریشان مت ہونا۔"

"کہاں جاؤ گے۔"

وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"ایک خودکش حملے کی پلاننگ کرنی ہے۔"

وہ پھر ہنسا تھا اور زمل جھینپ گئی تھی۔

"یار زمل! دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن ہماری زندگی میں کوئی انقلاب کوئی تبدیلی کیوں نہیں ہوتی۔ بچپن سے اب تک وہی روٹین۔ سوچتا ہوں کیوں نہ کوئی خودکش حملہ کوئی دھماکہ وغیرہ کرکے زندگی میں کوئی تبدیلی لائی جائے۔"

اس کی خوش نما ہیزل براؤن آنکھوں میں شرارت تھی اور وہ دلچسپی سے زمل کو دیکھ رہا تھا۔ جب چھوٹے تایا کی سحرش ارباب نے رینگ سے جھانک کر، دونوں کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھا اور مڑ کر قریب ہی بیٹھی مہرین کو دیکھا، جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سامنے پڑی چھوٹی سی ٹیبل پر ٹانگیں رکھے اپنی میڈیکل کی موٹی سی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔

"مہرو..... مہرو ادھر دیکھو۔ کیسا رومانٹک سین

ہے۔ زین بھائی اور زمل سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے راز و نیاز کر رہے ہیں۔"

"اچھا۔"

مہرین اور نگ زیب نے اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے اسے دیکھا۔

"انہیں راز و نیاز کے لیے سیڑھیوں پر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے یہاں ریلنگ پر ہی لگی رہتی ہو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے نیچے درجنوں کمرے ہیں وہ کہیں بھی کسی بھی کمرے میں بیٹھ کر راز و نیاز کر سکتے ہیں۔"

مہرین کی عادت تھی بھگو بھگو کر مارنے کی لیکن ادھر بھی سحرش تھی، جو ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتی تھی۔ وہ ذرا سا منہ بنا کر پھر ریلنگ پر جھک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"تم زندگی میں کوئی تبدیلی کیوں چاہتے ہو زین! کیا تمہیں یہاں اس حویلی میں رہنا اور روٹین کے مطابق زندگی بسر کرنا اچھا نہیں لگتا۔" زمل سنجیدہ تھی۔

"پتا نہیں میں کیا چاہتا ہوں کوئی تبدیلی، کوئی انقلاب یا پتا نہیں کیا۔"

وہ خود الجھا ہوا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہماری زندگیوں میں اتنی بڑی تبدیلی آئی تو تھی آزین۔ جس نے ہمارے ہونٹوں کی ہنسی چھین لی تھی اور ہم نے بچپن میں ہی بڑھاپا اوڑھ لیا تھا۔ میری اماں کا دنیا سے گزر جانا۔ تمہارے اماں ابا کی علیحدگی اور پھر تمہارے ابا کی دوسری شادی، تو کیا اس سے بڑی تبدیلی بھی کوئی ہو سکتی ہے۔"

اس نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔

"میں دادا جان کی طرف جا رہا ہوں زمل! تم کھانا وہاں ہی لے آنا۔"

اس نے پہلے قدمچے پر قدم رکھا اور اوپر سحرش ارباب ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر پھر مہرین کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

"تم مانو یا نہ مانو ان دونوں میں کوئی چکر ہے۔"

"اچھا۔"

مہرین نے عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

"انہیں بھلا چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے سحرش بیگم۔"

"کیوں ضرورت نہیں۔ چکر تو چل ہی جاتا ہے ناجب دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوں اور زمل صاحبہ کے مقابل آزین جیسا لڑکا ہو اس قدر سمارٹ وجیہہ اور....."

"اس لیے کہ دونوں کا رشتہ بہت پہلے ہی طے ہو گیا تھا۔ تمہاری پیدائش سے بھی پہلے یعنی جب زمل شاہ زیب کی پہلی سالگرہ تھی اور آزین ظفریاب صرف تین سال کا تھا، تب دادا نے دونوں کا رشتہ طے کر دیا تھا۔" مہرین نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"یعنی کہ..... یعنی کہ زمل شاہ زیب آزین ظفریاب کی منگیتر مطلب فیانسی ہے۔"

وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں منگیتر نہیں، زمل آزین کی منکوحہ ہے۔ جب انکل ظفر امریکہ جا رہے تھے تو دادا جان نے دونوں کا نکاح کر دیا تھا۔" مہرین کی بات نے اسے مایوس کیا۔

"ہائے کیا دادا کو ہم نظر نہیں آئے تھے۔ چلو میں نہ سہی، تم، ماہ وش اور شانزہ تو تھیں نا تب۔ بس یہ دونوں ہی لاڈلے ہیں ان کے۔"

"خیر نکاح کے وقت تو تم بھی دنیا میں تشریف لا چکی تھیں۔" مہرین مدھم سا مسکرائی۔

"ہاں جب دادا جان نے رشتہ طے کیا تھا تو ہم تینوں تھے۔"

"اور تم تو زمل سے ایک سال بڑی تھیں پھر بھی دادا جان نے تمہارے بجائے۔"

سحرش کا افسوس ہی کم نہیں ہو رہا تھا۔

"شانزہ تو چلو آزین سے بڑی تھی لیکن تم اور ماہی تو۔ دادا کو کم از کم ان کے متعلق زمل سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم تو دادا کو بیچ میں نظر ہی نہیں آتے۔"

"دادا کو ہم، تم اس لیے نظر نہیں آتے سحرش بی بی، کہ یہ دونوں تو ہر وقت دادا جان کی نظروں کے

سامنے ہوتے ہیں ان کی خدمت کرتے ہیں۔ خیال رکھتے ہیں ان کا، تم تو کہیں مہینوں بعد دادا جان کے بار بار بلانے پر انہیں سلام کرنے جاتی ہو اور یہ ہی حال شانو اور ماہی کا ہے۔"

"توبہ ہے مہرو! کیا سچ سنانا ضروری ہوتا ہے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اور تم کون سا دوڑ دوڑ کر دادا جان کی خدمت کے لیے جاتی ہو۔ اگر جاتی ہوتیں نا تو دادا جان ضرور اپنے ہونے والی ڈاکٹر پوتی کا پلو آزین کی شرٹ سے باندھ دیتے۔"

اب آزین دوپٹا تو لیتا نہیں تھا، اس لیے اس نے شرٹ کہا تھا مہرین کو ہنسی آئی تھی لیکن وہ سنجیدہ سا منہ بنا کر سحرش کو دیکھنے لگی۔

"یعنی کہ دادا جان کو خیال ہی نہیں آیا کہ خاندان کی سب سے ذہین لڑکی کو خاندان کے سب سے وجیہہ لڑکے کے ساتھ باندھ دیں۔ بھلے بچپن میں رشتہ طے ہو چکا ہو۔ بچپن کے رشتے کی بھلا کیا اہمیت ہے، ہے نا۔"

"لیکن مجھے اس سڑو میں کوئی دلچسپی نہیں ہے میں تو۔"

"ہاں ہاں پتا ہے مجھے، تمہاری نظر میرے بھائی پر ہے۔ آزین کے بعد وہی تو ہے اس حویلی کا خوب صورت ترین لڑکا۔"

سحرش ہنسی اور کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ویسے میں نے غلط تو نہیں کہا تھا مہرو، دونوں کا نکاح ہو چکا ہے تو سیڑھیوں پر بیٹھ کر رومینٹک باتیں ہی کر رہے ہوں گے۔"

وہ پھر ریلنگ سے جھانکنے کے لیے اٹھی تھی۔

"کبھی تم نے ان کی باتیں سنی ہیں سحرش۔"

مہرین نے اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں۔"

سحرش نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے گندم رنگ رخساروں پر بکھری لالی کو دیکھا، جو مرتضیٰ ارباب کے نام پر ہمیشہ ہی رخساروں پر بکھر جاتی تھیں۔

"تو کبھی سننا تمہیں پتا چلے گا کہ آزین کے پاس قوم، سیاست مہنگائی، غربت، عوام، حکمران، انصاف ان کے علاوہ باتیں کرنے کے لیے اور کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ اور زمل اسے ہر وقت دوسروں کے غم ستاتے رہتے ہیں۔ ساجدہ کے، بی بی اماں کے، دادا جان کی کتابوں کے، شیخو بابا کی تنہائی کے، سلمیٰ آپا کی بے اولادی کے..... اور نہ جانے کیا کیا ایسے ہی غم وہ آزین سے شیئر کرتی رہتی ہے۔"

"اف او کس قدر بورنگ گفتگو کرتے ہیں وہ دونوں۔"

وہ پھر مایوس ہو کر ریلنگ پر لٹک گئی تھی لیکن نیچے سیڑھیاں خالی تھیں۔ آزین دادا کے کمرے میں اور زمل کچن میں جا چکی تھی جبکہ ساجدہ صحن میں جھاڑو دے رہی تھی۔

"اف کس قدر بوریت ہے یہاں۔ میں ذرا ماہی کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر لمحہ بھر کے لیے مہرین کے پاس رکی۔

"ہاں جاؤ لیکن کم از کم ایک گھنٹہ اس کے پاس بیٹھ کر بوریت دور کرنا۔" مہرین نے دوپٹے کے پلو سے عینک کے شیشے صاف کیے اور عینک لگا کر اپنی کتاب کھول لی۔

"اس گھر میں سب ہی بور ہیں سوائے میرے اور شاہ رخ کے۔"

"لیکن افسوس شاہو بھائی تو ماہی سے منسوب ہیں۔" مہرین کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"بکو مت مہرو! اب میں اپنی سگی بہن کے منگیتر پر بری نظر ڈالوں گی۔ تم بھی نا نیم حکیم خطرہ جان۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تو مہرین مسکرا کر اپنی کتاب پر جھک گئی۔

☆☆☆

ماہ وش اس کی ہم عمر تھی لیکن ماہ وش سے زیادہ اس کی سحرش سے بنتی تھی۔ اپنی بڑی بہن شانزہ سے بھی زیادہ وہ سحرش سے بے تکلف تھی۔ وہ ایف۔ اے کی طالبہ تھی۔ لیکن وہ شاہ رخ سے لے کر چھوٹے بلال تک کو نام لے کر ہی بلاتی تھی۔ کبھی کبھی تو لاؤ میں

آ کر اپنی اماں کو بھی مونا اماں کہہ کر بلا لیتی تھی۔ شروع شروع میں اماں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ یہ سب تمہارے بڑے، بہن بھائی ہیں۔ یا جی اور بھائی کہہ کر بلایا کرو۔ لیکن وہ بھی سحرش ارباب تھی۔

''احترام دل میں ہونا چاہیے تو وہ ہے پیاری اماں جانی۔ بس ہم تو نام لے کر ہی بلائیں گے سب کو۔''

تھک ہار کر انہوں نے ہی سمجھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور نگ زیب اور ارباب بیگ دونوں کی بیویاں بھی سگی بہنیں تھیں، سو آپس میں سب کی ہی خوب دوستی تھی البتہ نیچے والوں کے ساتھ تب بھی زیادہ دوستی نہیں تھی جب ظفریاب اور شاہ زیب کی بیویاں بھی نیچے ہوتی تھیں۔

دو سال پہلے ہی شاہ رخ اور ماہ وش کی منگنی ہوئی تھی، جبکہ ارباب بیگ اور ان کی بیوی مونا کی خواہش تھی کہ مرتضیٰ اور مہرین کی منگنی بھی کر دی جائے لیکن مرتضیٰ فی الحال اس کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے منگنی صرف شاہ رخ اور ماہ وش کی ہوئی تھی، البتہ دونوں بہنوں نے زبانی بات کر رکھی تھی جس کا علم بچوں کو نہیں تھا۔ شانزہ کا رشتہ بھی اپنے ماموں کے سسرالی عزیزوں میں ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب اور ان کی بیوی رخسانہ کا خیال دونوں بچوں کی شادی اکٹھی کرنے کا خیال تھا۔

زمل ٹرالی دھکیلتی دادا جان کے کمرے میں آئی تو جہاں زیب بیگ نیم دراز تھے اور آزین ان کی پائنتی بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

''بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔''

آزین نے ایک گہرا سانس لے کر چاولوں کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔

''میری بیٹی نے جو پکایا ہے۔''

جہاں زیب نے محبت سے زمل کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آزین اٹیچڈ واش روم میں ہاتھ دھونے چلا گیا۔

''شاہ زیب کو بھی بلا لو ہمارے ساتھ ہی کھا لے۔''

وہی ہر روز کا مخصوص جملہ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ شاہ زیب نہیں آئیں گے، برسوں سے انہوں نے سب کے ساتھ ٹیبل پر کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اب تو خیر سب تھے ہی کتنے۔ ظفریاب کے باہر جانے کے بعد وہ شاہ زیب سمیت چار ہی افراد تو رہ گئے تھے۔

''جی دادا جان کہہ دوں گی۔''

زمل بھی جانتی تھی کہ ابا اس کی بات نہیں مانیں گے لیکن وہ کہتی ضرور تھی۔

''تم بھی آ جاؤ نا زمل، کیا ہمارے ساتھ نہیں کھاؤ گی۔''

آزین ہاتھ دھو کر آیا تو ٹرالی میں دو پلیٹیں دیکھ کر زمل سے کہا۔

''ابا کو کھانا دینے جا رہی ہوں تو ان کے ساتھ ہی کھا لوں گی ورنہ اگر ایسے ہی کھانا دے کر آ گئی تو وہ خود سے نہیں کھائیں گے۔''

ابا کی یہ حالت اسے افسردہ کرتی تھی۔ کبھی جو جہاں زیب بیگ بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر زمل کو کھانا شاہ زیب کے کمرے میں لگانے کا کہہ دیتے تو شاہ زیب بے چین سے ہو جاتے۔ آزین اور باپ کی موجودگی انہیں بے چین سا کر دیتی تھی۔ وہ ایک آدھ لقمہ لے کر فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا لیتے تھے۔ زمل کے سامنے وہ پھر کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے تھے۔

''اب تو ان کی خوراک بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ بہت تھوڑا سا کھاتے ہیں۔''

''چچا جان کو کسی اسپیشلسٹ کو دکھاتے ہیں۔ میں بات کرتا ہوں مرسل سے۔ میرا دوست ہے اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر ہے۔''

اس نے باہر جاتے جاتے سنا آزین دادا جان سے کہہ رہا تھا۔

''یہ جسمانی بیماری نہیں ہے زین بچے! یہ تو کوئی اور ہی دکھ ہے۔ کوئی اور ہی روگ ہے جو زینی کو کھائے جا رہا ہے۔ کچھ بتاتا بھی نہیں کہ کیا روگ لگا بیٹھا ہے دل کو۔''

بیٹے کی حالت پر وہ دکھی تھے۔

''چچی جان کی موت کا دکھ دل سے لگا لیا ہے۔''

''پتا نہیں بیٹا..... زندگی میں تو اس بے چاری کی

قدر نہ کی، اپنی کمسنری کے نخرے میں ہی رہتا تھا اس کے بعد جانے کب کیسے کایا پلٹی کہ نوکری چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ کیسی آن بان شان والا تھا میرا زین۔"

زمل کو دادا کی آواز بھیگی بھیگی سی لگی تو وہ نم آنکھیں پونچھتے ہوئے تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

ساجدہ سارے کام سے فارغ ہو کر اب برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ شیخو بابا کی طرف کھانا بھجوایا۔ ساجدہ کو تازہ اور بچا ہوا کھانا دیا وہ عموماً کھانا گھر ہی لے جاتی تھی کہ بچے بھی کھالیں گے۔ اس خیال سے زمل کچھ زیادہ ہی پکاتی تھی کہ اس کے بچوں کے کام آجائے گا۔ وہ دوپہر تک کام سے فارغ ہو کر کھانا گھر لے جاتی تھی۔ دو ہی گھروں میں کام کرتی تھی۔

ایک ان کے ہاں اور ایک اعوان شوز والوں کے ہاں۔ پہلے ادھر جاتی تھی اور پھر ادھر آتی تھی۔ بچے چھوٹے تھے اور ساس بیمار تھی سو ادھر سے ہی کام کر کے گھر چلی جاتی تھی۔ اوپر والوں کا کام اس کی نند نے اٹھایا ہوا تھا۔ موروں والی حویلی میں آج کل کوئی کل وقتی ملازم نہیں تھا بس دونوں نند بھائی کام کر کے چلی جاتی تھیں۔ رضیہ کے جانے سے زمل کو تو کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

سال بھر پہلے وہ کام چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن اوپر نازیہ، شازیہ دونوں بہنوں کی شادی کے بعد تین ماہ سے مسلسل تلاش جاری تھی لیکن مطلب کی لڑکیاں نہیں مل رہی تھیں۔ ساجدہ کو رخصت کر کے وہ ٹرے اٹھائے شاہ زیب کے کمرے میں آئی تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ اکثر ہی بیڈ یا کرسی پر بیٹھنے کے بجائے نیچے کارپٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔

"ابا، کھانا کھالیں۔"

اس نے ٹرے ان کے سامنے قالین پر رکھا اور خود بھی نیچے ہی بیٹھ گئی تھی۔

"دادا جان کا دل چاہتا ہے آپ بھی ان کے ساتھ کھانا کھایا کریں۔ کیا خیال ہے دادا جان کے کمرے میں چلیں۔ آزین اور وہ ساتھ ہی کھانا کھا رہے ہیں۔"

شاہ زیب بیگ نے سر اٹھا کر زمل کی طرف دیکھا، ان کی بے حد خوب صورت آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔ زمل کو وہ گیلی گیلی سی بھی لگی تھیں۔ وہ جانتی تھی وہ جواب نہیں دیں گے اس نے ٹرے میں سے پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی۔

انہوں نے پلیٹ نہیں پکڑی تھی اور نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں ابا، تھوڑا سا تو کھائیں نا آپ، اتنے مزے کا مٹن پلاؤ ہے دادا جان اتنی تعریف کر رہے تھے۔"

اس نے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے اور ان کی طرف پلیٹ بڑھائی۔ جو انہوں نے پکڑ لی تھی۔

"اتنی تھوڑی خوراک ہوگئی ہے آپ کی صبح بھی آپ نے صرف چائے پی تھی۔ وہ بھی آدھا کپ اس طرح تو آپ کمزور ہو جائیں گے۔"

اس نے چمچی اور رائتہ بھی ان کی طرف بڑھایا۔

"آپ کیا سوچتے رہتے ہیں سارا دن، کیا اماں یاد آتی ہیں آپ کو۔"

اس کی نظر سامنے دیوار پر اماں اور ابا کی شادی کی تصویر پر پڑی۔ ابا تو کسی شہزادے کی طرح ہی لگ رہے تھے کہ وہ جہاں زیب بیگ کے چاروں بیٹوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت تھے۔ اونچا لمبا قد، خوب صورت تیکھے نقوش، شربتی آنکھیں، بلاشبہ ان کا شمار حسین مردوں میں ہوتا تھا۔

انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں ابا، مجھ سے تو دل کی بات کر لیا کریں نا۔ اچھا خیر چاول ٹھنڈے ہو جائیں گے کھالیں۔"

وہ رائتہ سلاد کچھ بھی ڈالے بغیر چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگے تھے۔ کبھی ٹیبل پر پورے اہتمام سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ چھری، کانٹے سب ہی ہوتے تھے۔

"کیسے ہیں اچھے ہیں نا۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے انہیں تھوڑا بہت کھانا کھلا دیا کرتی تھی اور وہ کھا بھی لیتے تھے ورنہ جب وہ یونی ورسٹی سے آتی تھی، ساجدہ کا رکھا ہوا کھانا ایسے ہی

ٹرے میں پڑا ہوتا تھا۔ پتا نہیں وہ ایسے کیوں ہو گئے تھے سب سے الگ تھلگ خاموش، زمل کو یاد تھا جب اماں زندہ تھیں تو وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ ڈی سی تھے اور ان کی پوسٹنگ مختلف شہروں میں ہوتی رہتی تھی لیکن ہر ویک اینڈ پر وہ حویلی آتے تھے اور کبھی لمبی چھٹیاں لے کر بھی آتے تھے۔ تو ان کے مہمان بھی آتے رہتے تھے۔

وہ بہت خوش پوشاک تھے اور وہ مغرور سے لگتے تھے۔ دادا جان کہتے تھے تیری دادی اور تیری اماں نے اس کے آگے پیچھے پھر پھر کر اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ مزاج ہی نہیں ملتے تھے صاحبزادے کے لیکن جانے اماں کے بعد کیا ہو گیا تھا انہیں۔ تب وہ بارہ سال کی تھی جب اماں صرف چند ماہ بیمار رہ کر چل بسی تھیں۔ پہلے وہ سنجیدہ ہوئے تھے پھر کم گو ہوئے اور مختصر بات کرتے تھے۔ لیکن اب تو عرصہ ہوا انہوں نے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا بلکہ جاب چھوڑ کر گوشہ نشین ہی ہو گئے تھے۔

زمل سوچ سوچ کر ان سے باتیں پوچھتی تھی، ایسے سوال کرتی تھی جن کے جواب طویل ہوں لیکن ان کا جواب مختصر ہی ہوتا تھا۔

"اچھا بتائیں آپ کو اماں کے ہاتھ کا پکا ہوا کون سا کھانا پسند تھا۔"

"سب۔"

وہی مختصر جواب۔

"دادا جان کہتے ہیں میرے ہاتھ میں اماں کے ہاتھ کا ذائقہ ہے۔ کیا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ نیچے ٹرے میں رکھ دی تھی۔ زمل نے دیکھا۔ انہوں نے چند لقمے ہی لیے تھے۔

"دادا جان کہتے ہیں آپ کو گرائنڈر میں بنی ہوئی چٹنی پسند نہیں تھی۔ اماں آپ کے لیے کونڈی میں بناتی تھیں۔ میں نے بھی آپ کے لیے کونڈی میں بنائی ہے لیکن آپ نے چکھی تک نہیں۔"

وہ ایسے ہی کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھی۔ انہوں نے ایک چمچ میں چٹنی ڈال کر یوں ہی کھالی، زمل کو یوں لگا جیسے وہ مدھم سا مسکرائے ہوں وہ خوش ہو گئی تھی۔

"ابا! آپ باتیں کیا کریں نا۔ جو کھانے کو دل چاہے۔ بتایا کریں۔ میرا جی چاہتا ہے میں آپ کی فرمائش پر کچھ پکاؤں۔ کچھ ایسا جو آپ کو بہت پسند ہو۔"

یہ ہی باتیں وہ اکثر دہراتی رہتی تھی۔ اپنے چاول ختم کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"قہوہ بنانے لگی ہوں آپ پئیں گے۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ کچھ دیر لیٹ جائیں صبح سے یوں ہی بیٹھے ہیں تھک گئے ہوں گے۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جلدی سے بیڈ کی چادر درست کر کے اس نے انہیں لیٹنے میں مدد کی۔ وہ کچھ دیر بیڈ کے پاس کھڑی زمل کو دیکھتے رہے، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگایا اور زمل کا دل جیسے کھنچنے لگا۔ ابا کے اس التفات پر یک دم آنسوؤں کا ریلا آنکھوں تک آیا تھا۔ لیکن اس نے بمشکل ان بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا اور ان کے ہاتھ پر پیار کیا، اپنا ہاتھ چھڑا کر انہوں نے دیوار کی طرف کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لمحہ بھر کھڑا رہنے کے بعد وہ ٹرے اٹھا کر کچن میں آئی تو آنکھوں سے آبشار بہہ نکلا تھا۔

"ابا ایسے کیوں ہیں کاش وہ بھی بڑے تایا اور چھوٹے تایا کی طرح ہوتے میری فکر کرتے میرے لیے پریشان ہوتے میں ان سے اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں شیئر کرتی۔ سحرش کی طرح ان سے فرمائشیں کرتی۔" دادا جان کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور چولہے کی طرف رخ کر کے کھڑی ہو گئی۔ آزین ٹرالی لا رہا تھا۔

"تم کہیں جانا نہیں آزین، دادا جان کے کمرے میں ہی بیٹھو میں قہوہ بنا کر لا رہی ہوں پیو گے نا۔"

اس نے رخ موڑے بغیر کیبنٹ سے ساس پین نکالا۔

"پی لوں گا۔"

وہ دروازے سے ہی مڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر قہوے کے تین کپ، وہ ٹرے میں رکھے

دادا جان کے کمرے میں آئی تو دادا جان اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ سارا دن کہاں غائب رہتا ہے۔

"کہیں بھی نہیں دادا جان! بس دوستوں کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

شکر ہے دادا جان نے بھی پوچھا تھا۔ زمل دونوں کو کپ پکڑا کر اپنا کپ لے کر بیڈ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ پڑی، کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تھی۔

"کون سے دوست زین! مرتضیٰ کہہ رہا تھا کہ تمہارے یہ دوست کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔"

جہاں زیب بیگ کی آنکھوں سے پریشانی جھانکتی تھی۔

"کیا مرتضیٰ آج کل میری مخبری پر لگا ہوا ہے کوئی اور کام نہیں ہے اسے۔" وہ خفا ہوا تھا۔

"بیٹا، یہ سیاست وغیرہ کے چکروں میں مت پڑنا۔ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے یہ۔"

دادا جان نے اس کی بات نظر انداز کی تھی۔

"نہیں دادا جان! میں تو بس وقت گزارنے چلا جاتا ہوں۔ مرسل میرا یونی ورسٹی فیلو ہے۔ اسی کے دوست ہیں رضا وغیرہ۔"

اب کے اس کا لہجہ نرم تھا۔

"اور تمہارے باپ کا کوئی فون یا خط آیا۔"

جہاں زیب بیگ نے بھی موضوع بدل دیا۔

"دراصل میں نے سم بدل لی ہے ان کے پاس نیا نمبر نہیں ہے۔ اور خط آئے تو تھے دو تین میں نے پڑھے نہیں ہیں۔"

وہی ظفریاب کے ذکر پر اس کا لاپروا، انداز۔

جہاں زیب نے ایک گہری سانس لی۔

"باپ ہے تمہارا کبھی اس کی خیریت پوچھ لیا کرو اور کبھی اپنی خیریت بتا دیا کرو۔"

ظفریاب نے ان سے گلہ کیا تھا کہ وہ ان کا فون نہیں سنتا اب تو سم ہی بدل لی ہے۔ خط لکھا تو جواب تک نہیں دیا۔ وہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا، کوشش کرتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ لیکن زمل کے سامنے بے حد بولتا تھا کہ اسے اپنے باپ سے بے حد، بے حساب گلے تھے۔ قہوہ پی کر خالی کپ سینٹر ٹیبل پر رکھ کر وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"زمل بیٹی، اسے سمجھایا کرو خوامخواہ ہی باپ سے ناراضی پال کر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تو ہمیں ہی الزام دے گا نا۔" وہ افسردہ سے تھے۔

"جی دادا جان۔"

وہ قہوے کے خالی کپ اٹھا کر تیزی سے آزین کے پیچھے لپکی۔

"سنو آزین۔ دیر سے بھی آئے تو کھانا تو گھر پر ہی کھاؤ گے نا تو پھر رات کے لیے کیا پکاؤں۔"

ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف جاتے جاتے آزین یک دم مڑا تھا، اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا دلکش سراپا، لانبی گھنی پلکوں والی بے حد سیاہ آنکھیں، جو سوالیہ انداز میں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور بے حد دلربا نقوش۔

"یہ کیا ہے ناتم نے خالص بیویوں والی بات۔"

"کیا مطلب۔"

وہ بوکھلائی۔

"مطلب کہ بیویاں اس طرح شوہروں سے پوچھتی ہیں کہ کیا پکائیں آج چاہے، بعد میں وہ پکائیں اپنی مرضی سے ہی۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"بکو مت، بہت فضول بولتے ہو۔"

اس کے رخساروں پر لمحہ بھر کے لیے شفق نمودار ہوئی تھی اور گھنی پلکیں ہولے سے لرزی تھیں۔

"اس میں فضول بات کیا ہے بھلا۔"

اس کا موڈ یک دم ہی خوش گوار ہو گیا تھا۔

"کیا بیوی نہیں ہو میری۔"

"دادا جان تو رات کو کھانا کھاتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے تم سے پوچھ لیا کرے۔"

زمل کی نظریں جھک گئیں۔

"بھئی جس لیے بھی پوچھا یہ بتاؤ تم کیا میری

بیوی نہیں ہو۔" اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور وہ جیسے پوری فرصت سے کھڑا اسے نظروں ہی نظروں میں دل میں اتار رہا تھا۔

"کیوں کیا تم نہیں جانتے۔"

وہ جھنجلائی تھی۔

"میں تو جانتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دوسرے کو بھی پتا چل جائے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے دادا جان سے کہتا ہوں وہ اب تمہیں رخصت کردیں۔ مجھے سر پر سہرا باندھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

اس کی پرشوق نظروں نے اس کے پورے وجود کو حصار میں لیا تھا۔

"ہاں..... نہیں..... پلیز ابھی نہیں زین ابھی مجھے اپنی پڑھائی تو مکمل کرنے دو، چند ماہ ہی تو رہتے ہیں فائنل میں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"تو پیپرز تو شادی کے بعد بھی دیے جاسکتے ہیں۔"

وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا، پتا نہیں سنجیدہ تھا یا یونہی اسے تنگ کر رہا تھا۔

"نہیں زین، شادی کے بعد اتنی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں کہ پھر پڑھائی کی طرف توجہ نہیں رہتی۔"

وہ الجھی ہوئی تھی۔

"خیر تمہاری ذمہ داریاں تو نہیں بڑھیں گی اور لڑکیوں کی بڑھ جاتی ہوں گی کیونکہ میں تو اب بھی تمہاری ہی ذمہ داری ہوں۔ بھلا تمہیں کیا فرق پڑے گا سوائے اس کے، کہ اپنے کمرے سے میرے کمرے میں منتقل ہو جاؤ گی۔"

ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں شرارت نظر آئی تھی۔ آج سے پہلے تو اس نے اس طرح کی کبھی بات نہیں کی تھی پھر آج یہ آزین کو کیا ہو گیا تھا۔ زمل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملیں تو اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

"نہیں زین، پھر تمہارے ساتھ اور بھی ذمہ داریاں بڑھ....." اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی رخسار تپ اٹھے۔

"مثلاً کیا ذمہ داریاں۔"

آنکھوں میں شرارت لیے وہ اسے آج بچ میں حیران کر رہا تھا۔

"اوہ اچھا سمجھا..... تمہارا مطلب ہے بچے..... ہاں خیر وہ تو بھی ہوں گے ہی اور مجھے تو کم از کم چار بچے پسند ہیں۔"

تب ہی ریلنگ پر جھکی سحرش نے آواز دی۔

"زمل..... زمل..... تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔ ان کی بات سن جاؤ۔"

"جاؤ۔"

زین کا موڈ یک دم خراب ہوا تھا۔

"تائی اماں کے دکھڑے سنو جا کر اور ہاں خاص میرے لیے کچھ مت بنانا۔ میں رات دیر سے آیا تو شاید کھانا کھا کر ہی آؤں۔"

وہ تیز تیز چلتا ہوا ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر پوری طاقت سے بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور وہ صحن کے درمیان حیران سی کھڑی رہ گئی تھی۔

"تو تم آرہی ہو نا زمل۔"

سحر ابھی تک ریلنگ پر لٹکی ہوئی تھی۔

"جلدی آنا تمہیں پتا تو ہے نا ہماری مونا اماں کے حکم کی فوراً تعمیل نہ ہو تو انہیں اختلاج ہونے لگتا ہے۔"

"کچھ دیر میں آتی ہوں۔"

زمل نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ یہ سحرش بھی نا ہمیشہ غلط وقت پر انٹری دے کی کتنے سارے دنوں بعد آزین کا موڈ آج خوش گوار لگ رہا تھا اور ایک گہری سانس لے کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جانتی تھی، جب تک تائی جان کی بات نہیں سن لے گی انہیں چین نہیں آئے گا۔

☆☆☆

"دادا جان! ابا ایسے کیوں ہو گئے ہیں اتنے چپ چپ اپنے آپ سے بیگانہ۔"

فارسی کے قلمی نسخوں کو الگ کرتے ہوئے زمل نے کئی بار کی پوچھی ہوئی بات پھر پوچھی تھی۔

"ہاں کیسے ہو گئے ہیں تمہارے ابا۔"

جہاں زیب بیگ نے پھٹے ہوئے صفحوں کو ٹیپ سے جوڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، شاید انہوں نے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی۔

"چپ، گم سم جیسے ان کا کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہو اور جیسے وہ عمر بھر کی پونجی ہار بیٹھے ہوں۔"

زمل نے ایک بوسیدہ سا دیوان اٹھایا اور اس کے ورق الٹنے لگی تھی۔

"تمہاری اماں کی موت سے بڑا نقصان کیا ہوگا۔ شاید اسی کا غم اندر اندر کھا رہا ہے اسے۔"

مرزا جہاں زیب نے ہاتھ میں پکڑی کتاب رکھ کر ایک اور کتاب اٹھالی۔

"بارہ برس تو ہو گئے اماں کو رخصت ہوئے اور ابھی تک ابا اس غم سے نہیں نکل سکے۔ دادا جان آپ نے بھی تو کوشش نہیں کی انہیں اس غم سے نکالنے کی اور نہ ہی تایا جان وغیرہ نے۔"

اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا شکوہ در آیا تھا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے جہاں زیب بیگ کتاب رکھ کر، پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"ایسا نہیں ہے زمل بچے، تمہارے ظفر تایا اور میں نے تو بہت کوشش کی، ظفر تو جب تک پاکستان میں رہا۔ جتنی دیر گھر میں رہتا شاہ زیب کے ساتھ ہی رہتا۔ ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا۔ اصل میں چپ اسے تمہاری اماں کی زندگی میں ہی لگ گئی تھی۔ تمہاری اماں کی موت سے سال بھر پہلے ہی چپ چپ رہنے لگا تھا۔

شاید اسے پتا چل گیا تھا تمہاری اماں کی بیماری کا۔ اس نے ہم سب سے چھپایا لیکن خود اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ ہمیں تو آخری دنوں میں ہی پتا چلا کہ اسے کینسر تھا۔ تمہاری اماں کے جانے کے بعد تو بالکل گم سم ہو گیا تھا۔ حالانکہ پہلے تو تمہیں پتا نہیں یاد ہے کہ نہیں جتنا عرصہ یہاں رہتا دوستوں کا جمگھٹا لگائے رکھتا تھا۔

تمہاری اماں کے بعد سال یا شاید ڈیڑھ سال بعد جاب بھی چھوڑ دی اور جاب چھوڑنے کے بعد نہ جانے کہاں چلا گیا۔ چھ ماہ تک تو کوئی خیر خبر نہیں ملی اور پھر ظفر یاب کو ہی اچانک ہری پور میں مل گیا اور وہ اسے گھر لے آیا اور ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھرتا رہا۔ جانے کیا روگ لگا بیٹھا تھا۔ تمہاری اماں کی زندگی میں تو کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا اس کی اور تمہاری اماں۔"

وہ ہولے سے ہنسے۔

"بڑی نیک روح تھی کبھی گلہ نہیں کیا۔ کبھی ساتھ جا کر رہنے کی ضد نہیں کی۔ حالانکہ تمہاری تائیاں بہت اکساتی تھیں اسے، کہ میاں کے ساتھ کیوں نہیں جاتی ہو۔ ہمارا میاں ہوتا نا ڈپٹی کمشنر تو ہم ایک دن بھی یہاں نہ رہتے۔

تو وہ کہتی مجھے نہیں شوق فیتے کاٹنے کا۔ میں نے اور تمہاری دادی نے بھی کتنی ہی بار شاہ زیب سے کہا کہ مریم کو بھی ساتھ لے جاؤ لیکن وہ کہتا۔

آئے روز تو تبادلہ ہوتا رہتا ہے خوامخواہ زمل کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔

"تو زمل کو یہاں چھوڑ جاؤ بس مریم کو لے جاؤ۔ اکیلا بندہ تو گھبرا ہی جاتا ہے۔"

"ارے اماں اکیلا کہاں ہوتا ہوں اتنا اسٹاف ہوتا ہے وہاں۔"

"اس کے پاس تو سینکڑوں جواز اور دلیلیں ہوتی تھیں لیکن تیری دادی بہت دکھی ہوتی تھی، تیری اماں کی بھانجی تھی اس کی۔ اکثر مجھ سے گلہ کرتی تھی کہ زمی مریم کا اس طرح خیال نہیں رکھتا جیسے باقی تینوں رکھتے ہیں اپنی بیویوں کا۔"

جہاں زیب بیگ آج پہلی بار اس طرح اماں اور ابا کے متعلق بات کر رہے تھے۔ زمل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب نیچے رکھ دی ماں کے ذکر پر اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ ماں تھی نہیں اور باپ خود سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

وہ بارہ سال کی تھی جب اماں اچانک بیمار ہوئیں، باقی لوگوں کو تو چھ سات ماہ سے ان کی بیماری کا علم تھا لیکن اسے تو اچانک ہی پتا چلا تھا۔

اور وہ ایک ہفتے کے اندر اندر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اسے تو ان کے جانے کے بعد پتا چلا تھا کہ

انہیں کینسر تھا۔ اپنے آخری چند مہینوں میں اماں اسے پاس بٹھا کر گھنٹوں باتیں کرتی تھیں۔ کچن میں بھی اسے ساتھ لگائے رکھتی تھیں۔ ابا کی پسند ناپسند کے متعلق بتاتی تھیں۔

ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ بارہ سال کی عمر میں ہی وہ سب کچھ اسے سکھا دیں، جو وہ خود جانتی ہیں اور اپنا سارا علم و ہنر اس میں انڈیل دیں۔ کبھی کبھی تو وہ چڑ جاتی تھی لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ اماں شاید اسے اس وقت کے لیے تیار کر رہی تھیں جب انہیں نہیں ہونا تھا ان کی کہی باتیں، نصیحتیں، دعائیں جیسے اس کے دل پر کھب گئی تھیں۔ جب کبھی وہ الجھ جاتی اسے سمجھ نہ آتا کہ وہ کیا کرے۔ اماں کی کہی ہوئی کوئی بات یاد آ کر اسے اس الجھن سے نکال لیتی۔

"مجھے لگتا ہے شاہ زیب کو پچھتاوا مار رہا ہے۔"

تیری ماں کا خیال نہ رکھنے کا پچھتاوا۔

اس کی پروانہ کرنے کا پچھتاوا۔

اتنی تھوڑی سی زندگی لے کر آئی تھی مریم اور اس تھوڑی سی زندگی میں شاہ زیب نے کتنا تھوڑا وقت دیا تیری ماں کو۔ جب بھی آتا ہوا کے گھوڑے پر سوار، کبھی جو چند دن رکتا تو مہمان خانے میں دوستوں کے ساتھ ہی مصروف رہتا۔ بس گھڑی دو گھڑی کو ہی اندر آتا۔ اور تیری ماں اتنی صابر کہ نہ کبھی کوئی گلہ کیا نہ کوئی جھگڑا۔" ماں کو یاد کر کے اس کی ہی آنکھیں نم نہیں ہوئی تھیں جہاں زیب بیگ کی پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

"بہت کم عمر تھی مریم صرف اٹھارہ سال کی شاہ زیب نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ اسے اتنی کم عمر لڑکی سے شادی نہیں کرنی — پر تیری دادی کی ضد کہ سوتیلی ماں کا سلوک اچھا نہیں ہے مریم کے ساتھ کسی دن کسی بڈھے کے پلے باندھ دے گی اور میں نے مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا کہ مریم کو اپنے شاہ زیب کی دلہن بنا کر لے جاؤں گی۔ پہلے تو شاہ زیب بہت بولا پھر خاموش ہو گیا اور پھر تیرہ سال بعد۔ صرف اکتیس سال کی عمر میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس کے مرنے کی عمر تو نہیں تھی زلی۔"

جہاں زیب بیگ نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھیں۔ "تم پوچھتی ہو نا تمہارے ابا کو کیا ہوا ہے تو میرا دل کہتا ہے اسے پچھتاوے کا روگ کھا رہا ہے۔"

"پر دادا جان بارہ سال ہو گئے ہیں۔"

اس کی آواز بھرا گئی تو جہاں زیب بیگ نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا، اس نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا۔

"کیا ابا کہیں اور شادی کرنا چاہتے تھے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی، ہاں مریم اور شاہ زیب کی عمر میں دس سال کا فرق تھا۔ وہ اٹھائیس سال کا تھا اور کہتا تھا۔ اسے کسی ہم عمر اور میچور لڑکی سے شادی کرنی ہے اور پھر اگر وہ کسی کو پسند کرتا تو ضرور بتاتا، وہ ایسے دل میں تو بات رکھنے والا نہیں تھا اور میرا نہیں خیال کہ تمہاری دادی پھر بھی اسے مجبور کرتی مریم سے شادی کرنے پر۔

تمہارے بڑے بابا کی شادی ہوئی تو ارباب نے شادی میں ہی تمہاری تائی کی چھوٹی بہن کو پسند کر لیا۔ جبکہ تمہاری دادی کو وہ بالکل پسند نہیں تھی۔ دو تین بار سمجھایا ارباب کو، وہ نہیں سمجھا تو چپ کر گئی کہتی تھی ہے تو چھچھوری اور بے لحاظ پر مجھے کیا زندگی ارباب نے گزارنی ہے تو گزار لے گا۔"

وہ مسکرائے

"پر اب تو..... اب تو ابا کو اس پچھتاوے سے نکل آنا چاہیے نا دادا جان۔ بارہ سال بہت نہیں ہوتے کیا۔"

اس نے دل گرفتگی سے پوچھا۔

"ہاں اب تو۔ ارے ہاں تم زیب النساء مخفی کا دیوان ڈھونڈ رہی تھیں سیدھا۔"

انہوں نے جھک کر ایک بوسیدہ سا دیوان اٹھا کر زلی کو دیتے ہوئے، موضوع بدلنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے کہ وہ اپنا سوال بھول کر، بہت احتیاط اور شوق سے اوراق پلٹ رہی تھی۔

''دادا جان! کیا یہ اصلی دیوان ہے۔ ہماری ٹیچر کہتی تھیں کہ لوگوں نے نہ جانے کس کا دیوان اس کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔''

''پتا نہیں''

جہاں زیب بیگ نے اس کے ہاتھ سے دیوان لے کر دیکھا۔

''تیرہویں ہجری میں چھپنے والا یہ دیوان لاہور کے مشہور عالم پریس نے چھاپا تھا۔

تو مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اصلی ہی ہے۔''

''تو کیا اس میں وہ اشعار ہیں جو ہماری ٹیچر نے سنائے تھے۔''

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کون سے اشعار۔''

جہاں زیب بیگ نے دیوان اسے پکڑایا۔

''ایک تو وہی جس کا پہلا مصرعہ کسی اور شاعر نے پڑھا تھا اور کوئی درباری شاعر اسے مکمل نہیں کر سکا تھا لیکن زیب النساء نے اسے مکمل کیا تھا۔

بیگانہ وار می گزری از دیار چشم

(آنکھوں کے دیار سے تو اجنبیوں کی طرح گزر گیا)

''اے نور دیدہ حب وطن در دل تو نیست''

(اے آنکھوں کے نور تیرے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے۔)

''یاد نہیں۔ بہت پہلے سرسری سا دیکھا تھا تم خود دیکھ لو۔''

موضوع بدل گیا تھا جہاں زیب بیگ نے اطمینان محسوس کیا۔ ورنہ زمل کی اداسی اور نم آنکھیں دیکھ کر، ان کا دل بھاری ہو گیا تھا کہ خوامخواہ گزری باتیں دہرائیں۔ زمل پھر اوراق پلٹنے لگی تھی۔

''ہاں یہ آزین کہاں ہے صبح سے نظر نہیں آیا۔''

''وہ تو آج صبح ناشتے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔''

اس نے دیوان بند کر کے واپس کتابوں کے ڈھیر پر رکھ دیا تھا۔ ''مرتضیٰ کہہ رہا تھا شاید گوجرانوالہ گیا ہے۔ اس کی پارٹی کی کوئی میٹنگ تھی۔''

''کیسی پارٹی۔''

جہاں زیب بیگ چونکے تو وہ جھجکی۔ جانتی تھی دادا جان اس بات کو پسند نہیں کریں گے لیکن اب زبان سے نکل گیا تھا تو اس نے سوچا بتا ہی دے تاکہ وہ اسے سمجھائیں۔

''اس نے کوئی پارٹی جوائن کر لی ہے۔''

''لیکن میں نے اسے منع کیا تھا۔ سیاست وغیرہ میں پڑنے سے۔'' جہاں زیب بیگ پریشان ہو گئے تھے۔

''کیا جانتا نہیں ہے اس کے باپ نے اس سیاست کے چکر میں کتنی اذیت اٹھائی تھی۔''

انہوں نے جھرجھری سی لی تھی۔

''تم نے اسے سمجھایا نہیں زمل۔''

وہ اسے کیا سمجھاتی اس نے کون سا اسے بتایا تھا یہ تو اس کے جانے کے بعد، مرتضیٰ نے بظاہر سرسری سا ذکر کیا تھا لیکن وہ جانتی تھی اس کا مقصد اسے بتانا تھا۔ مخاطب مونا تائی تھیں۔

''اور کیا کہہ رہا تھا مرتضیٰ۔''

اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

مرتضیٰ نے تو اور بھی بہت کچھ کہا تھا لیکن وہ دادا جان کو بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کچھ نہیں دادا جان۔''

''اس نے کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی اور ہاتھوں سے اس کے بوسیدہ ورق کو سیدھا کرتے ہوئے سلوشن ٹیپ اٹھائی۔

''بس کر دو بیٹی، اب تھک گئی ہو گی باقی کام کل کریں گے۔ میں بھی ذرا شاہ زیب کے پاس جاتا ہوں۔ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ اب آرام کے بجائے اوپر نہ چل دینا۔ یہ آج کل میمونہ کو بھی تم سے بہت کام پڑنے لگے ہیں۔''

وہ میمونہ تائی کے اسے بار بار اوپر بلانے پر کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔

''وہ دراصل شادی کی تیاری کرنا ہے نا انہوں نے تو بس اسی لیے دو تین بار وہ مجھے شاپنگ کے لیے

بازار لے کر گئی تھیں، پھر کچھ دوسرے کام وغیرہ بھی تھے۔ جوڑے وغیرہ سیٹ کرنا تھے۔"

"اوپر چار چار لڑکیاں ہیں تو ان سے کیوں نہیں کہتی۔ انہیں ساتھ لے جائے شاپنگ کے لیے۔ کل بھی تم اتنی دیر سے آئیں میرا دل گھبرانے لگا تھا۔"

انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

"کیا کروں دادا جان اب مونا (میمونہ) تائی کو انکار تو نہیں کرسکتی نا۔"

وہ مدہم سا مسکرائی۔

"مہرین اپنی پڑھائی میں مصروف ہے۔ اس کا فائنل ہے۔ شانزہ اور ماہ وش آپی کی شادی ہے تو تائی کا خیال ہے کہ انہیں اس گرمی میں باہر نہیں جانا چاہیے۔ رنگت جل جائے گی۔ اور سحرش ابھی بچی ہے۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ جہاں زیب بیگ نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے اس نے فوراً اٹھ کر دیوار کے کونے میں رکھی ان کی چھڑی اٹھا کر انہیں پکڑائی۔

"نہیں رہنے دو۔"

انہوں نے چھڑی واپس کردی۔

"اس کی ضرورت نہیں اور ہاں عصر کی نماز کے بعد چائے بنا کر شاہ زیب کے کمرے میں ہی لے آنا۔"

سر ہلا کر چھڑی کونے میں رکھ کر وہ بکھری ہوئی کتابیں اٹھا کر، ایک طرف ترتیب سے رکھنے لگی۔

جہاں زیب بیگ کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ کتابیں رکھ کر اس نے ان کے بیڈ کی چادر درست کی۔ اور بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔

"پتا نہیں یہ زین کیا کرتا پھر رہا ہے اور اس نے کون سی پارٹی جوائن کی ہے۔ اور جانے کیسے لوگ ہیں دادا جان نے کتنا منع کیا تھا اسے پھر بھی۔ یہ ساری سیاسی پارٹیاں ایک جیسی ہوتی ہیں مطلبی۔ انہیں کب پروا ہوتی ہے اپنے کارکنوں کی بھلے وہ جان سے گزر جائیں ان کی بلا سے۔ آج وہ ماہ وش کے دوپٹوں پر لیس لگا کر اوپر دینے گئی تھی جو تین دن پہلے مونا تائی نے اسے دیئے تھے۔ واپس آتے ہوئے سیڑھیوں کے پاس اسے مرتضیٰ ملا تھا۔ وہ مونا تائی کے کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے ہی سیڑھیوں تک آیا تھا۔

"کیسی ہو زنل!"

"ٹھیک ہوں۔"

"تمہیں کچھ خبر بھی ہے یہ زین کیا کرتا پھر رہا ہے۔"

اس نے مونا تائی سے کی گئی بات کو دہرایا تھا۔

"کیا۔"

وہ جو اس کو جواب دے کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکی تھی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گہری اندر تک اترتی نظروں سے اسے الجھن ہوئی۔ پتا نہیں کیوں آج کل مرتضیٰ اسے ایسی ہی گہری نظروں سے دیکھتا تھا۔

"عجیب عجیب لوگوں سے دوستی کر رکھی ہے اس نے تمہیں پتا ہے، آج بھی گوجرانوالہ گیا ہوا ہے۔ کسی سیاسی پارٹی کو جوائن کرلیا ہے اس نے۔ مجھے تو تمہارا مستقبل بہت مخدوش لگ رہا ہے زنل۔ جاب وہ کرتا نہیں۔ میری بزنس آفر اس نے ٹھکرادی ہے تو کرے گا کیا آخر۔ کیا تم اسے کما کر کھلاؤ گی زنل یار سمجھاؤ اسے۔"

وہ جیسے اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔

"اس نے کئی جگہوں پر اپلائی کر رکھا ہے ان شاءاللہ جلد جاب مل جائے گی۔"

اسے مرتضیٰ کا اس طرح بات کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

تب ہی دروازہ کھول کر آزین کمرے میں داخل ہوا تو وہ چونکی اور مڑ کر دیکھا۔ آزین ناک سکیڑ کر پرانی کتابوں کی مخصوص بو جو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ رخ موڑ کر تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی جس کا جہاں زیب بیگ

pklibrary.com

مطالعہ کر رہے تھے۔ پھر اسے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا۔

"دادا جان کہاں ہیں۔"

"ابا کے کمرے میں۔"

اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تم سارا دن اس بو سے اکتاتی نہیں ہو۔ یہ پرانی کتابوں کی بو اور یہ......"

اس نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو آزین کو محسوس ہوا جیسے وہ ناراض ہو۔

"کیا ناراض ہو۔"

"نہیں"

مختصر جواب دے کر اس نے باہر جانا چاہا لیکن وہ دروازے کے بالکل سامنے اس طرح کھڑا تھا کہ وہ اسے ہٹائے بغیر باہر نہیں جا سکتی تھی۔

"راستہ دو زین!"

"اگر نہ دوں تو۔"

وہ زیادہ پھیل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سائیڈ سے نکلنا چاہا تو آزین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بہت موڈ خراب ہے۔"

"تمہیں کسی کے موڈ کی کیا پروا ہے زین۔"

دل ہی دل میں کہتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا آزین کی طرف دیکھا۔

"یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا ملی۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ اور یہ مسکراہٹ زنل کے دل کو اتھل پتھل کر رہی تھی بقول سحرش کے، اس مسکراہٹ پر تو سو خون معاف کیے جا سکتے ہیں اور تم کیسی پتھر دل ہو کہ ایسا پتھر چہرا لیے کھڑی ہو جیسے مسکراہٹ تمہارے مجازی خدا کے لبوں پر نہیں کسی اجنبی کے ہونٹوں پر تمہیں دیکھ کر چمکی ہو۔"

اس روز وہ مونا تائی کے بلانے پر اوپر گئی تھی اور سحرش نے اسے ٹیرس پر ہی روک لیا تھا۔

"کمال ہے یار، جب سے مجھے تمہارے اور زین کے رشتے کا پتا چلا ہے تب سے میں تمہاری جاسوسی کر رہی ہوں لیکن مجھے تم دونوں میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی، جو دو نکاح شدہ بندوں میں ہونی چاہیے۔ نہ مسکراہٹوں کا تبادلہ نہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں میں جگنو چمکنا نہ، نہ جھجکنا، ٹھٹکنا یہ تم کیسے لو برڈ ہو زنل شاہ زیب۔"

"ہم تو بس ایسے ہی ہیں سحر۔" وہ مسکرائی تھی۔

"اتنے روکھے، اتنے پھیکے۔"

سحرش نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"یار کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دو۔ دو چار رومینٹک جملے بول دو۔ کہو تو میں تمہاری مدد کروں۔ میں نے اپنی ڈائری میں مختلف افسانوں سے لے کر ڈھیر سارے جملے لکھ رکھے ہیں۔ دو چار تمہیں دے سکتی ہوں۔"

اور وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

"تم بھی نا سحرش۔"

اور عین اسی وقت آزین، مرتضیٰ کے ساتھ اس کے کمرے سے نکلا تھا اور ٹیرس پر سحرش کے ساتھ کھڑی، بے اختیار ہنستی ہوئی زنل پر اس کی نظر پڑی تو اس کے لبوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تو وہ ہنستے ہنستے، یک دم رخ موڑ گئی تھی تب سحرش نے کہا تھا کہ زین کی اس مسکراہٹ پر تو سو خون معاف کیے جا سکتے ہیں۔ اور یہ سچ تھا کہ اس کی مسکراہٹ اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیتی تھی اور آنکھیں بھی جیسے دمک اٹھتی تھیں۔

سحرش کی بات یاد کر کے، اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی لیکن آزین کی نظروں سے یہ مسکراہٹ چھپی نہ رہ سکی اور اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ مسکراہٹ کی کرنیں اب بھی اس کی آنکھوں میں لو دیتی تھیں اور وہ ایک ٹک اسے دیکھتا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو زین۔"

وہ پزل ہوئی تھی۔

"تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے تمہیں دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ شاید اب ہر پل

ہر لمحہ تمہیں ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن پتا نہیں کب.....“

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”بہت تھکن ہو رہی ہے۔ دادا جان سے مل کر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“

”تم چائے پیو گے بنا دوں۔“

وہ ساری ناراضی بھول کر اس کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”نہیں ابھی نہیں جب سب کے لیے بناؤ گی تو پی لوں گا۔“

وہ ایسا ہی تھا خاص اپنے لیے وہ اسے کم ہی تکلیف دیتا تھا۔

”دادا جان نے کہا تھا عصر کے بعد چائے بنا کر ابا کے کمرے میں ہی لے آؤں۔“

وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں بھی ابھی ادھر چچا جان کے کمرے میں ہی ہوں۔“

زمل نے سر ہلایا تھا۔

”پوچھو گی نہیں میں صبح صبح کہاں چلا گیا تھا اور اب چار بجے واپس آ رہا ہوں۔“

وہ جاتے جاتے مڑا تھا۔

”بتانا چاہتے ہو تو بتا دو۔“

وہ یک دم جیسے سنجیدہ ہوئی تھی۔

”چائے پی کر بات کرتے ہیں۔ سب بتاتا ہوں۔“

وہ خوشگوار لہجے میں کہتا اور ایک استحقاق بھری نظر اس پر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا، تو اس کے دل پر موجود ہلکا سا غبار بھی چھٹ گیا اور وہ مرمت شدہ کتابوں کو اٹھا کر اسٹڈی میں رکھنے لگی۔ جہاں زیب بیگ کا کمرہ درست کر کے جب وہ باہر نکلی تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے نماز پڑھ کر چائے بنائی اور شاہ زیب کے کمرے میں آئی تو آزین شاہ زیب بیگ کے بیڈ پر بیٹھا تھا اور شاہ زیب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے، اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دیکھ رہے تھے۔ جہاں زیب بیگ اور آزین کی موجودگی سے بے نیاز۔

”دادا جان! مرسل کے بھائی کراچی سے آ گئے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں آج چچا جان کو ان کے پاس لے چلتے ہیں۔ وہ رات آٹھ بجے اپنے پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتے ہیں۔“

اسے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کافی ٹیبل اٹھا کر بیڈ کے سامنے رکھی اور ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ زمل نے اس خیال سے کہ پتا نہیں دن میں آزین نے کچھ کھایا بھی تھا یا نہیں فریزر میں پڑے کباب تلنے کے علاوہ خانسامے بابا سے کہہ کر باہر سے سموسے اور دہی بھلے بھی منگوا لیے تھے۔

وہ ٹرے میں موجود لوازمات دیکھ کر مدھم سا مسکرایا۔ اسے زمل کا اس طرح اس کا خیال رکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ اہتمام زمل نے اس کے لیے کیا ہے۔ جہاں زیب بیگ شام کی چائے کے ساتھ کچھ نہیں لیتے تھے۔ زمل نے دیوار کے ساتھ موجود روم چیئر اٹھا کر بیڈ کے سامنے، جہاں زیب بیگ کی کرسی کے پاس رکھی اور پلیٹ اٹھا کر جہاں زیب بیگ کی طرف بڑھائی۔

”دادا جان آپ کچھ لیں گے۔“

”نہیں۔ میرے لیے چائے بنا دو۔“

”چچا جان آپ تو لیں نا۔“

آزین نے پلیٹ میں سموسہ اور کباب رکھ کر شاہ زیب بیگ کی طرف بڑھایا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا لیکن نظریں اب بھی اپنے پھیلے ہاتھوں پر تھیں وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کیا تلاشتے تھے۔

”دہی بھلے تو لے لیں نا ابا، شان بھائی کی دکان سے آئے ہیں میں کالی مرچ والے۔

آپ کو پسند تھے نا۔“

انہوں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"چائے تو لیں گے نا آپ۔"
زمل ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے زمل کی طرف دیکھتے رہے پھر اثبات میں سر ہلایا تو زمل کپوں میں قہوہ ڈالنے لگی۔
"اب تو خیر تھرموس میں چائے دم دینے لگے ہیں لیکن تمہاری اماں کی عادت تھی چائے دانی میں چائے دم دے کر، اسے ٹی کوزی سے ڈھک دیتی تھی حالانکہ اس وقت بھی مونا اور شانو تھرموس میں ہی چائے دم دیتی تھیں۔"
جہاں زیب بیگ کو یوں ہی اکثر کوئی پرانی بات یاد آجاتی تھی۔
"ایک بار شاہ زیب آزاد کشمیر گیا تو وہاں سے بہت خوب صورت اونی ٹی کوزی لایا تھا۔ تمہاری اماں کو بہت پسند تھی۔"
شاہ زیب بیگ کو چائے پکڑاتے ہوئے زمل نے دیکھا ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔
"تھینک یو زمل، اس وقت سچ میں کچھ بھوک لگ رہی تھی مجھے۔" آزین نے سموسہ اور کباب کھا کر خالی پلیٹ میز پر رکھی۔
"وہی بھلے بھی لو نا۔"
زمل خوش ہو گئی تھی کہ اس نے چائے کے ساتھ اہتمام کر لیا تھا۔ ورنہ آزین نے کبھی خود سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔
"نہیں بس اب چائے بنا دو۔ اور ہاں وہی بھلے فرج میں رکھ دو۔ رات کو مرسل آئے گا۔ میں نے اسے کہا تھا، چچا جان کو ارسلان بھائی کے کلینک میں لے کر جانا ہے تو اس نے کہا تھا وہ گاڑی لے کر آجائے گا تو شاید چائے کے لیے رک جائے۔"
چائے اسے پکڑاتے ہوئے زمل نے اثبات میں سر ہلایا۔
"لیکن زین بیٹا! شاہ زیب پتا نہیں جائے گا بھی یا نہیں۔"
جہاں زیب بیگ پریشان سے ہو گئے تھے۔ جانتے تھے کہ شاہ زیب کو ڈاکٹر کی طرف جانے کے لیے تیار کرنا مشکل ہوگا۔ دو تین بار اورنگ زیب اور ارباب نے لے جانا چاہا تھا لیکن شاہ زیب کسی صورت نہیں مانے تھے اور تب تو وہ کچھ بہتر ہی تھے لیکن اب پتا نہیں۔
"ابا"
زمل نے آہستگی سے شاہ زیب کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
آزین آپ کو ڈاکٹر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔
آپ چلیں گے نا۔"
شاہ زیب نے نفی میں سر ہلایا۔
"دیکھیں نا ابا! آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ ایک دفعہ ڈاکٹر سے چیک اپ کروالیں آپ کو بھوک بھی تو نہیں لگتی نا۔ وہ آپ کو ضرور کوئی ایسی دوا دے گا کہ آپ کو بھوک لگے گی۔"
شاہ زیب نے پھر نفی میں سر ہلایا اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ، جس میں سے انہوں نے ابھی ایک گھونٹ ہی بھرا تھا ٹیبل پر رکھ دیا اور بیڈ پر لیٹ کر دیوار کی طرف رخ کر لیا۔
"دیکھا زین بیٹا! میں نے کہا تھا نا یہ نہیں جائے گا ڈاکٹر کے پاس۔"
جہاں زیب کی آواز بھرا گئی تھی۔
"ٹھیک ہے دادا جان! میں مرسل کو کہوں گا وہ ڈاکٹر صاحب کو گھر ہی لے آئیں گے آپ پریشان نہ ہوں۔"
اس نے انہیں تسلی دی اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔
زمل نے ایک کپ چائے مزید بنائی اور کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی، آزین کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔
"شیخو بابا کو چائے دینے جا رہی ہوں۔"
"تم نہیں پیو گی۔"

''نہیں میرا جی نہیں چاہ رہا۔''
وہ کپ لے کر باہر چلی گئی۔
☆☆☆
''شیخو بابا۔''
اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر آواز دی۔
''یہ چائے لے لیں۔''
شیخو بابا جو اپنی چارپائی پر بیٹھے کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے وہ کاغذ تکیے کے نیچے رکھے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ کپ انہیں پکڑاتے ہوئے زمل نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے اور پلکیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔
''شیخو بابا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''
''جی۔''
وہ کپ لے کر جلدی سے مڑ گئے تھے۔ زمل لمحہ بھر انہیں دیکھتی رہی پھر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے ہولے ہولے چلتی ہوئی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ شیخو بابا کی نم آنکھوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ان سے پوچھے کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ ان کی آنکھیں نم کیوں ہو رہی ہیں۔ لیکن اس کی ان سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ ان سے، ان کے کسی ذاتی دکھ کے متعلق پوچھتی جس نے ان کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔ ان سے اس نے کبھی ان کی ذاتی زندگی کے متعلق بات نہیں کی تھی، بس ضروری اور کام کے متعلق ہی بات ہوتی تھی۔ شاید کوئی بھی ان کی ذاتی زندگی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک بار اس نے بی بی اماں کو کہتے سنا تھا وہ دادا جان کو بتا رہی تھیں۔
''اپنی ماں کی قبر پر جاتا ہے نگوڑا اور کہاں جائے گا۔''
شیخو بابا دو تین ماہ بعد ایک دو روز کے لیے کہیں جاتے تھے۔
''ماں'' تو زندہ نہیں تھی لیکن باپ۔ کیا پتا وہ زندہ ہو۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہو اور سوتیلی ماں نے گھر سے نکال دیا ہو۔
آج پہلی بار وہ شیخو بابا کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کوئی عزیز، رشتہ دار۔ کوئی تو ہوگا۔
اور آج پہلی بار ہی زمل کا جی چاہا کہ وہ ان سے ان کے متعلق پوچھے۔ شاید ان کی آنکھوں کے کونوں میں اٹکے آنسو اسے مضطرب کر رہے تھے۔ شاید یہ نظر نہ آنے والے آنسو اس کے دل میں ٹھہر گئے تھے۔ بی بی اماں ہوتیں تو وہ ان سے ضرور کہتی کہ وہ ان سے پوچھیں کہ انہیں کیا دکھ ہے۔ کیا تکلیف ہے۔
''اور بی بی اماں جانے کب آئیں گی۔''
اب وہ بی بی اماں کے متعلق سوچ رہی تھی جو اپنی بہن کے پاس قصور گئی ہوئی تھیں۔ بہنوئی کا انتقال سال بھر پہلے ہو گیا تھا۔ بہن کی دو ہی بیٹیاں تھیں اور دونوں ہی شادی شدہ، ایک اندرون سندھ کی بیاہی ہوئی تھیں اور ایک سعودیہ میں تھیں۔ وہ سال بھر بعد ہی چکر لگاتی تھیں۔ سو جب پتا چلا کہ بہن جسے کینسر تھا اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے تو بی بی جان بہن کے پاس قصور چلی گئیں کہ کوئی دیکھ بھال کرنے کے لیے نہیں تھا۔ تو وہ انہیں اس بیماری کی حالت میں تنہا کیسے چھوڑ دیتیں۔
ان کی مجبوری جان کر بھی وہ ضد نہیں کرتی تھیں ورنہ دل تو چاہتا تھا کہ بی بی اماں کو واپس لے آئے۔
بی بی اماں آ جائیں تو ان سے کہوں گی کہ وہ ان سے پوچھیں کیا سوچتے رہتے ہیں وہ۔ کئی بار اس نے ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔
بی بی اماں کو کچھ نہ کچھ تو پتا ہی ہوگا ان کے متعلق۔
وہ ایک بار پھر ان کے متعلق سوچنے لگی۔ تب ہی آزین آہستہ سے آ کر اس کے پاس ہی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گیا۔
''کیا سوچ رہی ہو۔''
''کچھ نہیں۔''
وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''کیا میرے متعلق سوچ رہی تھیں۔''
اس کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"نہیں۔ شیخو بابا کے متعلق سوچ رہی تھی۔
اس نے ایمان داری سے صحیح بات بتادی۔
"آہ۔ اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کوئی ہمارے متعلق سوچے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر شوخ نظروں سے اسے دیکھا۔
"پتا ہے آزین۔"
اس نے آزین کی بات نظر انداز کردی۔
"ابھی جب میں انہیں چائے دینے گئی تو مجھے لگا جیسے ان کی آنکھوں میں آنسو ہوں۔ جب وہ سوسے وغیرہ لے کر آئے تب بھی وہ بہت اداس لگے تھے مجھے انہوں نے مجھے چائے کے ساتھ کچھ بھی بھیجنے سے منع کردیا تھا۔ وہ بی بی اماں کے قریب تھے وہ ہوتیں تو میں ان سے کہتی وہ شیخو بابا سے پوچھیں وہ اتنے پریشان کیوں ہیں۔"
"بی بی اماں اتوار کو آجائیں گی۔"
آزین نے اس کی پوری بات دھیان سے سنی تھی۔
"ریلی"
وہ خوش ہوگئی تھی۔ خوشی اس کی گھور سیاہ آنکھوں سے بھی چھلکی تھی۔
"ہاں سچ"
وہ مسکرایا۔
"تمہیں کس نے بتایا زین، کیا عذرا خالہ اب ٹھیک ہیں۔
اتنے دنوں سے ان کا کوئی فون بھی تو نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی شاید عذرا خالہ زیادہ بیمار ہیں۔
وہ ذرا سا رخ موڑ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
"ہاں..... اتنے دنوں سے ان کا فون نہیں آیا تھا نا تو اس لیے میں خود قصور چلا گیا تھا ان کا پتا کرنے۔"
آزین کو بھی ایک طرح سے بی بی اماں نے ہی پالا تھا اور اسے ان سے بہت محبت تھی۔
"اور عذرا خالہ کا چند دن پہلے انتقال ہوگیا ہے۔ ان کی سندھ والی بیٹی تو آگئی تھی لیکن سعودیہ والی نہیں آسکی تھی۔ وہ کل صبح پہنچیں گی اور بی بی اماں دونوں بہنوں کی امانتیں ان کے حوالے کرکے آجائیں گی۔ عذرا خالہ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانا تھا اس کے علاوہ بھی کچھ کام تھے اس لیے واپسی میں کچھ دیر ہوگئی۔"
اس نے تفصیل سے بتایا تو بے اختیار زمل کے لبوں سے نکلا۔
"تو تم قصور گئے ہوئے تھے اور مرتضیٰ کہہ رہا تھا کہ تم گوجرانوالہ گئے ہوئے ہو کسی سیاسی تنظیم کے ایک اجلاس میں شرکت کرنے۔"
"مرتضیٰ۔"
چند لمحے پہلے جو اس کے چہرے اور لہجے میں خوش گوار سا تاثر تھا یک دم مفقود ہوگیا تھا۔
"مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مرتضیٰ تمہیں الٹی سیدھی خبریں کیوں دیتا ہے اور تم بھی آنکھیں بند کرکے کیوں اعتبار کرلیتی ہو۔"
"اس نے بطور خاص تو مجھے کچھ نہیں بتایا تھا آزین۔ وہ تو میں مونا تائی کے بلانے پر اوپر گئی تو وہ ان سے کہہ رہا تھا کہ تم بھی چچا جان کی طرح سیاست میں دلچسپی لے رہے ہو۔ چچا جان نے اس سیاست کے چکر میں جو اذیت سہی جو تکلیف اٹھائی تھی وہ اس وجہ سے تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا اور خوف زدہ تھا کہ کہیں تمہارے ساتھ بھی کچھ ایسا نہ ہو جو ان کے ساتھ ہوا۔ وہ چاہتا تھا تائی جان تمہیں سمجھائیں۔"
اس نے سیڑھیوں والی گفتگو گول کرکے صرف تائی جان کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کا بتایا۔
جب سے مرتضیٰ نے بتایا تھا کہ وہ گوجرانوالہ گیا ہوا ہے اور اس نے شاید، کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے تب سے ہی وہ بہت پریشان تھی۔
"اچھا۔"
آزین کا لہجہ طنزیہ سا ہوگیا۔
"اگر وہ اتنا ہی پریشان اور خوف زدہ تھا میرے لیے تو اس نے مجھ سے خود بات کیوں نہیں کی مجھے

کیوں نہیں سمجھایا۔ تمہاری موجودگی میں ہی تائی جان سے بات کیوں کی جانتی ہو کیوں؟"

اس نے سر ہلایا۔

یہ بات تو وہ اسی وقت جان گئی تھی کہ مرتضیٰ کا مقصد اسے آزین کی اس سرگرمی کے متعلق بتانا تھا۔ ورنہ اور پروالوں کو آزین سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی نہ پرواہ تھی کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔

"کیا جانتی ہو؟"

اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کہ وہ صرف مجھے تمہارے متعلق بتانا چاہتا تھا کہ میں تمہیں سمجھاؤں اور برائے راست بات کرنے کے بجائے تائی سے بات کر رہا تھا کہ نہیں میں یہ نہ سمجھوں کہ وہ تمہاری شکایت لگا رہا ہے۔ اور یہ کہ دادا جان سے بھی میں ہی بات کروں کہ۔"

"واہ کافی سمجھ دار ہو بھئی۔"

اب وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اتنی بھی سمجھ دار نہیں ہو میری جان۔"

وہ یک دم پزل ہوئی تھی۔

"یہ کیا تخاطب ہے زین۔"

یہ وہ تخاطب ہے جو شوہر کبھی کبھار اپنی بیویوں۔"

"فضول مت بولو زین۔"

اس کی نظریں جھک گئیں اور گھنی پلکیں ہولے ہولے لرزنے لگیں۔

"اس میں فضول بات کیا ہے وضاحت کرو گی۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب ادھر ادھر کی باتیں مت کرو زین! اصل بات بتاؤ؟ کیا سیاسی پارٹی جوائن کرنے والی بات صحیح ہے یا مرتضیٰ نے جھوٹ بولا ہے۔"

اس نے فوراً ہی خود کو کمپوز کر لیا تھا حالانکہ آزین کے اس طرح دیکھنے سے وہ پزل ہو رہی تھی۔

"اس نے آدھا سچ آدھا جھوٹ بولا تھا۔"

وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں وارفتگی اور اشتیاق تھا۔

"کیا مطلب"

اس نے نظریں چرائیں۔

"مطلب یہ کہ مرسل نے مجھے گوجرانوالہ چلنے کے لیے کہا تھا۔ اپنی فلاحی تنظیم کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے مرتضیٰ کے سامنے ہی اس نے بات کی تھی اور میں نے حامی بھر لی تھی، گوجرانوالہ جانے کی لیکن بعد میں میرا ارادہ بدل گیا مجھے بی بی اماں کی فکر تھی کہ وہ فون کیوں نہیں کر رہی ہیں سو میں قصور چلا گیا۔"

بی بی اماں جب سے قصور گئی تھیں، چھ سات دن بعد فون کر کے خیریت معلوم کرتی تھیں۔ کبھی پی سی او سے کبھی کہیں پڑوس کے کسی گھر سے عذرا خالہ کے گھر فون نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بہتر سمجھا تھا کہ خود جا کر ان کی خیریت معلوم کر آئے۔

"فلاحی تنظیم۔ کیسی فلاحی تنظیم۔"

زمل کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"فلاحی تنظیمیں کیسی ہوتی ہیں یار"

وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

"عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی ہیں۔"

"جیسے ہمارے سیاسی لیڈر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں۔" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ کھل کر ہنسا۔

"نہیں، ملی، یہ لوگ میرا مطلب ہے مرسل اور عمار وغیرہ سچ میں بہت کام کر رہے ہیں۔ خاص طور پر گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے دیہات میں انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ لڑکیوں کے لیے سلائی اسکول، غریب بچیوں کی شادیاں۔ ذہین طلباء کے لیے وظائف وغیرہ۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آزین، انسان کو صرف اپنے لیے نہیں جینا چاہیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی اپنی استطاعت بھر کام کرنا چاہیے۔" اس نے

سراہا۔

"ہاں یہ لوگ تو اور بھی بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس فنڈز کی بہت کمی ہے تو یہ میٹنگ اسی سلسلے میں تھی۔" اس نے آزین کی پوری بات دھیان سے سنی اور سوچا کہ یہ مرتضیٰ نے پھر اتنے وثوق سے آزین کے متعلق سیاسی پارٹی جوائن کرنے کا کیوں کہا اور یہ پہلی بار تو نہیں تھا بلکہ پہلے بھی وہ تین چار بار اس طرح کا خدشہ ظاہر کر چکا تھا۔

"کیا تم واقعی کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی لیڈر میں انٹرسٹڈ نہیں ہو زین۔"

اس نے بہت سوچ سوچ کر لفظوں کا انتخاب کیا تھا۔

اگر وہ ڈائریکٹ اس سے پوچھتی کہ کیا اس نے کسی سیاسی پارٹی کو جوائن کیا ہے تو شاید وہ برا مان جاتا یا خفا ہو جاتا۔

"تم ڈائریکٹ بھی مجھ سے پوچھ سکتی ہو کہ کیا میں نے کوئی پارٹی جوائن کر رکھی ہے۔"

وہ جیسے اس کے دل میں چھپی بات جان لیتا تھا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"تو زل شاہ زیب، مجھے سیاست یا سیاسی پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو زل، میں وہ دکھ وہ اذیت بھول سکتا ہوں جو ابا کی وجہ سے ہم سب نے سہی۔"

اس کی آنکھوں میں اذیت تھی اور اندر کہیں کسی گہرے درد نے کروٹ لی تھی۔ وہ دن وہ کبھی نہیں بھول پایا تھا جب اماں اس کی انگلی پکڑے پارٹی کے بڑوں کے گھر منتیں کرنے جاتی تھی۔ بڑے بڑے دعوے کرنے والوں نے اپنی ہی پارٹی کے ایک رکن کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

"سوری۔" زین۔

زل نادم سی ہو گئی تھی۔

کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ظفر یاب چچا کی وجہ سے سب نے کتنی تکلیف برداشت کی تھی اور خاص طور پر آزین اور صوبی چچی نے، تب وہ نو دس سال کا تو تھا

جب ایک رات اچانک برسر اقتدار پارٹی نے ظفر یاب کو گھر سے اٹھا لیا تھا۔ وہ کالج کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لے رہے تھے اور اپنی پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ ظفر یاب کے علاوہ بھی ان کی پارٹی کے دو تین اور افراد کو بھی بے بنیاد الزام لگا کر گھر سے لے گئے تھے۔ انہیں کہاں لے جایا گیا تھا کس جگہ رکھا گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

ان کے خلاف کسی تھانے میں کوئی ایف آئی آر بھی نہیں کٹوائی تھی۔ شاہ زیب جو خود گورنمنٹ کے ملازم تھے، وہ بھی معلوم نہیں کروا سکے تھے کہ وہ کہاں ہیں۔ ان دنوں شاہ زیب جہلم میں تعینات تھے۔ ذاتی طور پر بھی انہوں نے پتا لگانے کی کوشش کی تھی اور سرکاری ذرائع سے بھی لیکن سات ماہ تک ظفر یاب بیگ کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تو تب چھ سات سال کی ہوگی۔ بعد میں ایک بار جب وہ فرسٹ ایئر میں تھی تو اس کے پوچھنے پر دادی جان نے بتایا تھا۔

"ارے میرا بچہ تقریریں تو کرتا تھا جلسے جلوسوں میں۔ بھلا اور کیا جرم کیا تھا اس نے کہ اٹھا کر لے گئے ظالم۔"

"صبوحی تو جیسے پاگل ہو گئی تھی اور آزین تو ہنسنا ہی بھول گیا تھا۔" بی بی اماں کو بھی کبھی کبھی ماضی کی یادیں اداس کر دیتی تھیں۔

صبوحی اور ظفر یاب بہت محبت کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ صبوحی سے دو پار کی رشتہ داری تھی پھر یونی ورسٹی میں دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ ظفر یاب نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو کسی کو اعتراض نہ ہوا، دونوں ایک دوسرے کے دیوانے تھے۔

"دونوں ایک دوسرے کے دیوانے تھے تو پھر صبوحی چاچی نے ان سے طلاق کیوں لی تھی۔"

وہ اپنی بڑی تو ہو گئی تھی کہ بی بی اماں سے سوال کرنے لگی تھی۔

"پتا نہیں۔"

بی بی اماں مزید اداس ہو جاتیں۔

"یہ معجزہ تو آج تک حل نہیں ہو سکا۔ صبو کی تو جان اٹکی رہتی تھی ذرا جو ظفر کو گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ پھر جب وہ اسے اٹھا کر لے گئے تو اس کی پارٹی کے ایک ایک فرد کے گھر پر دستک دی۔ صبح زین کی انگلی پکڑ کر نکلتی تو دوپہر ڈھلے لوٹتی تھی۔ سب ہی سمجھاتے تھے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں ظفر کو ڈھونڈنے کی۔ لیکن اسے کسی پل چین نہ آتا تھا۔ تمہارے دونوں تایا تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔"

دن میں ماری ماری پھرتی اور راتوں کو تمہاری دادی اور وہ سجدے میں گر گر کر دعائیں مانگیں۔ ظفریاب کی پارٹی سے مایوس ہو کر وہ برسر اقتدار پارٹی کے دروازے کھٹکھٹانے لگی اور پھر اس پارٹی کا ایک شخص ابرار شاہ، ایک صبح اپنی گاڑی میں ظفریاب کو یہاں چھوڑ گیا۔ لیکن اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ مہینوں اس کا علاج ہوتا رہا پہلے ہاسپٹل میں پھر گھر پر۔ صبو جی نے تو جیسے اس کی پٹی ہی پکڑ لی تھی۔

اور جس روز ظفریاب اپنے قدموں سے چل کر باہر بازار تک گیا۔ اس سے اگلے روز صبو نے طلاق کا مطالبہ کر دیا، سب نے ہی سمجھایا لیکن صبو نے کسی کی نہ سنی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ میکے میں ایک ماں تھی۔ باپ تو شادی کے بعد فوت ہو گیا تھا۔ بھائی اپنی پسند سے شادی کر کے کسی دوسرے ملک میں جا بسا تھا۔ تمہارے دادا اور دادی خود گئے تھے اسے سمجھانے کہ آزین کی خاطر ہی وہ واپس آ جائے۔ اگر ظفریاب سے کچھ شکایت ہے تو انہیں بتائے۔ ماں نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی۔ ظفریاب کے لیے کیسے سارا دن روتی کرلاتی تھی۔ پھر ایسا کیا ہوا کوئی نہ جان سکا۔ کچھ عرصہ بعد سنا تھا کہ ظفر سے طلاق لینے کے بعد اس نے کسی سے شادی کر لی تھی۔"

اوپر کوئی برتن گرا تھا شاید اس نے چونک کر آزین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے سامنے دیکھ رہا تھا۔

"سوری آزین"

اس نے آزین کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے زخمی نظروں سے زمل کی طرف دیکھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے زمل! میں وہ اذیت وہ دکھ کبھی بھول سکتا ہوں، جو میں نے تب اٹھائی تھی اور جو میں نے بعد میں سہی۔ نہیں کبھی نہیں مجھے نفرت ہے سیاست سے اور سیاست دانوں سے۔ ہمارے ملک میں سیاست بہت گندی ہے اور سیاست دان مطلبی اور خود غرض، کوئی بھی سیاست دان وطن اور عوام سے مخلص نہیں ہے۔ اور مرتضیٰ بھی یہ بات جانتا ہے، بہت اچھی طرح جانتا ہے میری نفرت اور میرے خیالات کو پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے، میں سمجھ نہیں پاتا۔ خاص طور پر تم سے اور دادا جان سے۔ تمہیں کیا جتانا چاہتا ہے زمل۔"

اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زمل گھبرائی۔

"میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"نہیں۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"غلط فہمی کیسی۔ وہ مرسل اور اس کی فلاحی تنظیم کے متعلق اچھی طرح جانتا ہے۔ دراصل وہ دادا جان کی اور تمہاری نظروں میں میرا امیج خراب کر رہا ہے۔"

"لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا بھلا۔"

زمل پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں..... وہ بھلا ایسا کیوں کر رہا ہے مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہم نے اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک ایک ساتھ پڑھا ہے۔ میں اپنی ہر بات اس سے ہی شیئر کیا کرتا تھا۔ وہ باتیں جو میں تم سے اور دادا جان سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن پچھلے چند ماہ سے مجھے لگتا ہے جیسے وہ بدل گیا ہے پہلے جیسا مرتضیٰ نہیں رہا، اس کی آنکھوں

میں مجھے محبت اور دوستی کے وہ رنگ دکھائی نہیں دیتے جو خالص اور شفاف تھے۔ وہ آنکھیں اب اجنبی سی لگتی ہیں۔ بظاہر تو کوئی بات نہیں ہے ملی، لیکن پس پردا کیا کچھ ہے۔

"کیا صرف اتنی سی بات پر وہ اجنبی بن گیا ہے کہ میں نے، ابا سے پیسے منگوا کر اس سے پارٹنر شپ نہیں کی۔ گزرے سالوں کی ساری محبتیں، دوستی سب فراموش کر بیٹھا ہے۔"

"زین۔"

زمل کی پریشانی بڑھ گئی۔

"کیا اس نے تمہارے خلاف دادا جان سے کچھ کہا ہے۔"

"شاید نہیں۔ لیکن وہ دادا جان سے، تایا جان سے سب سے ایسی باتیں کرنے لگا ہے، جیسے میں بہت ناکارہ ہوں بے کار شخص، جیسے میں کبھی کچھ نہیں کر سکوں گا اور کسی سیاسی جلسے میں کسی اندھی گولی کا شکار ہو جاؤں گا۔ بظاہر مجھ سے ہمدردی کرتا ہوا میرے لیے پریشان ہوتا ہوا۔ مجھ سے اس کی یہ منافقت برداشت نہیں ہو رہی زمل۔"

اس سے زمل کو وہ بہت اداس اور دل گرفتہ سا لگا۔

"مے بی ایسا کچھ نہ ہو۔ جو تم سوچ رہے۔ ہو سکتا ہے اسے سچ مچ ایسا لگتا ہو کہ تم کسی سیاسی پارٹی کو جوائن کرنا چاہتے ہو۔" زمل نے ایک بار پھر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی۔

"تم خوامخواہ ٹینشن لینے کے بجائے اس سے پوچھ لو کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ آخر کو وہ کوئی غیر نہیں کزن ہے تمہارا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو زمل۔"

آزین نے سر ہلایا۔

"لیکن پتا نہیں کیوں میں اس کی ایسی باتوں سے ڈر سا جاتا ہوں۔ لیکن تم مجھ سے کبھی بدگمان مت ہونا زمل۔ شاید کسی روز وہ ڈائریکٹ بھی میرے متعلق بات کر لے۔"

"لیکن میں بھلا تم سے کیوں بدگمان ہوں گی زین۔"

زمل کی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کر چکا ہے۔

"بس ایسے ہی مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں مرتضیٰ کی باتیں تمہیں مجھ سے بدگمان نہ کر دیں۔ میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں زمل۔ اگرچہ ہمارے درمیان جو بندھن ہے وہ کمزور نہیں ہے۔ پھر بھی ڈر جاتا ہوں۔ ماما بھی تو ابا سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کا بندھن بھی تو کمزور نہیں تھا۔ بلکہ وہ ہمارے بندھن سے زیادہ مضبوط تھا پھر بھی۔"

وہ بے حد قنوطی ہو رہا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو آزین۔"

وہ ناراضی سے بولی تھی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں جلدی سے رخصتی کروالوں۔ دادا جان سے بات کروں زمل۔"

اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کہا تو تھا کہ پڑھائی کے بعد۔ لیکن پھر بھی اگر تمہارے دل میں کوئی ڈر اور خوف ہے تو دادا جان سے بات کر لو۔"

اس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

"اچھی سی جاب مل جائے تو بات کرتا ہوں۔ لیکن اچھی سی جاب ملنا بھی آسان کہاں ہے۔ تم دعا کرو نا جلد ہی مجھے میرے مطلب کی جاب مل جائے۔"

اور عین اسی وقت سحرش نے اوپر ریلنگ سے جھانکا۔

"واؤ..... یعنی کے زمل بی بی پر میری باتوں کا اثر ہو ہی گیا آج واقعی دونوں لو برڈ لگ رہے ہیں۔ وارفتگی سے اس کی طرف دیکھتا آزین ظفر یاب اور لرزتی پلکوں والی زمل شاہ زیب..... واؤ" اس نے پھر ہونٹ گول گول کیے اور مڑ کر دیکھا۔ لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا ٹیرس خالی پڑا تھا۔ کوئی نہیں تھا جسے وہ بتاتی

کہ زمل اور آزین، پھر وہ مسکراتی ہوئی مہرین کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ ایک مہرین ہی تو تھی جو اس کی ہر بات سن لیتی تھی۔

☆☆☆

اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے مرتضیٰ ارباب نے یونہی ریلنگ کے پاس رک کر عادتاً نیچے جھانکا تھا۔ کچھ عرصہ سے وہ بھی سحرش کی طرح آتے جاتے نیچے جھانکنے لگا تھا اور اس کی نظریں سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے آزین اور زمل پر پڑی تھیں۔ اس کے لب بھنچ گئے تھے اور آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلی تھیں، وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

آزین بہت وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا اور زمل نظریں جھکائے بیٹھی تھی، یقیناً آزین صاحب کوئی رومانوی ڈائیلاگ جھاڑ رہے ہوں گے۔ اس نے سحرش کی طرح اندازہ لگایا۔

خاندان کی سب سے خوب صورت سب سے دلکش، دلربا لڑکی تو آزین ارباب کے لیے، جس کی ماں نے طلاق لے لی تھی اور باپ دوسری شادی کر کے دوسرے دیس جا بسا اور دادا کے ٹکڑوں پر پلنے والا آزین ظفریاب، جو دو سال سے نوکری کے لیے جوتیاں چٹخا رہا ہے اور میں مرتضیٰ ارباب، ارباب بیگ کا اکلوتا بیٹا۔ جس کے باپ کی نہ صرف ایک فیکٹری بھی بلکہ ایک پلازہ بھی ہے اس کے لیے مہرین اورنگ زیب، وہ عینکو، جس کی عینک بار بار اس کی ناک سے پھسل جاتی ہے۔ چشماٹو مہرین ہرگز نہیں۔

زمل کو تو وہ بچپن سے ہی دیکھتا چلا آ رہا تھا لیکن یہ خیال کہ وہ اس خاندان کی سب سے دلکش لڑکی ہے اسے چند ماہ پہلے ہی آیا تھا اور ہر بہترین چیز پر وہ اپنا حق سمجھتا تھا اور جب اسے زمل شاہ زیب کا خیال آیا تھا تو وہ آزین کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ تو مرتضیٰ ارباب کو بھلا کیا فرق پڑتا تھا وہ اپنی قسمت بدلنا جانتا تھا۔

ایک پرانی یاد نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ارباب بیگ ہمیشہ ہی اسے کہا کرتے تھے جب بھی رزلٹ آتا۔

"یہ آزین ہر بار ہی تم سے زیادہ نمبر لے لیتا ہے جبکہ تمہاری طرح نہ ہی وہ کسی اکیڈمی جاتا ہے اور نہ ہی کوئی ٹیوٹر اسے گھر پڑھانے آتا ہے۔ کبھی تو تم اس سے زیادہ نمبر لے کر مجھے احساس دلاؤ کہ میں تمہاری ٹیوشنز پر فضول رقم ضائع نہیں کر رہا ہے۔"

اور اس نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اس سال آٹھویں کے امتحان میں مرتضیٰ ارباب کے نمبر آزین ظفریاب سے زیادہ ہوں گے۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ اس کے پیپرز آزین سے بہت اچھے ہوئے تھے یا آزین اچھے پیپرز نہیں کر سکا تھا۔ بس تھوڑی سی ذہانت تھوڑا سا پیسہ اور نتیجہ اس کے حسب منشا۔ کلاس ٹیچر حامد رضا صاحب کی الماری کی چابی ہمیشہ دسویں جماعت کے منور عزیز کے پاس ہوتی تھی۔ اور منور عزیز کی مٹھی گرم کرنے کے بعد آزین کے حل شدہ ایک دو سوالوں پر کراس لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا اور رزلٹ والے دن وہ آزین کی حیرت پر بہت محظوظ ہوا تھا۔

ارباب بیگ اس روز بہت خوش تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کے بعد پھر کبھی وہ انہیں یہ خوشی نہیں دے سکا تھا لیکن اس نے انہیں پھر مایوس بھی نہیں کیا تھا۔

آزین سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ دونوں اکٹھے ہی پڑھتے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں آزین کے اس سے چند ہی نمبر زیادہ تھے کہ ظفریاب کی شادی اور پھر ان کے باہر چلے جانے سے وہ بہت ڈسٹرب رہنے لگا تھا۔

"تو یہ طے ہوا کہ مرتضیٰ ارباب اپنا نصیب بدلنا جانتا تھا۔" لبوں پر پراسراری مسکراہٹ لیے وہ مڑا اس کا رخ میمونہ کے کمرے کی طرف تھا جو مہرین کے فائنل کے بعد اس کے ساتھ اس کے نکاح کا پکا ارادہ کر چکی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنبر بن ابدال

خشک آنکھوں کے آنسو

ناولٹ

pklibrary.com

ٹرین آنے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ اسٹیشن پر ایک گہما گہمی کا سماں تھا۔ کسی کو اپنے سامان کی فکر تھی۔ تو کوئی اسٹیشن پر بھاگتے بچوں کو پکڑنے کی فکر میں ہلکان۔ تو کہیں قلیوں کے سامان اٹھائے تیزی سے اٹھتے قدموں کی آوازیں۔ جو مسافروں کا مطلوبہ سامان اٹھائے ان کی مطلوبہ جگہ پر رکھ رہے تھے۔ ان سب کے بیچ چیزیں بیچنے والوں کی پھرتیاں۔

ایک زندگی تھی جو اسٹیشن پر رواں تھی۔ اور پھر دور سے آتی ٹرین کی وسل نے تمام مسافروں کو چوکنا کر دیا تھا۔ سب ہی اپنا سامان اور بچوں کو پکڑے گاڑی کے انتظار میں اٹھ کھڑے ہو چکے تھے۔ جیسے ہی گاڑی آ کر رکی۔ گاڑی سے اترنے اور چڑھنے والوں کے درمیان جیسے گھمسان کا رن پڑ چکا تھا۔

اترنے والوں کو چڑھنے والوں سے زیادہ جلدی تھی تو چڑھنے والوں کو اترنے والوں سے زیادہ عجلت۔ وہ چونکہ اکیلا اور سامان کے نام پر فقط ایک شولڈر بیگ کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا۔ اطمینان سے ان سب مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے کانوں میں اس لڑکی کی روہانسی آواز پڑی۔ جو گاڑی میں چڑھنے والی خاتون سے مخاطب تھی۔ وہ چونکہ سائیڈ پر کھڑا اس کے گاڑی میں سوار ہونے کا منتظر تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ جو اپنے پاس پڑے بھاری بیگ کو اٹھا کر گاڑی میں رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

"ارے اٹھا بھی لے، گاڑی چل پڑے گی۔"

گاڑی کے اندر کھڑی عورت نے اسے ڈپٹا۔

"کیسے اٹھاؤں۔ کیا ضرورت تھی اتنا سامان جمع کرنے کی۔ اتنی مشکل سے یہاں تک لائی ہوں۔ میرے بازو ٹوٹنے والے ہو گئے۔" وہ لڑکی تنک کر بولی۔

"ارے بیٹا! تم کھڑے کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو۔ ذرا یہ بیگ اٹھا کر گاڑی میں رکھوا دو۔" اس عورت نے اس لڑکی سے نظریں ہٹا کر اسے مخاطب کیا۔ تو وہ جو واقعی کبھی اس لڑکی کو اور کبھی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے مخاطب کرنے پہ سٹپٹا سا گیا تھا۔

"جی جی، میں اٹھا کر رکھ دیتا ہوں۔" اس نے لڑکی کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ روانگی کا وسل پوری شدت سے شور مچانے لگا تھا۔

"ہائے امی! گاڑی چلنے والی ہے۔ اگر میں یہیں رہ گئی تو۔" بڑی بڑی آنکھوں میں خوف سموئے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے جھٹک کر بولی۔

"ایسا کریں، آپ پہلے چڑھ جائیں گاڑی میں۔" اس نے بیگ کو اپنی سمت گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"تاکہ تم ہمارا سامان لے کر بھاگ جاؤ۔" آنکھوں کو سکیڑتے اس نے مشکوک انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اور اس کی اس بات پر تو وہ اچھل کر ہی رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی جواب دیتا۔ رینگتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر وہ اسے پیچھے کرتی جلدی سے گاڑی میں سوار ہو چکی تھی۔

"آپ کا سامان لے کر بھاگ جاؤں؟" جانے کیوں اسے شرارت سوجھی تھی۔ لڑکی کی آنکھوں میں حیرانی ابھری۔ گاڑی تھوڑی اور تیز ہوئی۔

"ارے لیڈیز کپڑے ہی ہیں۔ آپ کیا کریں گے۔" وہ جلدی سے بولی۔ اس سے پہلے گاڑی مزید تیز ہوتی۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھا کر بھاگتے ہوئے گاڑی کے اندر پھینکا اور خود بھی گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بوگی کے اندر لوگ جگہ لینے کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ میران نے جھانک کر دوسری بوگی کا منظر دیکھا وہاں کچھ امن تھا۔

"آنٹی! ادھر آ جائیں۔" میران نے لڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی اسی آنٹی سے کہا۔ اور ان کا بیگ اٹھا کر دوسری بوگی میں لایا۔ جلد ہی بیٹھنے کی جگہ مل چکی تھی۔ عورت اور اس کی بیٹی کو سامنے بٹھا کر خود سیٹ

پر آ بیٹھا۔ جہاں تین چار لڑکے پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

''بہت شکریہ بیٹا۔'' آنٹی نے تشکر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ ''اٹس اوکے آنٹی۔'' کہہ کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر والے مناظر کو دیکھنے میں مگن ہو گیا تھا۔

یہ عام سی ملاقات تھی۔ اتنی ہی عام جتنی کہ دن میں کئی بار انجان ملنے والوں کے بیچ ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ عام سی ملاقات ثابت نہیں ہوئی تھی۔ وہ پھر ملی تھی۔

☆☆☆

دکان پر رش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جب عمران بھائی نے ''ذرا کسٹمر کو دیکھنا۔'' کہہ کر ملتجیانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ فون نیچے دراز میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی ایک کسٹمر کو اس کی پسند کا چوڑی سیٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا ہی تھا۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دکان میں داخل ہوئی تھی۔

''السلام علیکم عمران بھائی۔'' اس نے معروف سے عمران بھائی کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کیسی ہو گڑیا۔'' چوڑیاں کلائی میں چڑھاتے ہوئے عمران بھائی نے عورت کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے ڈبے میں سے مزید چوڑیاں لینے کے لیے اپنے جھکے ہوئے سر کو ذرا سا اٹھایا اور سلام کرنے والی لڑکی سے اس کا حال دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ چہکی تھی۔ وہ دوسری خاتون کو چوڑیاں دکھا رہا تھا۔

''مجھے ہرے رنگ کی چوڑیاں۔'' وہ لڑکی بولتے ہوئے رکی تھی۔ آنکھوں کو ذرا سا سکیڑا۔

''جی۔ آپ کو کیا چاہیے۔'' اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو چونک گیا۔

''ارے آپ۔'' اس نے انگلی اٹھا کر اپنی سکڑی ہوئی آنکھوں کو کھولا تھا۔

''جی میں۔'' جانے کیوں میران کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ ابھری تھی۔ جو اگلے ہی لمحے اس کی اگلی بات پر جھٹ سے غائب بھی ہو گئی تھی۔

''عمران بھائی! آپ نے اپنی دکان پر ایک اور نیا لڑکا کام کے لیے رکھ لیا ہے۔'' وہ پلٹ کر عمران بھائی سے پوچھ رہی تھی۔ جو چوڑیوں کے پیسے کاٹنے کے بعد بقایا رقم اس عورت کی طرف بڑھا رہے تھے۔

''ارے نہیں نہیں۔ یہ تو میران ہے۔ میرا بھائی ایسے ہی راولپنڈی سے چھٹیاں گزارنے کے لیے آیا ہے۔''

''اچھا۔ مجھے ہرے رنگ کی چوڑیاں دے دیں۔'' وہ لڑکی پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''میران۔ ایمن کو اچھے سے اچھا سیٹ نکال کر دکھاؤ۔'' عمران بھائی اسے ہدایات دیتے ہوئے دوسرے کسٹمر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور وہ اس ایمن نامی لڑکی کی طرف۔

اسے دس منٹ کے بعد ہرے رنگ کی خوب صورت سی چوڑیاں پسند آ ہی گئی تھیں۔

''عمران بھائی! پیسے۔'' چوڑیوں والے شاپر کو اٹھاتے ہوئے وہ عمران بھائی سے پوچھنے لگی۔

''تم ڈیڑھ سو دے دو۔ ویسے تو مارکیٹ میں اس چوڑی کا ریٹ چار سو ہے۔ لیکن تمہارے لیے میری شاپ میں یہ ڈیڑھ سو کی ہیں۔'' عمران بھائی نے کہا۔ ایمن نے ہنستے ہوئے اپنے بیگ کی اوپری زپ کھول کر پیسے عمران بھائی کی طرف بڑھا دیے تھے۔

''کسی اور کو مت بتانا۔'' عمران بھائی نے سرگوشی میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی اس کی دونوں دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جواب میں ایمن کا سر زور زور سے اثبات میں ہلا تھا۔ جو سیٹ عمران بھائی نے ایمن کو ڈیڑھ سو کا دیا تھا۔ وہی سیٹ اس کی دوست کو ساڑھے تین سو کا سیل کیا تھا۔

''یہ کیا تھا؟'' ہنستی مسکراتی لڑکیاں جیسے ہی عمران بھائی کی دکان سے باہر نکلی تھیں۔ حیران سے کھڑے میران نے ان سے دریافت کیا۔

''یار ایمن کا بھائی میرا بچپن کا جگری دوست

ہے۔ اب کیا اس کی بہن سے منافع لیتا اچھا لگوں گا۔ اس کی بہن میری بھی بہن ہے۔"

عمران بھائی نے اپنے سامنے پڑے ڈبوں کو واپس ان کی جگہ پر رکھتے ہوئے میران کو بتایا۔ جواب اثبات میں سر ہلا کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر دراز سے اپنا فون نکال چکا تھا۔

"دیکھ یار! یہ چوڑیوں کا کام ہمارا پشتی ہے۔ سکون سے اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ تو بھی خالو کی دکان پہ ان کے ساتھ بیٹھ۔ شروع میں دو چار دن تیرے جیسے نئے جوان ہوئے چار جماعتیں پڑھ جانے والے لڑکوں کو زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ کہ پڑھ لکھ کر چوڑیاں بیچنے بیٹھ گئے۔ لیکن پھر خود بخود تیرا دل لگ جائے گا۔ فضول کی ضد چھوڑ، آخر کو تو ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ دکان کو تو نہیں سنبھالے گا تو کون سنبھالے گا۔" عمران بھائی کہتے ہوئے اس کے پاس پڑے اسٹول پر آ بیٹھے تھے۔

"ضد کی بات نہیں ہے عمران بھائی۔ سچ میں میرا دکان پر بیٹھنے کا دل نہیں چاہتا۔ اچھی نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابو ہیں کہ ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ آگے نہیں پڑھنا۔ نوکری کی اجازت ہے۔ اس لیے میں یہاں چلا آیا۔ نوکری بھی کروں گا اور ساتھ میں پڑھائی بھی مکمل کروں گا۔" میران کے لہجے میں عزم تھا۔ اس کا یہ عزم دیکھ کر عمران بھائی نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ اور پھر وہ تین دن کے بعد پھر دکان پہ چلی آئی تھی۔

"مجھے نیلے رنگ کی چوڑیاں دینا۔" نئے آنے والے چوڑیوں کے سیٹ کو اشتیاق بھرے انداز میں دیکھتی۔ وہ کسی معصوم سی بچی کی مانند لگ رہی تھی۔ جو میلے میں رنگ برنگے کھلونے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہو۔ میران اس وقت دکان پہ اکیلا تھا۔ عمران بھائی ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر سے کھانا لینے گئے تھے۔ وہ اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

"دکھائیں نا۔" چوڑیوں سے نظریں ہٹا کر اس نے میران کے چہرے کی طرف دیکھا جانے ان لمحوں میں کیسا فسوں تھا۔ یا پھر نظروں میں کوئی اثر جو دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے چلے گئے۔ میران نے خوب صورت نیلے رنگ کی چوڑیوں کو اپنے سامنے رکھا۔ اور اپنا ہاتھ ایمن کی طرف بڑھا دیا۔ ایمن نے میکانکی انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس کی گوری کلائی میں نیلے رنگ کی چوڑیاں جیسے سج گئی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ کو میران کے ہاتھ سے نکالا۔ اور جیسے ہی اپنے سر سے سرکتے دوپٹے کو واپس رکھنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ تو چھن سے چوڑیاں اس کی کلائی میں کھنکنا اٹھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میران کچھ کہتا۔ نبیلہ بیگم دکان میں داخل ہوئی تھیں۔

"لے لیں تم نے چوڑیاں۔" انہوں نے ایمن سے دریافت کیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

نبیلہ بیگم کاؤنٹر پر کھڑے میران کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کچھ لمحوں کے بعد ان کے چہرے پہ شناسائی کے تاثرات ابھرے تھے۔

"ارے تم تو وہی ہو ناں۔ ریلوے اسٹیشن والے۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر میران سے دریافت کیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"امی! یہ عمران بھائی کی خالہ کے بیٹے ہیں۔ راولپنڈی سے آئے ہیں۔" ایمن نے جلدی سے میران کا تعارف کروایا۔

"اچھا اچھا پھر تو گھر کے ہی بچے ہو۔ ارے کلثوم کے بیٹے ہو تم۔" انہوں نے میران کی امی کا نام لیا۔ تو میران مسکرا دیا۔

"تمہاری امی کیسی ہیں بیٹا۔" نبیلہ بیگم نے پرس کھولتے ہوئے میران سے دریافت کیا۔

"جی ٹھیک ہیں۔" میران نے جواب نبیلہ بیگم کو دیا تھا۔ مگر وہ دیکھ ایمن کی کلائی میں موجود ہری چوڑیوں کی طرف رہا تھا۔

"میری طرف سے اپنی امی کو سلام کہنا اور یہ چوڑیوں کے پیسے۔" انہوں نے کہتے ہوئے دو سو کے نوٹ میران کی طرف بڑھائے۔

"رہنے دیں خالہ! عمران بھائی ناراض ہوں گے کہ ایمن سے چوڑیوں کے پیسے کیوں لیے۔" میران نے انہیں منع کیا۔ اور پھر نبیلہ بیگم کے کئی بار کہنے کے باوجود بھی اس نے ایمن کی چوڑیوں کے پیسے نہیں لیے تھے۔

☆☆☆

جانے کیا بات تھی۔ میران کا دل ایمن کی کلائی میں موجود چوڑیوں پہ اٹک سا گیا تھا۔ کتنے ہی دن وہ لاشعوری طور پہ ایمن کا منتظر رہا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک نئی چوڑیاں لینے دکان پہ نہیں آئی تھی۔ میران کو سخت بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ کل سے اسے ایک دفتر میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب پہ جانا تھا۔ اور وہاں جانے کا مطلب تھا وہ عمران بھائی کی دکان پر مزید نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اور وہ ایمن...... میران نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ اور فارغ بیٹھے عمران بھائی کی طرف دیکھا۔ جو لمبی سی جمائی لیتے ہوئے ایک ہاتھ کو منہ کے سامنے رکھے۔ اور دوسرے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے گردن کو کھجا رہے تھے۔

"عمران بھائی! یہ ایمن کہاں رہتی ہے؟" میران نے حتی الامکان اپنے لہجے میں لاپروائی سمو کر عمران سے دریافت کیا تھا۔

"یہی ہمارے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔" عمران نے چونک کر میران کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں، بس ایسے ہی کافی دنوں سے چوڑیاں لینے کے لیے نہیں آئی تو اسی لیے پوچھا۔ ویسے وہ لڑکی کتنی چوڑیاں خریدتی ہے۔ بس نہیں چلتا آپ کی دکان کی ساری چوڑیاں خرید کر گھر لے جائے۔ کوئی اتنا بھی چوڑیوں کا شوقین نہیں ہوتا۔ جتنی یہ لڑکی ہے۔" میران نے کہتے ہوئے عمران کی طرف دیکھا جو اس کی بات پہ ہولے سے ہنس پڑے تھے۔

"لڑکیوں کے یہی شوق ہوتے ہیں۔ چوڑیاں، مہندی، ہار سنگھار کرنا۔ اصل میں ایمن کو یہ شوق میں نے ہی ڈالا ہے۔" عمران نے کہتے ہوئے فخریہ انداز میں اپنی گردن کو اکڑایا۔

"وہ کیسے؟" میران نے سوال کیا۔

"آتے جاتے مطلب بھی وہ اسد کے ساتھ گھر آتی۔ تو چوڑیوں کا سیٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ کبھی میں اسد کے گھر گیا۔ تو جاتے ہوئے اس کے لیے چوڑیاں لے گیا۔" عمران بھائی کہہ کر ہنسنے لگے۔ تو میران بھی ہنس دیا۔

"اچھا یار! میں ذرا جمیل سے مل آؤں۔ جلدی آ جاؤں گا۔" عمران نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے میران سے کہا۔

"کوئی بات نہیں عمران بھائی! آج کے ہی دن کی بات ہے۔ کل سے تو میں خود اپنی جاب پہ ہوں گا۔ عیش کریں آپ۔" میران نے جیب سے اپنا فون نکالتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ ساجد کو بھی فون کرتا ہوں۔"

"عمران بھائی نے کہا اور چائے والے کی طرف متوجہ ہوئے۔"

"بس ایک کپ میران کو دے جاؤ۔ میں جا رہا ہوں۔" عمران نے چائے والے لڑکے سے کہا۔

ابھی میران نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا ہی تھا۔ جب وہ خوش گوار ہوا کے جھونکے کی مانند دکان میں داخل ہوئی تھی۔ آج وہ اپنی سہیلی کے ساتھ تھی۔ اسے دیکھ کر میران کھل سا گیا تھا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

"آج سرخ رنگ کی چوڑیاں دے دوں؟" میران کے لہجے میں محبت تھی۔ تو آنکھوں میں امید...... ایمن نے اثبات میں سر ہلایا۔ میران نے فوراً ہی چوڑیاں سامنے رکھ دیں اور ایک کاغذ کو ایمن کے سامنے کیا۔ اور پینسل کو کاغذ پہ سجا دیا۔ ایمن نے

استفہامیہ نظروں سے میران کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر کچھ بھی کہے بنا لبوں پہ شرمیلی مسکراہٹ سجائے اپنا سیل نمبر اس پر لکھ دیا۔ اور یوں زندگی کا موڑ بدل گیا تھا۔

میران جو نوکری کرنے اور پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ محبت کی راہ پر قدم رکھ چکا تھا۔ جانے کب، کیسے، کیوں، اسے ایمن سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ احساس محبت نے اس کے اندر نقاخر سا بھر دیا تھا۔ ایمن اس سے کہیں زیادہ اس کی دیوانی بن بیٹھی تھی۔ شاید محبت کی گہرائیوں میں وہ اتنی جلدی نہیں اترتا۔ اگر ایمن اسے اتنی شدت سے چاہنے کا دعوانہ کرتی۔

محبت کی راہ گزر پر ابھی وہ دونوں ہاتھ تھامے اترے ہی تھے۔ کہ تقدیر کے ظالم نے پلٹ ڈالا تھا۔ اس کتاب زیست کے ورق پر ایمن کے بھائی کی موت درج تھی۔ اسد روڈ ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گیا تھا۔ یہ وقت ایمن اور اس کی ماں کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جوان بیوہ بھابھی نے تو جیسے ایمن کو ہنسنا ہی بھلا دیا تھا۔

رنگ برنگی چوڑیوں کی شیدائی ایمن چوڑیاں پہننا بھول گئی تھی۔

"خود کو سنبھالو ایمن۔" اسے یوں تکلیف میں دیکھ کر میران بے چین سا ہو جاتا۔

"ایسا کیوں ہوا میران۔" وہ بس ایک ہی سوال کیے جاتی۔ اور میران قسمت کا لکھا کہہ کر اسے تسلی دیے جاتا۔ "مگر کوئی بھی تسلی اس کے غم زدہ دل کا مرہم نہیں بن پائی تھی۔

اور پھر عدت پوری کرنے کے بعد اس کی بھابھی اپنے دونوں بچوں کو لے کر اپنے میکے لوٹ گئی تھی۔ "بھابھی کے گھر والے کہتے ہیں کہ ہم اپنی جوان بیٹی کو ساری زندگی ایسے نہیں بٹھا سکتے۔ اسد بھائی کا جانا قسمت میں لکھا تھا۔ لیکن ہماری بیٹی ساری زندگی بیوگی کی زندگی گزارے یہ نہیں لکھا۔"

وہ بتاتے ہوئے رو پڑی تھی۔ اور میران اس کے آنسو صاف کر کے اسے خاموش کروا تا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

زندگی جو بھائی کی زندگی میں سبک روی سے گزر رہی تھی۔ رک کر رہ گئی تھی۔ ایمن کا تعلق مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ جہاں لوگ اپنے بچوں کو پڑھانے پر اپنی ساری جمع پونجی خرچ کر دیتے ہیں۔ تاکہ ان کا مستقبل روشن ہو سکے۔ اسد کو نبیلہ بیگم نے بیوگی اور غربت ہونے کے باوجود اچھا پڑھایا تھا۔ اور اب جب حالات بدلنے شروع ہوئے ہی تھے کہ اسد ہی منوں مٹی تلے جا سویا۔

نبیلہ بیگم کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس عمر اور غم کے ساتھ پھر اسے سلائی مشین کو چلاتیں۔ گھر کے حالات دیکھ کر ایمن نے اپنا گریجویشن چھوڑ کر اسکول میں نوکری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم جاب مت کرو۔ میں ہوں نا۔ میں واپس راولپنڈی چلا جاؤں گا۔ ابو اور امی کو منا لوں گا۔ میرے ابو کی راجہ بازار میں بہت بڑی دکان ہے۔ میں وہ دکان سنبھال لوں گا۔ خرچا میں اٹھاؤں گا۔ تم بس پڑھو۔" میران نے اپنے پاس بیٹھی ایمن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"لیکن....." ایمن نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم فکر مت کرو۔ تم اور آنٹی اب میری ذمہ داری ہو۔ اور میں کبھی اپنی ذمہ داری سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" میران نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے پیسے نکالے اور ایمن کی ہتھیلی پہ سجا دیے۔

"دس ہزار ہیں، گھر کا راشن اور کچھ خرچے پورے ہو جائیں گے۔ باقی میں جاتے ہی تمہیں مزید اور پیسے بھیج دوں گا۔ تم نے پڑھنا ہے ایمن! بہت سارا پڑھنا ہے۔" میران نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

"پاگل۔" میران نے ہولے سے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ اور ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی نبیلہ بیگم کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس کے لیے چائے بنا کر لائی تھیں۔

"میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں بیٹا۔" نبیلہ بیگم نے تھکے تھکے انداز میں کہا تھا۔ ایمن اب میران کے پاس سے اٹھ کر ماں کے قریب جا بیٹھی تھی۔

"ایسے مت کہیں آنٹی! بیٹا بھی کہہ رہی ہیں اور ساتھ میں شکریہ بھی ادا کر رہی ہیں۔ آپ اور ایمن اب میری ذمہ داری ہیں۔ میں جلد ہی اپنے پیرنٹس کو لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔" میران نے کہہ کر ایمن کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر سرخی گھلی تھی۔

"ضرور ضرور۔" نبیلہ بیگم نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اور میران سے کھانے کی بابت پوچھنے لگی تھیں۔

"نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" میران نے نفی میں سر ہلایا۔ اور ان سے ادھر ادھر باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

یوں میران اپنے خوابوں کو ایمن کے خوابوں کے عوض گروی رکھ کر واپس راولپنڈی لوٹ آیا تھا۔ ساجد صاحب اور کلثوم بیگم بیٹے کو ضد چھوڑ کر واپس آنے پر بھی خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔ جب میران نے اپنے ابو کے ساتھ دکان پر جانے کا اعلان کر کے ان دونوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

"بیگم! ذرا اٹھ کر چیک تو کرو۔ تمہارے بیٹے کے سر پر کہیں چوٹ تو نہیں لگ گئی۔" ساجد صاحب نے فکرمندی سے کہا۔ تو میران "ابو۔" کہہ کر کھسیا کر ہنس پڑا۔

"دیر آید درست آید۔ اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے بیٹا۔ برسوں کی میری دکان ہے۔ اور یہ دکان مجھے بہت عزیز ہے۔"

"میں تمہیں پڑھنے سے منع نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں جتنا پڑھنا ہے پڑھو۔ لیکن یاد رکھنا کہ تم نے ..... مجھے اب مزید آگے نہیں پڑھنا ابو۔ مجھے دکان سنبھالنی ہے۔" میران نے ساجد صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تو ساجد صاحب نے ایک بار پھر الجھ کر کلثوم بیگم کی طرف دیکھا۔

اتنی تبدیلی وہ بھی صرف دو ماہ میں، یہ بات ان دونوں میاں بیوی کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اور پھر دکان پہ بیٹھے میران کو ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا۔ جب میران نے ان کو ایمن کے بارے میں بتایا۔ وہ دونوں ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اتنے خاموش کہ میران گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور ساجد صاحب کے قدموں میں آن بیٹھا۔

"وہ بہت اچھی ہے ابو۔" میران نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

"دیکھو میران! ہر بار تم ہمیں ایک نئی آزمائش میں ڈال دیتے ہو۔ وہ لڑکی جتنی بھی اچھی ہو۔ تب بھی وہ اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی۔" کلثوم بیگم نے رسانیت سے کہا۔

"لیکن کیوں امی؟" میران جھنجلایا تھا۔

"اس لیے کہ تمہاری بچپن سے ہی بات عروما سے طے ہے۔ تمہارے نانا اور نانی یہ رشتہ....." کلثوم بیگم کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ میران اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پلیز امی۔ کیا ضروری ہے۔ ہر بار آپ دونوں میری خواہشوں کو یونہی رد کر دیں۔ اب یہ عروما کہاں سے بیچ میں آ گئی۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ آپ پلیز ایمن کی بات کریں۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بے بسی سے بولا تھا۔

"تمہاری یہ بات قابل قبول نہیں ہے میران۔ عروما سے تمہارا رشتہ آج کا نہیں طے۔ برسوں سے ہے۔ اور یہ بات تقریباً خاندان کے سب ہی لوگوں کو پتا ہے۔ ہمارے گھر کا ایسا ماحول نہیں ہے کہ لڑکے لڑکیاں آپس میں ..... ہم نے مناسب وقت آنے پر سوچا تھا۔ تمہیں اور عروما کو اس بارے میں بتا دیں گے۔ اور تمہاری خالہ کا تو فون بھی آ چکا ہے۔ وہ عروما کی شادی....."

"امی مجھے عروما سے شادی نہیں کرنی۔" میران

نے غصے سے ان کی بات کاٹی۔

"تو پھر اس کا مطلب یہ ہے خدیجہ کہ خدشات بالکل ٹھیک ہیں ساجد۔"

"تمہیں ہم نے لاہور اس لیے بھیجا تھا کہ تم ایمن نام کا کانٹا اپنے ساتھ لگا کر لے آؤ۔ تم میرے اور میری بہن کے بیچ دوریوں کا سبب بن رہے ہو وہ بھی اس لڑکی کی وجہ سے جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" کلثوم بیگم نے غصے سے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا تعلق ہے امی! ایمن سے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ میں جلد ہی اپنے پیرنٹس کو اس کے گھر لے آؤں گا امی اب میں اپنے وعدے سے پھر نہیں سکتا۔"

"بیٹا اگر تم اپنی چاردن کی محبت سے نہیں پھر سکتے تو ہم کیسے برسوں کی دی ہوئی زبان سے پھر جائیں۔ تمہاری امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ جو بھی ہے ایمن اسے بھول جاؤ۔ اور عروما کے بارے میں سوچو۔" ساجد صاحب نے کہتے ہوئے اپنی گود میں پڑے اخبار کو سیدھا کر کے اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔ میران نے شکوہ بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ جو اس کے شکوے اور شکایتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔ اپنے سامنے پڑی سبزی کی ٹوکری کھینچ چکی تھیں۔

میران نے ایک زوردار ٹھوکر پاس پڑی کرسی کو ماری۔ اور گھر سے نکلتا چلا گیا تھا۔

"ساجد صاحب! میران۔" ہاتھ میں موجود بھنڈی اور چھری کو ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کلثوم بیگم نے فکرمندی سے شوہر کو پکارا۔

"تم فکر مت کرو، خود ہی چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" اخبار لپیٹ کر رکھتے ہوئے ساجد صاحب نے اپنی شریک حیات کو تسلی دی۔ اور اپنے فون پہ آنے والی کال کی سمت متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

چار دن کی بات چار ماہ کے بعد بھی ویسی کی ویسی ہی رہی تھی۔ ساجد صاحب اور کلثوم بیگم اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کو راضی نہیں تھے۔ اور میران ایمن نام سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو راضی نہیں تھا۔ ان چار ماہ میں میران نے ہر ماہ باقاعدگی سے ایمن کو گھر کا خرچا بھیجا تھا۔ اور دوبار اسے ملنے کے لیے لاہور بھی آیا۔ دونوں بار وہ ڈھیروں تحائف اور چیزوں کے ساتھ ایمن سے ملا تھا۔

"اتنی ساری چیزیں" ایمن اتنے شاپنگ بیگز دیکھ کر پاگل سی ہوئی تھی۔

"بیٹا! میں تمہاری خالہ کے گھر گئی تھی تو....."

نبیلہ بیگم نے شاپنگ بیگز سے نظریں ہٹاتے ہوئے میران کی طرف دیکھتے ہوئے بات کو ادھورا چھوڑا تھا۔

"آنٹی! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں امی اور ابو کو منالوں گا۔" میران نے ایمن کی طرف دیکھتے ہوئے نبیلہ بیگم کو تسلی دی۔ تو ایمن کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میران بھی دل سے مسکرا دیا تھا۔ اور پھر بیٹے کی ضد اور خوشی دیکھ کر ساجد صاحب اور کلثوم بیگم کو پسپا ہونا پڑا تھا اور یوں میران کی منگنی خوب دھوم دھام کے ساتھ ایمن سے کر دی گئی تھی۔

"سوری عمران بھائی۔" میران نے عمران کے گلے ملتے ہوئے قدرے شرمندگی سے کہا تھا۔

"چھوڑ یار کیا سوری۔ اگر عروما میری بہن ہے۔ تو ایمن بھی میری بہن جیسی ہے۔ قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا۔ امی اور ابو کو دکھ تو ہوا تھا۔ لیکن پھر میرے سمجھانے پر سمجھ گئے۔ خوش رہو۔" عمران کہتے ہوئے ایک بار پھر میران کے گلے لگا تھا۔

"مبارک ہو۔" سادہ سی عروما مسکراتی ہوئی میران اور ایمن کے قریب آئی۔ اور دونوں کو منگنی کی مبارک باد دینے لگی۔

"خیر مبارک۔" ایمن نے کہتے ہوئے میران

pklibrary.com

میران نے چونک کر پہلے اپنے بازو پہ دھرے ایمن کے ہاتھ کو دیکھا۔ اور پھر ایمن کے چہرے کی طرف جو جتاتی ہوئی نظروں سے عروما کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میران لحظے بھر کے لیے گھبرا کر عروما کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ عروما چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ سجائے اب اپنے ہاتھ میں موجود گفٹ ایمن کی طرف بڑھا رہی تھی۔ جسے ایمن نے یوں ہی لیکن میران نے دل سے شکریہ کے ساتھ وصول کیا تھا۔

زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ جو چاہا جائے اسے پالیا جائے۔ یہ سعادت ہر کسی کے حصے میں تھوڑی آتی ہے۔ میران اپنی قسمت پہ مغرور سا ہوا تھا۔ وہ تو شادی کی تاریخ لینے پر بضد تھا۔ لیکن نبیلہ بیگم نے ایمن کے گریجویشن کرنے تک شادی کی تاریخ دینے سے منع کیا۔ تو میران بادل نخواستہ مگر خاموش ہو گیا تھا۔

وہ اس کی ہو چکی تھی۔ یہ بھی کوئی کم بات نہیں تھی۔ اور اس بات کو فخریہ سینے پہ سجائے میران ساجد اپنے والدین کے ہمراہ راولپنڈی واپس آ گیا تھا۔

☆☆☆

ابھی تو ایمن کے ساتھ ہونے والی منگنی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ مارکیٹ میں لگنے والی آتش زدگی میں ساجد صاحب کی دکان بھی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

لاکھوں کا سامان اور کیش جو ساجد صاحب اسی دن گھر سے اٹھا کر دکان پر لے گئے تھے۔ کہ ٹائم نکال کر اسے بینک میں جمع کروا دیں گے۔ جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ چلتا ہوا کاروبار لمحوں میں آگ کے شعلوں میں آ کر ختم ہو چکا تھا۔ اور یہ آگ کے شعلے ساجد صاحب اور میران کو آسمان سے زمین پر لے آئے تھے۔ یہ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔

میران پریشان اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس کے فون پہ ایمن کی کال آنے لگی تھی۔ میران نے کال اٹینڈ کی اور فون کان سے لگا لیا۔

"میران! تم نے پیسے نہیں بھیجے۔ مالک مکان کرایہ لینے کے لیے آیا تھا اور....."

"میں بہت پریشان ہوں ایمن۔ دکان اور کاروبار سے زیادہ مجھے ابو کی فکر ہو رہی ہے۔ ان کا بی پی نارمل نہیں ہو رہا۔ حالانکہ میں نے انہیں سمجھایا ہے۔ جو نقصان ہونا تھا ہو چکا ہے۔ ہمت کرتے ہیں قرض لے لیں گے۔ پھر سے کاروبار شروع کریں گے لیکن ابو.....!" میران کا لہجہ بوجھل ہوا تھا۔

"میران پیسے....." ایمن نے اس کی بات کے جواب میں یہ کہا۔ تو اپنی پریشانی شیئر کرتا میران قدرے غصے میں آیا تھا۔

"مل جائیں گے تمہیں پیسے۔" میران نے ناراضی سے کہا۔ اور اس کی کال ڈس کنیکٹ کر دی۔ جس وقت وہ ایمن کے نمبر پر ایزی پیسہ کے ذریعے پیسے بھجوا رہا تھا۔ اس کے فون پر کلثوم بیگم کی کال آنے لگی تھی۔

"جی امی۔" اس نے کال اٹینڈ کر کے فون اپنے کان سے لگایا ہی تھا۔ جب ماں کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"میران! تمہارے ابو کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بیٹا! جلدی سے گھر آ جاؤ۔"

کلثوم بیگم بری طرح رو رہی تھیں۔ میران نے جلدی سے پیسے دوکاندار کو تھمائے۔ موبائل کو جیب میں رکھا اور اپنے بائیک کو سٹارٹ کر کے اندھا دھند گھر کی سمت بھاگا تھا۔ جب تک وہ گھر پہنچا تھا۔ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہاسپٹل میں موجود ڈاکٹر نے موت کی تصدیق کر دی تھی۔ انہیں یکے بعد دیگرے دو ہارٹ اٹیک ہوئے تھے۔ وہ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ میران لڑکھڑایا تھا اور وہیں ہسپتال کی زمین پہ بیٹھتا چلا گیا تھا۔ باپ کا یوں چلے جانا اس لیے ناقابل برداشت تھا۔

☆☆☆

زندگی کسی کے جانے سے رکتی کب ہے۔ گھڑی

کی سوئیاں اسی طرح چلتی دن اور رات کے چکر پورے کیے جاتی ہیں۔ سورج ویسے ہی روز نکلتا ہے۔اور روز مغرب کی آغوش میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے۔ لیکن یوں اچانک کسی بہت اپنے کے جانے سے پیچھے رہ جانے والوں کی زندگیوں پر اثر تو ہوتا ہے۔

کلثوم بیگم اور میران کے لیے یہ صدمہ جھیلنا آسان نہیں تھا۔ پہلے چلتا ہوا کاروبار جل کر راکھ ہوا۔ اور پھر یوں گھر کا سربراہ یہ صدمہ برداشت نہ کر کے راہی عدم سدھار جائے۔ تو دل افسردہ ہو جایا کرتے ہیں۔ گھر میں موجود سیونگ سے ساجد صاحب کے کفن دفن کے اخراجات تو ہو گئے تھے۔ لیکن وہ پیسے بھی کب تک چلتے۔ کلثوم بیگم نے تھکے ہوئے انداز سے اپنے ہاتھ میں موجود چند ہزار میران کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔ میران نے چونک کر اپنے ہاتھ میں پڑے ان نیلے رنگ کے نوٹوں کو دیکھ کر استفہامیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"بس یہی پیسے بچے ہیں۔" کلثوم بیگم کہہ کر رو پڑی تھیں۔ میران نے گہری سانس بھری۔ اور ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

"فکر کیوں کرتی ہیں، میں ہوں نا۔" اس نے ماں کو تسلی دی۔ اور پھر نوکری ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلا تو اسے پتا چلا۔ باپ کی موجودگی کا کتنا گھنا سایہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے بھی نوکری کرنے کے لیے لاہور گیا تھا۔ تب نوکری ڈھونڈنے اور اب نوکری کی تلاش میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ تب لاپروائی تھی۔ بے فکری تھی اور تب اسے بنا کسی تگ و دو کے نوکری مل بھی گئی تھی۔ اور اب اسے جوتیاں گھسنے کے بعد بھی بیس ہزار روپے پہ نوکری ملی۔ جسے اس نے شکر ادا کرتے ہوئے اگلے ہی دن جوائن کر لیا تھا۔

جیسے ہی اسے پہلی تنخواہ ملی۔ اس نے پانچ ہزار کلثوم بیگم کی ہتھیلی پہ سجا دیے۔ اس سے پہلے کہ کلثوم بیگم اسے کچھ کہتیں۔ وہ خود ہی بول پڑا۔

"امی! مجھے ایمن سے ملنے جانا ہے۔ بہت ماہ ہو گئے ہیں۔ میں اس سے ملا نہیں ہوں۔ ابو کی فوتگی میں بھی وہ آنٹی کے ساتھ نہیں آئی تھی۔

میں اگلے ماہ سے آپ کو زیادہ پیسے دیا کروں گا۔ بس اس ماہ کسی بھی طرح مینج کر لیں۔" میران نے نظریں جھکا کر کہا۔ تو کلثوم بیگم آہستگی سے سر ہلا کر اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ بہت خوش تھا۔ وہ کتنے ماہ کے بعد اس سے ملنے جا رہا تھا۔ دس ہزار الگ رکھنے کے بعد میران کے پاس باقی جو پیسے بچے تھے۔ اس نے کرایہ رکھنے کے بعد سارے پیسے ایمن کی فیورٹ چیزوں کو خریدنے میں خرچ کر دیے تھے۔ یہ سب پہلے کی طرح نہیں تھا۔ لیکن ایمن کی ہر فیورٹ کھانے کی چیز اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ جس وقت میران نے ایمن کے گھر کی ڈور بیل کو دبایا تھا۔

خوشی اس کے اندر تک سرائیت کر گئی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ بے انتہا، بے تحاشا۔ یہ سوچتے ہوئے میران نے ایک بار پھر بیل پہ ہاتھ رکھا اس بار دروازہ کھل چکا تھا۔ لیکن کھولنے والا کوئی تیسرا تھا۔

"السلام علیکم۔" میران نے سلام کیا۔

"والسلام۔" اس ادھیڑ عمر شخص نے میران سے ہاتھ ملایا۔

"ارے میران بیٹا۔" اس آدمی کے عقب میں نبیلہ بیگم کی آواز گونجی اور وہ تیزی سے آگے بڑھ کر میران سے ملنے لگی تھیں۔

"آؤ، آؤ اندر آؤ باہر کیوں کھڑے ہو؟" نبیلہ بیگم نے میران کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تو میران گھر کے اندر چلا آیا۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔ آصف بھائی، ایمن کے ماموں۔ دبئی میں ہوتے ہیں۔ ہم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

"اور بھائی صاحب! یہ میرا ان ہے۔ بہت ہی اچھا بچہ ہے۔" نبیلہ بیگم نے میران کا تعارف کروایا۔

تو میران اس آدھے ادھورے تعارف پہ الجھ سا گیا تھا۔

"آؤ آؤ۔ اندر آ کر بیٹھو۔ تمہاری امی کیسی ہیں؟" میران کو ساتھ لیے وہ ہمیشہ کی طرح لاؤنج میں لے جانے کے بجائے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھیں۔

"بیٹا! برا مت ماننا میرے بھائی ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔ اگر میں ایمن کے منگیتر کی حیثیت سے تعارف کروائی۔ تو غصہ کر جاتے کہ شادی سے پہلے کیوں گھر آنے کی اجازت دی گئی ہے۔"

نبیلہ بیگم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ تو میران سوائے سر کو اثبات میں ہلانے کیا کر سکتا تھا۔ اور یوں وہ اس دن ایمن سے ملے بنا ہی واپس راولپنڈی آ گیا تھا۔

آنے سے پہلے وہ چیزیں اور اپنی جیب میں موجود دس ہزار روپے نبیلہ بیگم کو تھما آیا تھا۔

"کچھ ہی دنوں کی بات ہے، بھائی صاحب چلے جائیں گے۔ تم پھر آ جانا۔" کوچ میں بیٹھتے ہی میران کے کانوں میں نبیلہ بیگم کی آواز گونجی تھی۔

اس نے سر جھٹکا اور ایمن کو میسج کرنے لگا تھا۔ کئی بار میسج اور کال کرنے کے بعد بھی ایمن نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تو پھر میران فون جیب میں ڈال کر کوچ کی کھڑکی کے باہر کے مناظر دیکھنے لگا تھا۔ جانے کیوں اس کا دل اداس تھا۔ اور خاموش سا بھی۔ باہر کے مناظر سے اکتا کر میران نے اپنے سر کو سیٹ کی بیک پر رکھا اور اپنی آنکھوں کو موند لیا تھا۔

☆☆☆

"ماموں مجھے اور امی کو تین ماہ کے لیے دبئی لے کر جا رہے ہیں۔" ایمن کی چہکتی ہوئی آواز میران کے کانوں سے ٹکرائی۔ تو میران لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

"کیوں وہ تمہیں کیوں لے کر جا رہے ہیں؟" میران بے چین سا ہوا تھا۔

"ویسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے۔ ماموں کی پوری فیملی باہر ہوتی ہے نا۔ ماموں کہہ رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہ لو۔ تو امی مان گئیں۔ لیکن میں نے امی سے کہا تھا۔ میں پہلے میران سے پوچھوں گی۔ اگر وہ مجھے اجازت دے گا۔ تب ہی میں دبئی جاؤں گی۔ اور مجھے پتا ہے۔ تم کبھی بھی مجھے جانے سے منع نہیں کرو گے۔ ہے نا۔" ایمن نے بات کرتے ہوئے رک کر میران سے اپنی بات کی تائید چاہی تھی۔

"اور اگر منع کر دوں پھر....." میران اپنے بستر سے اتر کر باہر صحن میں چلا آیا تھا۔ سامنے ہی سیاہ آسمان پہ موجود چمکتا ہوا چاند اس کی نظروں کے عین سامنے تھا۔

"منع کر دو گے تو نہیں جاؤں گی۔" اس کی اداسی میں گھلی آواز میران کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ جہاں محبت کے جھرنے میں کچھ اور خوب صورت سروں کا اضافہ ہوا تھا۔ وہیں آسمان پر چمکتے چاند کی چاندنی پہلے سے کہیں زیادہ روشن لگی تھی۔ محبت تفاخر بن کر اس کے لبوں پہ آ ٹھہری تھی۔

"لیکن میران! اب تم کبھی دبئی کی سیر کے لیے نہیں لے جا کر جا سکتے۔ ہاں اگر تمہارے ابو زندہ ہوتے اور ان کا کاروبار یونہی چلتا رہتا۔ پھر تو میرے سارے خواب پورے ہو جاتے۔ لیکن اب تو ایسا لگتا ہے، بہت سارے ادھورے خوابوں کے ساتھ جینا پڑے گا۔ اور ان میں سے ایک ادھورا خواب دبئی جانے کا ہو گا۔" ایمن کے لہجے میں آنسوؤں کی نمکینی گھلی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ایمن! میں نے عمران بھائی سے بات کی ہے۔ میں جلد ہی اپنا کاروبار شروع کر لوں گا۔ میں نے مارکیٹ میں موجود ابو کے دوستوں سے قرضے کی بات کی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ سب ایسا تھوڑی رہے گا۔" میران نے جلدی سے اسے تسلی دی۔

"لیکن دبئی تو نہیں جا پاؤں گی۔" ایمن کی سوئی دبئی پہ اٹکی۔

"کیوں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔" میران نے صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایمن سے کہا۔

"اچھا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"اداس ہو۔" میران بے چین سا ہوا۔

"میران! دبئی اگر تم نہیں لے کر گئے تو....."

"میں تمہیں لے جاؤں گا ایمن۔ اور اگر اس سے پہلے تم اپنے ماموں کے ساتھ دبئی کی سیر کے لیے جانا چاہتی ہو۔ تو چلی جاؤ۔" وہ اسے اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی لیے اپنی مرضی نہ ہونے کے باوجود اس نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"سچ میں میران۔" ایمن خوشی سے چلائی۔ اس کی کھنکتی ہوئی آواز نے میران کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"سچ میں ایمن۔" میران ہنسا تھا۔

"مجھے پتا تھا، تم مجھے کبھی جانے سے منع نہیں کرو گے۔ مجھے پتا تھا۔ میری خوشی تمہارے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ مجھے پتا تھا میران!" وہ کسی مینا کی طرح چہکی تھی۔ اور اسے یوں خوش دیکھ کر میران کو اور کیا چاہیے تھا۔ ایمن اب اسے خوشی سے اپنی تیاریوں اور پروگرام کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے، تم نے طے تو پہلے سے کر رکھا ہے۔" میران نے اسے چھیڑا۔

"ہاں ناں۔ مجھے پتا تھا۔ میں تم سے کہوں گی۔ تم کبھی بھی مجھے جانے سے منع نہیں کرو گے۔" ایمن کے لہجے میں محبت بولی تھی۔

"سنو، وہاں جا کر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی۔" میران نے یوں ہی اس سے سوال کیا۔

"کیسے بھول سکتی ہوں۔ تمہاری انگوٹھی میرے ہاتھ کی انگلی میں موجود ہے۔ جو ہر لمحہ ہر وقت مجھے تمہاری یاد دلاتی ہے۔ قید کر کے پوچھ رہے ہو۔ آزاد تو نہیں ہو جاؤ گی۔" ایمن نے اسے چھیڑا۔ تو میران اس بار کھل کر ہنس پڑا تھا۔

"ابھی قید ہی کہاں کیا ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں اپنے گھر لا کر، اپنے سامنے بٹھا کر پہروں دیکھتا رہوں۔ محبت کے نغمے سناتا رہوں اور محبت کے گیت تمہیں سناتا رہوں۔ تم دبئی سے ہو آؤ۔ ان تین ماہ میں، میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ اور اس کے بعد جب تم واپس آؤ گی۔ امی کو لے کر تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تاکہ اپنی شہزادی کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس لے کر آؤں۔ اور پھر قید کر لوں۔"

میران کہہ کر مسکرایا تھا۔ ڈھیروں باتیں تھیں جو اس رات ان دونوں نے کی تھیں۔ رات کے آخری ستارے ڈوب کر نئی صبح کی نوید سنائی تھی۔ تو وہیں بیٹری ختم ہونے کی ٹون بھی بج گئی تھی۔ ابھی تو اور بھی بہت ساری باتیں بتانا تھیں۔ لیکن فون کی بیٹری کی وجہ سے وہ دونوں مجبور ہو کر کال بند کر کے اپنے اپنے بستروں پر آ کر لیٹے تھے۔ دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ خوبصورت اور دلکش سی مسکراہٹ۔

☆☆☆

اور پھر یوں ایمن تین ماہ کے لیے نبیلہ بیگم کے ساتھ دبئی چلی گئی تھی۔ اور ان تین ماہ میں ہی میران نے کوشش کر کے اپنی دکان بنا لی تھی۔ لیکن یہ دکان ساجد صاحب کی دکان کی طرح دوڑتی تو کیا ابھی چل بھی نہیں پا رہی تھی۔ وجہ ایک تو پرانی شاپ والی جگہ پہ دکان کا نہ ملنا تھا۔ اور دوسرے ابھی میران کے پاس اتنا تجربہ بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ پھر بھی پرامید تھا۔ اسے یقین تھا، وہ جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔

اس نے ابھی تک ایمن کو اپنی شاپ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا۔ ایمن کے واپس آنے کے بعد ہی وہ اسے اپنی دکان کی خوش خبری دے گا۔ وہ شدت سے ایمن کے لوٹ آنے کا منتظر تھا۔ کیونکہ کلثوم بیگم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ نبیلہ بیگم اور ایمن کے آتے ہی وہ ان سے شادی کی تاریخ لینے کے لیے پہنچ جائیں گی۔ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے کا گھر بستا اور اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتی تھیں۔

بھلا میران کو اس بات سے کیا اعتراض ہو سکتا

تھا۔ وہ تو خود بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔ شادی کر کے ایمن اور نبیلہ بیگم کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ تا کہ کرائے کے مکان اور دیگر اضافی اخراجات کم ہو جائیں۔ اور پھر اسے ایمن اور نبیلہ بیگم کے واپس لوٹ آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ جیسے ہی ایمن کا میسج موصول ہوا۔ میران ڈھیروں گفٹس کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

"تم آ بھی گئے۔" ایمن، میران کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"ہاں آ گیا۔ اتنے مہینوں کے بعد آئی ہو۔ تو کیا میں تم سے ملنے کے لیے بھی نہیں آتا۔" میران نے اپنے ہاتھ میں موجود شاپنگ بیگز ایمن کی سمت بڑھائے جنہیں اس نے بے دلی سے تھام لیا تھا۔ نبیلہ بیگم سے ملنے کے بعد میران ان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ جب ایمن کا سراپا ایک بار پھر دروازے پہ ایستادہ ہوا تھا۔

"امی کی طبیعت نہیں ٹھیک تھی اس لیے۔ گھر میں کچھ بھی پکا ہوا نہیں ہے۔ کیا کروں؟" ایمن نے اپنی مخروطی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے جانے کس سے کہا تھا۔ میران سے یا پھر نبیلہ بیگم سے۔

"کوئی بات نہیں، کھانا ہم باہر سے منگوالیں گے۔" میران نے ایمن کی مشکل حل کی تھی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ایمن سنتے ہی اپنی جگہ سے ہٹی اور نبیلہ بیگم کے پاس آ بیٹھی۔ ان دونوں کے پاس دبئی کی باتوں کے سوا دوسری کوئی بات نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ایمن یا نبیلہ بیگم نے ایک بار بھی اس سے کلثوم بیگم کے بارے میں بھی دریافت نہیں کیا تھا۔

"امی! شجر بھائی کو دیکھا تھا۔ جب ہم آ رہے تھے۔ کیسے اداس ہو رہے تھے۔" ایمن نے ایک گھنٹے کی گفتگو میں کوئی پچیسویں بار شجر کا نام لیا۔ تو میران جھنجھلا ہی گیا تھا۔

"امی تمہارا پوچھ رہی تھیں ایمن! تمہیں یاد کر رہی تھیں۔" میران نے جتاتے ہوئے لہجے میں ایمن سے کہا۔ تو ایمن کے ساتھ ساتھ نبیلہ بیگم بھی ٹپٹائی تھیں۔

"ایمن تو خود تمہیں اور کلثوم بہن کو یاد کر کے اداس ہوتی تھی۔ تم آتے آتے ہوئے کلثوم بہن کو بھی لے آتے۔ اچھا ہے، ہم سے مل جاتیں اور ان کا دل بھی اور سا ہو جاتا۔" نبیلہ بیگم نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"امی آنا چاہتی ہیں۔" ......

"کیوں آنا چاہتی ہیں؟" میران کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ایمن بول پڑی تھی۔

"شادی کی تاریخ لینے اور کس لیے۔" میران نے ذرا اکھڑپن سے کہا۔ تو ایمن چپکی ہو کر بیٹھ گئی۔

میران نے کھانا آن لائن آرڈر دے کر گھر پہ منگوالیا۔ اور ایمن بے دلی سے کھانا کو سرد کر کے آ بیٹھی۔

میران صبح بنا ناشتے کے گھر سے نکلا تھا۔ اور اس وقت بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ نبیلہ بیگم کے کھانا کھا لیتے ہی میران نے جلدی سے سالن اپنی پلیٹ میں نکالا اور کھانا کھانے لگا۔

"توبہ ہے میران! ایسے کھا رہے ہو۔ جیسے کئی دنوں کے بھوکے ہو۔ تمیز سے کھانا کھاؤ۔ اپنا ہی ہے کھانا۔" ایمن کے لفظ، انداز اور لہجہ پر نوالے کو بمشکل اپنے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے میران نے اپنے ہاتھ میں پکڑی روٹی کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھا اور خشمگیں نظروں سے ایمن کو دیکھا۔

"ہاں تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ایسے کھا رہے ہو، جیسے پہلی بار کسی ہوٹل کا کھانا ملا ہے۔" اس کا انداز استہزائیہ تھا۔ میران کے دل پہ جیسے کسی نے زور سے تیز خنجر کی نوک کو چبھو دیا تھا۔

"میں صبح بنا ناشتے کے گھر سے نکلا ہوں۔ اور یہاں مجھے آئے بھی دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ سوائے ایک گلاس پانی کے تم نے مجھے ایک کپ چائے کو بھی نہیں پوچھا اور اب......" میران کا لہجہ تاسف زدہ ہوا

pklibrary.com

تھا۔ اس نے اگلے ہی لمحے اپنے سامنے پڑی پلیٹ کو پرے سرکایا۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹا! ایمن تو مذاق کر رہی ہے۔ تم بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" نبیلہ بیگم نے آداب میزبانی بھی جیسے مشکل سے نبھائے تھے۔

"نہیں آنٹی مجھے بھوک نہیں ہے۔"

ایک نظر ایمن کے چہرے پر ڈال کر میران نے جھک کر ٹیبل سے اپنا فون اٹھایا۔ اور خدا حافظ کہہ کر ان کے گھر سے نکل آیا۔ کتنی دیر وہ دروازے کے باہر کھڑے ہو کر ایمن کے آنے کا انتظار کرتا رہا کتنی دیر وہ بس اسٹاپ پر موجود چائے کے ڈھابے پہ بیٹھ کر ایمن کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ چائے کا تیسرا کپ دیر میں ختم کرنے کے بعد کتنی دیر وہ ایمن کے ایک میسج کا انتظار کرتا رہا تھا۔

لیکن نہ تو ایمن کی کال آئی تھی نہ ہی کوئی میسج۔ وہ دل میں پہلی بار ایمن کی طرف سے ڈھیروں ناراضی لیے واپس راولپنڈی آ گیا تھا۔ یہ ناراضی اور غصہ اسے خود ہی ایمن کو کال کر کے ختم کرنا پڑا تھا۔ وہ جو اس سے ڈھیروں باتیں کرنے کے لیے کال ملا کر بیٹھا تھا۔ دو منٹ کے بعد ہی ایمن کے بہت نیند آ رہی ہے۔ کہنے پر اسے فون بند کرنا پڑا تھا۔

میران ہاتھ میں فون تھامے اس کی بلیک سکرین کو دیکھے چلا گیا تھا۔

"کچھ بدل رہا ہے؟" اس کے دل نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں بدل رہا۔ کچھ بدل سکتا ہی نہیں۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔ اور صحن سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا اور بیڈ پر گر کر منہ پر تکیہ رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

موسم کو بدلنے میں بھی ٹائم لگتا ہے۔ صبح ہوتی دیکھ کر اپنے اپنے آشیانوں سے پرواز بھرتے پرندوں کو گھر لوٹ کر آنے میں بھی ٹائم لگتا ہے۔ دن کو رات کے گلے میں بانہیں ڈالنے میں بھی وقت لگتا ہے تو یہ طے تھا تبدیلی ایک دم نہیں آیا کرتی۔ وقت لگتا ہے انتظار کرنا پڑتا ہے۔

بس ایک انسان ہے جسے بدلنے میں بس ایک لمحہ لگتا ہے۔ اور وہ ایک لمحہ میران اور ایمن کے درمیان آن ٹھہرا تھا۔ وہ میران کے ساتھ کیے وعدوں اور قسموں کے ساتھ ساتھ عزت و احترام سے پہنائی گئی انگوٹھی بھی اسے واپس کرنا چاہ رہی تھی۔ آہ کیسا جانکاہ لمحہ تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایمن۔" کتنی مشکل سے میران کے لبوں سے لفظ نکلے تھے۔ یہ تو بس میران ہی جانتا تھا۔

"وہی کہہ رہی ہوں۔ جو تمہیں سنائی دے رہا ہے۔" ایمن جیسے اکتائی تھی۔ میران نے اس کی اکتاہٹ کو یکسر نظر انداز کیا تھا۔ اس کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

فون بند کرنے کے بعد میران کلثوم بیگم کو لاہور جانے کا بتا کر گھر سے نکل آیا تھا۔

"ارے بیٹا! بتا کر تو جاؤ۔ کیا ہوا ہے؟" وہ بے چاری پوچھتی رہ گئی تھیں.....

وہ اسی شام ایمن کے گھر پر موجود تھا۔ نبیلہ بیگم اور ایمن اسے دیکھ کر ذرا سا گھبرائی تھیں.....اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتیں۔ میران، ایمن کے سامنے آ کر رکا تھا۔

"تم فون پہ کیا کہہ رہی تھیں۔" بورنگ آنکھیں ایمن کے چہرے پہ جمائے ہوئے میران نے اس سے دریافت کیا۔

"دیکھو بیٹا! آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔" نبیلہ بیگم نے آگے بڑھ کر میران کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"آرام سے بیٹھ کر۔ آنٹی! آپ کو پتا ہے اس نے مجھ سے کیا کہا۔" میران کا لہجہ بھیگا تھا۔

"ہاں، میں جانتی ہوں۔ اس نے تم سے کیا کہا ہے۔ ہر انسان کو حق ہے وہ اپنے اچھے مستقبل کے بارے میں سوچے۔ اور پھر میر۔، بھائی نے اتنی محبت اور چاہت سے ایمن کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے

مانگا تھا۔ میں انکار نہیں کر پائی۔ اور میں نے ایمن کا نکاح نجر سے کر دیا ہے۔" دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں کہتی ہوئی نبیلہ بیگم نے جیسے میران کے وجود کے پرخچے اڑائے تھے۔

"نکاح کر دیا ہے۔" حیرت سے میران کی آنکھیں پتھرائی تھیں۔

"ہاں۔ نکاح کر دیا ہے۔ اگلے ماہ وہ سب آجائیں گے۔ اور میں ایمن کی رخصتی کر دوں گی۔ دیکھو، میران! شور مچانے کا یا پھر لڑنے جھگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ چاہو تو تم نکاح نامہ بھی دیکھ سکتے ہو۔ مجھے اپنی بیٹی کے شان دار مستقبل کے لیے جو ٹھیک لگا۔ میں نے وہی کیا ہے۔ اور میں اس کا حق رکھتی ہوں۔" نبیلہ بیگم کہہ کر اندر کمرے کی طرف چلی گئی تھیں۔

میران نے پتھرائی ہوئی نظروں سے اپنے سامنے کھڑی اپنے لبوں کو دانتوں تلے کچلتی ایمن کی طرف دیکھا۔ جو اضطراری انداز میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو بھی مروڑ رہی تھی۔

"ایمن۔" میران نے اسے پکارا۔

"میں دبئی چلی جاؤں گی میران۔ مجھے تمہارے ساتھ سسک سسک کر نہیں جینا تھا۔ دو اور دو چار کرتے ہوئے زندگی کو نہیں گزارنا تھا۔ تو اس لیے......"

"محبت......" میران نے اس کی بات کاٹ دی۔

"محبت کا کیا ہے، وہ تو کبھی بھی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تمہاری محبت مجھے کانچ کی چوڑیوں سے کبھی آگے نہیں سوچنے دیتی۔ اور دیکھو نجر کے ساتھ نے میری کلائی میں سونے کی چوڑیاں سجادی ہیں۔"

ایمن کے اپنی کلائی میں موجود چار سونے کی چوڑیوں کو میران کی نظروں کے سامنے کیا۔

"ان چوڑیوں کے عوض تم نے اپنی محبت کا سودا کیا ہے۔" میران کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ تو آنکھوں میں نمی نے جگہ بنالی تھی۔

"محبت سے پہنائی گئیں ان کانچ کی چوڑیوں کی کھنک کیا تمہیں سونے کی چار چوڑیوں میں سنائی دی ہے۔" میران کے سوال پر ایمن کے چہرے پہ تاریک سایہ گزرا تھا۔

"بہت گھاٹے کا سودا کیا تم نے ایمن! کیا میں اور میرا وقت پندرہ ہزار کی تنخواہ پر ٹکے رہتے۔ نہیں ایمن منیب! بالکل بھی نہیں۔ اللہ جب آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس آزمائش سے نکلنے کے لیے پہلے اسباب بھی مہیا کر دیتا ہے۔ میں نے اپنی دکان بنالی ہے ایمن۔ بس کچھ عرصے کی بات ہے، میں تمہیں ایسی سونے کی چوڑیاں بنوا کر دوں گا اور تمہیں دبئی بھی......" میران نے آگے بڑھ کر ایمن کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

"مجھے جو چاہیے تھا، وہ مجھے مل گیا ہے میران۔"

ایمن کہتے ہوئے دو قدم پیچھے ہوئی۔ اجنبیت، بیگانگی، لاتعلقی اس کے انداز میں کیا کچھ نہیں تھا۔ یقیناً وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ جو اسے چاہیے تھا، وہ دبئی میں اسے مل چکا تھا۔ مزید کچھ بھی کہنا اپنی اور اپنی محبت کی توہین کے مترادف تھا۔

میران کا دل کٹا تھا۔ محبت کرلائی تھی۔ اور وجود جیسے ایک دم کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوا تھا۔ وہ دھیرے سے پلٹا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے پلٹ آیا تھا۔ نہیں نہیں، وہ خود تو واپس آگیا تھا مگر اس کا دل وہیں ایمن کے پاس اس کے قدموں میں پڑا رہ گیا تھا...... آہ یہ خواہشیں اور آرزوئیں ایک اچھے انسان کے دل کو رول گئی تھیں۔ مٹی میں ملاتی تھیں۔ میران کو خود نہیں پتا تھا۔ وہ کیسے اس گھر سے نکلا تھا۔ کیسے بس اسٹاپ پہنچا اور کیسے اپنے گھر آیا تھا۔

☆☆☆

پورا ایک ہفتہ وہ شدید بخار میں مبتلا رہا تھا۔ نقاہت، کمزوری نے میران کو اٹھنے کے لائق بھی نہ چھوڑا تھا۔ کلثوم بیگم نے گھبرا کر عمران کو فون کیا۔ وہ اگلے ہی دن راولپنڈی آگئے تھے۔ میران کا ڈاکٹر سے چیک کروانے کے بعد خرید کر لانے اور پھر خود

pklibrary.com

اپنے ہاتھوں سے زبردستی میران کو کھلانے تک کی ذمہ داری عمران کی تھی۔

"کمال کرتی ہیں خالہ! آپ بھی۔ ایک ہفتہ سے میران بیمار ہے۔ اور آپ مجھے اب فون کر رہی ہیں۔" محبت بھرے لہجے میں کہتے عمران، کلثوم بیگم کو شرمندہ کر گئے تھے۔ جب سے میران نے عروما سے شادی سے انکار کر کے ایمن سے منگنی کی تھی۔ تب سے کلثوم بیگم بہن اور اس کی اولاد سے شرمندہ شرمندہ رہتی تھیں۔

"اس سے پوچھو اسے ہوا کیا ہے۔" دو دن کے بعد جب میران کو ذرا سا ہوش آیا تھا۔ کلثوم بیگم نے عمران سے کہا۔

"ہاں بھئی۔ جلدی سے بتاؤ، کیا ہوا ہے۔ کیوں خالہ کو تنگ کر رہے ہو؟" عمران نے ہلکے پھلکے لہجے میں دریافت کیا۔ میران نے "کچھ نہیں" کہہ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ لیکن وہ کب تک ماں اور خالہ کی فیملی سے یہ سب کچھ چھپا سکتا تھا۔

اگلے ہی ماہ نبیلہ بیگم کے کہنے کے مطابق ان کے بھائی ایمن کی رخصتی کے لیے فیملی کے ساتھ آ چکے تھے کہ جب عمران نے حیرت زدہ ہو کر میران کو کال کر ڈالی تھی۔

"یہ سب کیا ہے میران! ایمن کی منگنی تو....."

"منگنی کا کیا ہے عمران بھائی! وہ تو ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ نکاح تو آج کے ساتھ ایمن کا کب کا ہو چکا ہے۔" وہ آہستگی سے عمران کو بتاتا چلا گیا تھا۔

"کمال کرتے ہو۔ ایک بار مجھ سے بات تو کرتے۔ میں خود ایمن اور خالہ سے بات کرتا۔ جب بات طے تھی۔ رشتہ طے تھا۔ پھر ایسے کیسے وہ ایمن کا نکاح آج کر سکتی ہیں۔"

عمران بھائی غصے سے بولے تو میران نے "چھوڑیں بھائی۔" کہہ کر کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

اور پھر جس دن ایمن کی شادی تھی۔ وہ سوچوں میں گم بائیک پہ چلا جا رہا تھا۔ کہ عقب سے آنے والی گاڑی زوردار طریقے سے اس کی بائیک سے ٹکرائی۔ اور میران بائیک کے ساتھ گھسٹتا سڑک پر دور تک چلا گیا تھا۔ اس کی ٹانگ دو جگہ سے بری طرح فریکچر ہوئی تھی۔ اور وہ اگلے کئی ماہ کے لیے بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

چھ ماہ بعد

ماں کی سوجی آنکھیں دیکھ میران جیسے شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔

"سچ میں امی مجھے نہیں پتا چلا تھا۔ پیچھے سے گاڑی آ رہی ہے۔" اس دن اس نے ماں کے ہاتھوں کو پکڑ کر کہا۔ تو کلثوم بیگم کی سرخ آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئی تھیں۔

"امی۔" میران ماں کو روتا دیکھ کر بے چین ہوا تھا۔

"ایک ہی بیٹے ہو تم میرے میران۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا۔ میں تو جیتے جی ہی مر جاتی۔ دیکھو، میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں تمہاری خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایمن تمہاری خوشی تھی۔ میں نے اور تمہارے ابو نے تمہاری بات مانی تھی۔ آج تم میری بات مان لو۔ خدیجہ اور عامر بھائی اب بھی عروما کے رشتے کے لیے راضی ہیں۔ انکار مت کرنا میران۔ یہ ایک ماں کی التجا ہے تم سے۔" کلثوم بیگم نے روتے ہوئے اپنے دوپٹے کو میران کے سامنے پھیلایا۔ تو میران تڑپ کر رہ گیا تھا۔

"مار لیں امی! لیکن ایسے مت کریں۔ آپ جو چاہتی ہیں۔ جیسے چاہتی ہیں کر لیں۔ ایسے نہیں کریں۔" ماں کی پھیلائی ہوئی جھولی کو سمیٹتے ہوئے میران نے کہا۔ اور روتی ہوئی ماں کو گلے سے لگا لیا۔ کلثوم بیگم اور بھی زیادہ شدت سے رو پڑی تھیں۔

اور یوں دو ماہ کے بعد عروما دلہن بن کر ان کے گھر میں آ گئی تھی۔ عروما نہیں جیسے بھٹکی ہوئی خوشیاں ان کے گھر کا رستہ بھول کر آ گئی تھیں۔ میران ماں کو خوش دیکھتا۔ تو ممنون نظروں سے عروما کو دیکھنے لگتا۔

"میں اچھی ہوں نا۔" عروما معصومیت سے اپنی

آنکھوں کو تھپتھپاتی تو میران اثبات میں سر ہلا کر دھیرے سے مسکرا دیتا تھا۔

☆☆☆

میران کی دکان اچھی خاصی چلنے کیا اب تو دوڑنے لگی تھی۔ اس دن بھی وہ اپنی دکان اور ملازموں کے ساتھ کسٹمرز کے ساتھ بے حد مصروف تھا۔ جب اس کے فون پہ ایک کال آئی۔ نامعلوم نمبر تھا۔ میران نے پھر بھی کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"ہیلو جی کون؟" میران نے مصروف سے لہجے میں پوچھا۔ مگر دوسری سمت چھائی خاموشی نے میران کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"جی کون.....؟" اب کے میران نے قدرے غصے میں کہا۔ تو دوسری طرف سے کسی کے رونے کی آواز ابھری۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں میران اس آواز کو پہچان گیا تھا۔

"ایمن۔" اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

"مجھے معاف کر دو میران! مجھے معاف کر دو۔ آسمان پھاڑنے کی خواہش نے میرے قدموں سے زمین بھی کھینچ لی ہے۔ شجر نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ میرا بچہ نارمل نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ یہ کزن میرج کا نتیجہ ہے۔ شجر کو اولاد چاہیے تھی۔ اس نے مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر لی۔ معذور بیٹے سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ اسی لیے وہ مجھے اور امی کو واپس پاکستان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

امی سے بھائی اور بھتیجے کا رویہ برداشت نہیں ہو سکا۔ فالج ہونے کی وجہ سے وہ خود بستر کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ماموں نے یہ مکان خرید کر میرے نام لگوا دیا ہے۔ شجر سے تو کسی بات کی امید رکھنا ہی فضول ہے۔ کتنا ظالم باپ ہے وہ۔ کہتا ہے اس بچے کو مار دو۔ میں اس کا خرچا نہیں اٹھاؤں گا۔ اب اگر سمیع ایسا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے میران؟"

وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اور اس کا یوں رونا میران کو تکلیف دے رہا تھا۔

"مجھے کہیں نوکری دلوا دو میران! میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کس سے کہوں، کیسے کہوں۔ بس ایک تم ہی وہ کرن ہو۔ جس سے مجھے مدد کی تھوڑی سی امید ہے۔" وہ فریاد کر رہی تھی۔

"دو معذور لوگوں کے ساتھ نوکری کیسے کرو گی ایمن۔" میران کا دل برا ہوا تھا۔

"ضروری ہے میران، نوکری نہیں کروں گی۔ تو یہ لوگ بھوکے مر جائیں گے۔" ایمن بے بسی سے بولی تھی۔

"اچھا، میں کچھ کرتا ہوں۔" میران نے کہہ کو فون بند کیا اور دکان ملازموں کے حوالے کر کے خود چائے کے ڈھابے پر آ بیٹھا۔

کتنی دیر لگی تھی اسے سوچنے میں بس چند منٹ..... اس نے اپنے فون سے پندرہ ہزار کا کیش ایمن کے نمبر پر موجود اکاؤنٹ میں بھیج دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہی ایمن کی کال اس کی سکرین پر جگمگا رہی تھی۔ میران نے کال ریسیو فون کان سے لگا لیا۔

"کچھ مت کہنا۔ جب تک انٹی ٹھیک نہیں ہوتیں۔ ہر ماہ تمہیں پیسے بھیج دیا کروں گا۔ تم اچھے سے ان دونوں کی دیکھ بھال کر لیا کرو۔" میران نے کہا اور ایمن کی کوئی بھی بات سنے بنا فون کاٹ دیا تھا۔

☆☆☆

"کیسے مرد ہو تم۔" یہ جملہ عروما نے تب کہا تھا۔ جب اس نے عروما کو ایمن کے حالات اور اس کی مجبوری کے بارے میں بتایا۔ وہ اس کی شریک سفر تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ بات عروما کو کسی اور سے پتا چلتی۔ میران سے نہیں۔

"غصہ نہیں آیا آپ کو اس پہ..... باتیں سناتے کہ اب کیوں مجھ سے مدد مانگ رہی ہو۔" عروما ناراض ہوئی تھی۔ میران مسکرایا تھا۔

"غصہ تو اپنوں پہ کیا جاتا ہے۔" میران کے کہنے پہ عروما کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھا تھا۔

"اور وہ میری نہیں ہے۔ اسے امید تھی۔ میں اس کی مدد کروں گا اور پتا ہے میں اس لمحے میں سوچ

میں پڑ گیا۔ کیا میران ساجد اس قابل ہے۔ کسی کی امید کو پورا کر سکے۔ بھول گیا۔ میں وہ ایمن تھی۔ اور میں میران۔ بس وہ، وہ تھی۔ اور میں، میں ہوں۔" میران کہہ کر ہنسا تھا اور عروما نے کچھ بھی کہے بنا اپنا سر اس کے کندھے پہ رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

ڈھلتی رات کے ساتھ یادوں کا سفر کرتے میران نے کروٹ بدل کر دوسری جانب سوئی ہوئی عروما کی طرف دیکھا۔ اور لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑے اپنے فون کو اٹھا کر اس نے تاریخ دیکھی۔

کل یکم جون تھی۔ میران نے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایمن کے اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر کیے۔ ہمیشہ کی طرح ایمن کا "تھینک یو" لکھا میسج اس کے فون سکرین پہ جگمگایا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میران نے ہمیشہ کی طرح میسج لکھ کر ایمن کو سینڈ کیا اور اپنا فون واپس رکھ عروما کی طرف دیکھا۔

"عروما۔" اس نے دھیرے سے سوئی عروما کے کندھے کو ہلایا۔

"ہوں۔" گہری نیند سوہوئی عروما نے اپنی آنکھوں کو مشکل سے کھولا۔ اور میران کی طرف دیکھا۔

"تم کہتی ہو نا۔ کہ کیسا مرد ہوں میں۔ جو اتنا کچھ ہونے کے باوجود ایمن سے نفرت نہیں کر پایا۔ مگر یہ بتاؤ، تم کیسی عورت ہو۔ جانتی بھی ہو۔ میں نے محبت ایمن سے کی۔ تمہیں ریجیکٹ کر کے منگنی اس سے کی۔ اس کے ٹھکرانے پہ تم سے شادی کی۔ تم کیسی عورت ہو۔ جو پھر بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اور کرتی چلی جا رہی ہو۔"

میران سوال کے سوال پہ مندی مندی آنکھیں پوری کی پوری کھل چکی تھیں۔ عروما اٹھ کر بیٹھی اور خشمگیں نظروں سے میران کو دیکھنے لگی۔

"میں تو ایسی ہی عورت ہوں، تم کیسے مرد ہو۔" عروما نے ناک چڑھا کر کہا۔

"ایسا ہی ہوں۔" میران نے اس کی ناک کھینچی۔

"تو پھر میں بھی ایسی ہی ہوں۔ محبت کرتی ہوں۔ تو بس کرتی ہوں۔ آپ نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ مجھے اس کا نہیں پتا۔ مجھے تو یہ پتا ہے۔ آپ کی ساری محبت نہ سہی، ساری وفاداری میرے ساتھ ہے۔ اس سے زیادہ عروما کو کچھ نہیں چاہیے۔" اس کے لہجے میں محبت تھی۔

"اور مجھے عروما کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔" میران نے مان بھرے لہجے میں کہا۔ اور عروما کو کھینچ کر اپنے چوڑے سینے میں چھپا لیا۔

"کیسے مرد ہیں آپ۔" عروما نے اسے چھیڑا۔

"کیسی عورت ہو تم....." میران نے عروما کو چھیڑا۔ اور پھر وہ دونوں ہنستے چلے گئے تھے۔

محبت کی دیوی نے تفاخر سے ان دونوں کی طرف دیکھنے کے بعد تاسف بھری نظروں سے دور بیٹھی ایمن کی طرف دیکھا۔ جو لاج میں آ کر اپنا نقصان کر بیٹھی تھی۔ اور اب فون ہاتھ میں پکڑے میران کے ایک میسج "اس کی ضرورت نہیں۔" کو پچھلے کئی منٹوں سے پڑھے جا رہی تھی۔ اور پھر ایمن نے اپنے اندر سے بلند ہوتی سسکیوں کا گلا دبانے کے لیے زور سے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھا اور پھر رونی چلی گئی تھی۔

"میران! تم جیسا کوئی نہیں۔ ایمن کو تم جیسا کوئی نہیں مل سکتا۔ میں کیسی بدقسمت ہوں۔ میں نے خود تمہیں خود سے دور کر دیا۔ بہت دور....."

وہ رو رہی تھی۔ اور اب اس کے پاس سوائے رونے کے بچا ہی کیا تھا۔ پچھتاوا، آنسو بس یہی ایمن کا مقدر ٹھہرے تھے اور اسے ان ہی کے سہارے جینا تھا۔

☆☆

وہ بے وفا ہے تو کیا، مت کہو بُرا اس کو
کہ جو ہوا سو ہوا، خوش رکھے خدا اس کو

نظر نہ آئے تو اس کی تلاش میں رہنا
کہیں ملے تو پلٹ کر نہ دیکھنا اس کو

وہ سادہ خو تھا، زمانے کے خم سمجھتا کیا
ہوا کے ساتھ چلا لے اُڑی ہوا اس کو

وہ اپنے بارے میں کتنا ہے خوش گماں دیکھو
جب اس کو میں بھی نہ دیکھوں تو دیکھتا اس کو

ابھی سے جانا بھی کیا اس کی کم خیالی پر
ابھی تو اور بہت ہوگا سوچنا اس کو

اسے یہ دُھن کہ مجھے کم سے کم اُداس رکھے
مری دُعا کہ خدا دے یہ حوصلہ اس کو

غزل میں تذکرہ اس کا نہ کر نصیرؔ کہ اب
بھلا چکا وہ تجھے تُو بھی بھول جا اس کو

نصیرؔ ترابی

ان کے انداز کرم، ان پہ وہ آنا دل کا
ہائے وہ وقت، وہ باتیں، وہ زمانہ دل کا

نہ سُنا اس نے توجہ سے افسانہ دل کا
عمر گزری ہے مگر درد نہ جانا دل کا

کچھ نئی بات نہیں حُسن پہ آنا دل کا
مشغلہ ہے یہ نہایت ہی پُرانا دل کا

وہ محبت کی شروعات، وہ بے تحاشا خوشی
دیکھ کر ان کو وہ بھولے نہ سمانا دل کا

دل لگی دل کی لگی بن کے مٹا دیتی ہے
روگ دُشمن کو بھی یارب! نہ لگانا دل کا

میرے پہلو میں نہیں، آپ کی مٹھی میں نہیں
بے ٹھکانے ہے بہت دن سے ٹھکانا دل کا

وہ بھی اپنے نہ ہوئے، دل بھی گیا ہاتھوں سے
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا دل کا

نقش بر آب نہیں، وہم نہیں خواب نہیں
آپ کیوں کھیل سمجھتے ہیں مٹانا دل کا

ان کی محفل میں نصیرؔ! ان کے تبسم کی قسم
دیکھتے رہ گئے ہم، ہاتھ سے جانا دل کا

پیر سید نصیر الدین نصیرؔ

pklibrary.com

ادگارڈ

اِس ماہ کی ہٹ سمائلز

چھکا

میچ کے دوران بلے باز نے زوردار چھکا لگایا۔ گیند اسی پویلین میں جا کر گری، جہاں اس کی ساس اور بیوی بیٹھی میچ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

میچ کے اختتام پر کھلاڑی کی بیگم نے بڑے ناز سے کہا۔

''ڈارلنگ! تم نے یقیناً وہ چھکا مجھے دیکھتے ہی لگایا تھا ناں۔ لیکن اگر ذرا سا فاصلہ کم ہوتا تو ممی کا تو سر ہی پھوٹ جاتا۔''

''بس ڈارلنگ! نشانہ چوک گیا تھا۔''

کھلاڑی نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

باری

ایک قصاب کا انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوہ میت کے سرہانے کھڑی ہو کر رو رو کر بین کرتے کہنے لگی۔

''ہائے تیرا ٹوکا کون لے گا؟ تیری چھری کون لے گا؟ تیری دکان کون لے گا؟ تیرے جانور کون لے گا؟''

اس کی ہر بات کے جواب میں ایک ہی آدمی کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔

''میں لوں گا۔ میں لوں گا۔''

''ہائے شیرو! تیرا قرضہ کون ادا کرے گا؟''

بیوہ نے بین کرتے اس آدمی کی جانب دیکھتے پوچھا۔ وہ آدمی دوسرے لوگوں کی جانب دیکھ کر کہنے لگا۔

''بولو بھائی، اب آپ بھی تو کوئی بولو۔ اب کس کی باری ہے۔''

جادو

ایک خوب صورت سیاحتی علاقے میں ایک نوبیاہتا جوڑا ہنی مون کی غرض سے آیا۔ ان کے پاس ایک مفلوک الحال شخص دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا۔

''جناب! آپ یہاں نئے آئے ہیں، شاید اسی لیے مجھ جیسے بڑے جادوگر سے واقف نہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم کس قسم کا جادو کر سکتے ہو۔''

شوہر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں اپنے جادو کے زور سے آپ کو بتا سکتا ہوں کہ آپ کی شادی پسند کی تھی یا ارینج۔''

''ارے واہ...... لیکن یہ تو بہت آسان ہے۔''

شوہر نے جواب دیا۔

''میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ کی شادی میں کتنے لوگ شریک ہوئے۔ کتنے کھانے پکے، کتنے لوگ ناراض ہوئے۔'' وہ کہتا گیا لیکن شوہر ذرا متاثر نہ ہوا۔

''میرا خیال ہے کہ اسے کچھ دے دلا کر رخصت کریں۔''

بیوی نے اپنے شوہر سے دبے لفظوں میں کہا۔

''ایسے کیسے دے دوں۔ ایسے گپیوں کو میں خوب جانتا ہوں۔''

شوہر نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آج سے پانچ سال پہلے آپ کی دلہن کی عمر کتنی تھی۔''

اس بات پر شوہر ذرا ٹھٹکا۔

''پانچ سال پہلے کی عمر کیوں بتاؤ گے؟''

''میں نے کہا تھا ناں، اسے کچھ دے دلا کر رخصت کریں۔''

بیوی نے اپنے پرس سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور چڑ کر بولی پھر اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ آگے کی جانب چلی۔

"میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ میڈم سے پہلے صاحب کی کتنی گرلز فرینڈز تھیں۔"

شوہر نے بیوی سے ہاتھ چھڑایا اور غصے سے تنتناتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

"یہ بتا تیرا مسئلہ کیا ہے۔" اتنے میں ایک صاحب تیزی سے ان کی جانب بڑھے اور کہنے لگے۔

"یہ ہی اس کا جادو ہے یہ یہاں آنے والے بارہ جوڑوں کی طلاق کرا چکا ہے۔"

آزمودہ نسخہ

ایک تن وتوش والے صاحب، مسکراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے اپنا حال کہنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں دبلا ہونا چاہتا ہوں ہر طریقہ آزما چکا ہوں لیکن کوئی کارگر نہ ثابت ہوا۔ آپ ہی کوئی اچھا سا نسخہ بتائیے۔"

ڈاکٹر صاحب سوچتے رہے پھر بولے۔

"آپ کی جاب کیسی ہے؟"

"میری بہت اچھی جاب ہے اور میں بہت خوش ہوں اپنی جاب سے۔" صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں۔ اچھا کیا آپ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں؟"

ڈاکٹر کے اس سوال پر وہ ذرا جز بز ہوئے پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

"ارے جناب! ہمارا اپنا گھر ہے بلکہ ہم نے اوپر والا فلور کرائے پر چڑھا رکھا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟"

وہ صاحب ذرا مسکرائے۔ اور شرماتے ہوئے کہنے لگے۔

"جی..... ابھی نہیں....."

"اوہ اب آپ کا علاج سمجھ میں آیا۔ آپ فوراً شادی کرلیں۔" صاحب نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"شادی....."

"آپ کی صحت کا راز آپ کی مسکراہٹوں میں ہے ایسی صورت میں شادی ہی کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! کوئی نسخہ لکھ دیتے....."

صاحب ذرا منمناتے ہوئے بولے۔ ڈاکٹر صاحب نے جھٹ نسخہ لکھ دیا۔

"پر ڈاکٹر صاحب! یہ تو کسی کا فون نمبر ہے۔"

"جی یہ میری ساس کا نمبر ہے۔ دراصل میری ایک چھوٹی سالی ابھی غیر شادی شدہ ہے۔ آزمودہ نسخہ ہے۔ پہلے میری بھی حالت کچھ آپ جیسی ہی تھی پر ان کی بیٹی سے شادی کر کے اب آپ کے سامنے ہوں۔ ویسے یہ نسخہ میرے سسر کا بھی آزمودہ رہا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑے سکون سے بتایا۔ صاحب نے ڈاکٹر کے اسمارٹ سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تو اب آپ کے سسر کہاں ہیں؟"

"قبرستان، دراصل انہیں پہلے علم نہ تھا اس لیے ہائی ڈوز برداشت نہ کر سکے تھے اور جوانی میں ہی کوچ کر گئے تھے۔"

خودکشی

پٹھان خودکشی پر تقریر کر رہا تھا۔

"خودکشی حرام ہے ظلم ہے، گناہ ہے، بزدلی ہے، پاگل پن ہے ایسی حرام موت مرنے سے بہتر ہے انسان اپنے آپ کو گولی مار لے۔"

☆☆

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"آپس میں گالی دینے والے دو شخص جو کچھ ایک دوسرے کو کہیں گے، اس کا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا۔ یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کا ارتکاب کرے۔" (مسلم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
"نعمت ملتے پر فوراً اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ شکر ادا کرنے سے نعمت اور بڑھتی ہے شکر اور نعمت کا بڑھنا ایک ہی رسی سے بندھے ہوئے ہیں، جب بندہ شکر ادا کرنا چھوڑ دے گا تب اللہ کی طرف سے نعمت کا بڑھنا بند ہوگا۔"

دل سے دل کو راہ

حضرت مجاہد رحمتہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:
"یہ آدمی مجھ سے محبت کرتا ہے۔"
لوگوں نے پوچھا "اے ابن عباس آپ کو کیسے پتا چلا؟"
انہوں نے کہا، "اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"
(دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اگر تمہیں کسی سے محبت ہے تو سمجھ لو کہ اسے بھی تم سے محبت ہے)

صلہ رحمی اور قطع رحمی

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ابوایوب سلیمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔
ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ شب جمعہ میں جمعرات کی شام کو ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا:
"ہماری اس مجلس میں جو بھی قطع رحمی کرنے والا بیٹھا ہوا ہے میں اسے پوری تاکید سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا جائے۔"
اس پر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات تین دفعہ کہی تو اس پر ایک جوان اپنی پھوپھی کے پاس گیا جس سے اس نے دو سال سے تعلقات ختم کر رکھے تھے اور اسے چھوڑا ہوا تھا۔
وہ جب اپنی پھوپھی کے پاس پہنچا تو پھوپھی نے اس سے پوچھا "میاں تم کیسے آ گئے؟"
اس نے کہا "میں نے ابھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایسے اور ایسے فرماتے ہوئے سنا ہے۔"
(اس وجہ سے آیا ہوں)
پھوپھی نے کہا "ان کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ انہوں نے ایسے کیوں فرمایا ہے؟"
اس نوجوان نے واپس جا کر ان سے پوچھا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شب جمعہ میں ہر جمعرات کی شام بنی آدم کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں (اور انسانوں کے اعمال تو قبول ہو جاتے ہیں لیکن) قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔" (اخرجہ البخاری فی الادب)

شارٹ کٹس نہ ڈھونڈیں

ایک شخص کیڑے مکوڑوں سے بھرا ڈبا لیے جنگل سے گزر رہا تھا۔ ایک پرندے نے اس سے پوچھا، "تم کہاں جا رہے ہو؟"
اس نے کہا "میں منڈی جا رہا ہوں، یہ کیڑے مکوڑے اسے دے کر پرندوں کے پر لے کر آؤں گا۔"
پرندے نے کہا "تم مجھ سے پر لے لو اور کیڑے

pklibrary.com

مجھے دے دو اس شخص نے کیڑے پرندے کو دے دیے اور پرندے نے اسے ایک پر دے دیا۔ اگلے دن بھی ایسا ہی ہوا اور اس سے اگلے دن بھی..... آخر ایک دن ایسا آیا کہ پرندے کے پاس کوئی پر نہ رہا۔ اب وہ کیڑے ڈھونڈنے کے لیے اڑ بھی نہیں سکتا تھا، وہ بدصورت بھی نظر آنے لگا تھا۔ جلد ہی وہ مر گیا۔

اس کہانی کا سبق بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ پرندے نے خوراک حاصل کرنے کے لیے جو شارٹ کٹ اپنایا تھا۔ وہ بظاہر آسان مگر سب سے مشکل طریقہ تھا۔

علاج

عالمی شہرت یافتہ نفسیات دان ڈاکٹر کارل میننگر نے ایک مرتبہ کہا

"اگر تمہیں علم ہو کہ کسی شخص کا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے تو تم اسے کیا نصیحت کرو گے؟"

سامعین کو توقع تھی کہ ڈاکٹر کارل کہے گا کہ اسے کسی نفسیاتی معالج کے پاس جانا چاہیے لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے کہا

"میں اس شخص کو نصیحت کروں گا کہ وہ شہر کی دوسری جانب جائے، کسی ضرورت مند کو ڈھونڈے اور اس کی مدد کرے۔ ایسا کرنے سے اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

اس میں سبق یہ ہے کہ "ہم دوسروں کی مدد کریں گے تو ہم میں طمانیت کا احساس پیدا ہوگا۔ صلہ کی توقع کے بغیر دینے سے انسان کی عزت نفس بڑھ جاتی ہے۔"

ہم کیسے دیکھتے ہیں

ہم چیزوں کو ویسے نہیں دیکھتے جیسی وہ ہوتی ہیں بلکہ ویسے دیکھتے ہیں، جیسے ہم ہوتے ہیں۔

ایک دانا انسان اپنی بستی کے باہر بیٹھا تھا۔ ایک مسافر وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ مسافر نے اس سے پوچھا۔

"میں اپنی بستی چھوڑ کر اس بستی میں آباد ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ یہاں کس قسم کے لوگ بستے ہیں؟"

دانا آدمی نے پوچھا۔ "تمہاری بستی میں کیسے لوگ بستے ہیں؟"

مسافر نے کہا، "وہ کمینے، ظالم اور بدتہذیب ہیں۔"

دانا انسان نے کہا، "اس بستی میں بھی ایسے ہی لوگ بستے ہیں۔"

وہ مسافر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور مسافر آیا اور اس نے بھی دانا انسان سے یہی پوچھا، "اس بستی میں کیسے لوگ بستے ہیں؟"

دانا انسان نے اس سے بھی وہی سوال پوچھا، "تمہاری بستی میں کیسے انسان بستے ہیں؟"

اس نے کہا، "میری بستی کے لوگ مہربان، مہذب، نرم خو اور اچھے ہیں۔"

دانا انسان نے کہا، "تمہیں یہاں بھی ایسے ہی لوگ ملیں گے۔"

حسد

صنوبر کے درخت بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ یہ سدا بہار ہوتے ہیں۔

دو سو سال تک ان کی عمر ہوتی ہے۔ آپ کسی جوان صنوبر کے درخت کے نیچے ستانے بیٹھ جائیں تو یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے نیچے آپ کے پردادا بھی بیٹھے ہوں گے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ طویل العمر اور بلند قامت والے درخت ایک چھوٹے سے کیڑے سے جسے ہم عام آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ برباد ہو جاتے ہیں۔

یہ کیڑا جسے پنواڈ نیمیٹو کہتے ہیں، تنے سے شروعات کرتا ہے اور شاخوں پتوں سب کو اندر سے کھا جاتا ہے۔ یہ درخت میں پانی پہنچانے والی رگوں کو ہی کھا جاتا ہے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ہفتوں

میں سرسبز درخت سوکھ جاتا ہے۔

حسد بھی ایک ایسا ہی کیڑا ہے جو انسان کو کھا جاتا ہے۔ شروع میں ہم اسے سمجھ ہی نہیں پاتے۔ یہ بتدریج ہم میں سما جاتا ہے اور ہم ہر ایک سے حسد شروع کر دیتے ہیں۔

صنوبر کے درختوں کے بچاؤ کے لیے اب تک تحقیقات چل رہی ہیں۔ لیکن ہم حسد کے کیڑے کو مار سکتے ہیں۔ اللہ کی تقسیم کے عمل کو سمجھ لیں اور احساس کمتری چھوڑ دیں۔ حسد خود ہی مر جائے گا۔

مہمان داری کی فضیلت

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

''میں اپنے ساتھیوں کو ایک صاع (ڈھائی کلو) کھانے پر جمع کرلوں، یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں بازار جاؤں اور ایک غلام خرید کر آزاد کر دوں۔

(حالانکہ ایک غلام کی قیمت ایک صاع کھانے سے بہت زیادہ ہے)

کیڑے

جھوٹ غیبت اور ناشکری ایسے کیڑے ہیں جو رزق کی کشادگی اور گھر کی خوش حالی کو آہستہ آہستہ کھا جاتے ہیں۔

بدترین انسان

حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا۔

''بدترین انسان کون سا ہے؟''

انہوں نے فرمایا۔ ''جو اس کی پروا نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔''

(اس میں مصلحت یہ ہے جو برائی کو کھلم کھلا ڈھٹائی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ برائی پھیلانے کا موجب بنتا ہے۔ اسی لیے اس کو بدترین انسان کہا گیا ہے۔)

رحمت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بیمار کو دیکھ کر خداوند بزرگ و برتر کے حضور میں عرض کیا۔

''یا الٰہی اس پر رحمت فرما۔''

باری تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہوا۔

''اور دوسری رحمت کون سی ہوگی کہ میں اس بیماری سے اس پر رحم ہی کرنا چاہتا ہوں۔''

(یعنی اس بیماری اور مرض کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنانا چاہتا ہوں اور پھر اس کے درجے کو بلند کر دوں گا۔)

بندہ مومن

بندہ مومن کو چالیس دن میں ان چار آفتوں سے خالی نہیں ہونا چاہیے (کوئی نہ کوئی آفت سے دوچار رہنا چاہیے) اور وہ یہ ہیں۔ رنج، بیماری، ڈر اور نقصان)

چھوٹی سی بات

☆ ایک چھوٹی سی نیکی بہت بڑے ارادے سے بہتر ہوتی ہے۔

☆ دوسروں کا گلا کاٹنا بہت آسان ہے لیکن اپنی انگلی کاٹنا بہت مشکل ہے۔

کامیابی

☆ اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا چاہیے۔

☆ میں نے شجر علم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر لکھا ہے کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔

☆ شکست نہ کھانے والا ارادہ، پریشان نہ کرتے والا خیال اور ختم نہ ہونے والی جدوجہد کامیابی کی ضامن ہیں۔

دو چیزیں

دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں دوسروں کو دینے سے کسی کا کچھ نہیں جاتا۔

1۔ دعا

2۔ مسکراہٹ

pklibrary.com

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

زرینہ خانم لغاری ـــــــــــ مظفر گڑھ

جدائی زندگانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے
یہ اک ایسی کہانی ہے نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

زمل مزمل ـــــــــــ گجر خان

دُور تک ساتھ دیا کرتی ہیں آنکھیں ان کا
تُو نے دیکھے نہیں کبھی گاؤں سے جاتے ہوئے لوگ

ارم کمال ـــــــــــ فیصل آباد

ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے
تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

ناہید اسماعیل ـــــــــــ کراچی

امجدؔ وہ سانحہ تو اسے یاد بھی نہیں
جو ہم نے عمر بھر کی نشانی بنا لیا

ایچ ایس ایچ ـــــــــــ تحصیل سمٹریال

واسطہ حسن سے کیا، شدتِ جذبات سے کیا
عشق کو تیرے قبیلے یا تیری ذات سے کیا
مری مصروف طبیعت بھی کہاں روک سکی
وہ تو یاد آتا ہے اس کو مرے دن رات سے کیا

عدینہ لغاری ـــــــــــ چمبڑ

چاہیے کیا تمہیں تحفے میں بتا دو ورنہ
ہم تو بازار کے بازار اٹھا لائیں گے
یوں محبت سے نہ ہم خانہ بدوشوں کو بلا
اتنے سادہ ہیں کہ گھر بار اٹھا لائیں گے

نورین فاطمہ ـــــــــــ سرگودھا

تیری تلاش میں عالم عجب نشاط کا تھا
جو تو ملا تو تیرے ہجر کے ملال میں ہوں
سدا کی طرح تیری آرزو کمال یہ ہے
یہ اور بات کہ میں عمر کے زوال میں ہوں

سحر سہیل ـــــــــــ کراچی

ہے سنانا نہیں بے کار کسی اور کا دُکھ
جن کو ہوتا ہی نہیں یار کسی اور کا دُکھ
روز کرتا ہوں تیرے دُکھ کی تلافی ایسے
بانٹ لیتا ہوں مرے یار کسی اور کا دکھ

روحیلہ خان ـــــــــــ کراچی

قفس کے ہو لیے ہم تو مگر اے اہلِ گلشن تم
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

نورین فاطمہ ـــــــــــ سرگودھا

گو بہت بدنام تھا، کہنے کو وہ بھی کام تھا
آئینوں کے شہر میں جو دیدہ ور کرتے رہے

ثمرہ، اقرا ـــــــــــ کراچی

اس کو بھی تیرے کوچے میں گزار آئے ہیں
زندگی میں وہ جو لمحہ تھا سنورنے والا
اس کا اندازِ سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ مکرنے والا

طوبیٰ، نادیہ ـــــــــــ فیصل آباد

جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا
جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا
غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں
میں دل کو اس مقام پر لاتا چلا گیا

عائشہ ـــــــــــ گوجرہ

جانتا ہوں ایک شخص کو میں بھی منیرؔ
غم سے پتھر ہو گیا، لیکن کبھی رویا نہیں

تحریم ـــــــــــ محراب پور

مجھے تھا زعم مگر پھر بھی بکھر گیا محسنؔ
وہ ریزہ ریزہ تھا مگر اپنے اختیار میں تھا

pklibrary.com

امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

حضرت عیسیٰ کے حواری کی غدار بیوی

حضرت عیسیٰ کے عہد نبوت میں "شمشون اسرائیل" نامی ایک شخص تھے، جو روم کے کسی شہر کے تھے اور بوجہ رشد وہدایت کے جو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا ہوئی، وہ حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں میں سے ہو گئے تھے، شمشون کے خاندان کے لوگ بت پرست تھے اور شہر میں رہتے تھے۔ انہوں نے بستی سے دور ایک مکان میں سکونت اختیار کر لی اور موقع بہ موقع آپ شہر والوں سے جہاد کر کے ان کو قید کر لیتے اور مال غنیمت حاصل کرتے۔ بعض اوقات آپ بغیر کچھ کھائے پیے کئی کئی دن قتال کرتے اور جب بھی آپ کو پیاس لگتی تو آپ کے لیے پتھروں سے پانی نکلنے لگتا اور آپ خوب سیر ہو کر پی لیتے۔ رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کو قوت بطش (گرفت) اعلا پانے پر عطا ہوئی تھی۔ اس لیے اہل شہر ان سے پریشان تھے اور ان کا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن آپس میں مشورہ کیا کہ ان سے کس طرح نپٹا جائے۔ اہل مشورہ میں سے کسی نے کہا۔

"کہ جب تک ان کی اہلیہ سے ساز باز نہیں کریں گے تب تک ان پر قابو پانا مشکل ہے۔"

چنانچہ ان لوگوں میں سے کچھ حضرت شمشون کی بیوی کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ "اگر تم اپنے شوہر کے خلاف ہمارا ساتھ دو گی تو ہم تم کو اتنا مال انعام میں دیں گے۔"

چنانچہ یہ عورت مال کی طمع میں اپنے شوہر سے غداری کرنے پر رضامند ہو گئی اور ان سے وعدہ کر لیا کہ میں ضرور تمہاری مدد کروں گی۔ ان لوگوں نے عورت کو خوب مضبوط رسیاں دے دیں اور کہا کہ جب شمشون سو جائیں تو یہ رسیاں آپ کے پاؤں میں ڈال کر گردن سے جکڑ دینا۔ اس طرح وہ عورت کو خوب سمجھا کر واپس چلے گئے۔

"رات کو جب حضرت شمشون گھر تشریف لائے، سونے کے لیے لیٹ گئے اور خوب غافل ہو گئے تو عورت نے آپ کے شانوں میں رسیاں ڈال کر آپ کے ہاتھ گردن سے جکڑ کر خوب مضبوط باندھ دیے اور صبح کے انتظار میں لیٹ گئی۔ لیکن جب آپ نیند سے بیدار ہوئے اور آپ نے ہاتھ پھیلائے تو رسیاں ٹوٹ گئیں، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بیوی سے پوچھا۔

"کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟"

مکار بیوی نے جواب دیا "یہ میں نے آپ کی قوت آزمانے کے لیے کیا تھا کہ دیکھوں آپ کتنے طاقتور ہیں۔"

اس کے بعد اس عورت نے خفیہ طور پر شہر والوں کو کہلا بھیجا "میں نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا تھا، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیونکہ وہ بھی ان کی طاقت کے سامنے موم بن گئیں۔"

یہ سن کر شہر والوں نے اس کے پاس لوہے کا

pklibrary.com

طوق اور زنجیر بھجوادی اور کہا ''کہ جب وہ سو جائیں تو یہ ان کی گردن میں ڈال دینا۔

چنانچہ رات کو عورت نے ایسا ہی کیا، مگر جب حضرت شمشون بیدار ہوئے تو یہ طوق اور زنجیر بھی آپ کے گلے سے ٹوٹ کر نکل گئیں۔

آپ نے عورت سے پھر وہی سوال کیا تو اس نے پھر وہی جواب دیا اور کہنے لگی۔

''کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس سے تم مغلوب ہو جاؤ۔''

''آپ نے فرمایا'' صرف خدا تعالیٰ مجھ کو مغلوب کر سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو ایک اور چیز بھی مجھے مغلوب کر سکتی ہے۔''

عورت نے پوچھا کہ ''وہ کیا چیز ہے؟''

آپ نے فرمایا ''وہ چیز میں تجھ کو نہیں بتلا سکتا۔'' لیکن یہ مکار اور غدار عورت ان کو بہکاتی اور پھسلاتی رہی اور وہ ترکیب معلوم کرتی رہی، اصرار کرتی رہی۔

حضرت شمشون کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ

''میری والدہ میرے لیے ایک بہت ڈر کی چیز چھوڑ گئی ہیں اور وہ میرے یہ سر کے بال ہیں، اگر کوئی مجھے ان سے باندھ دے گا تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ کیونکہ ان پر میرا بس نہیں چلتا۔''

عورت یہ معلوم کر کے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی اور جب رات کو آپ سو گئے تو اس نے چپکے سے اٹھ کر آپ کے بالوں سے آپ کو باندھ دیا اور شہر والوں کو اطلاع دے دی۔ چنانچہ شہر والے آئے اور حضرت شمشون کو پکڑ کر لے گئے اور آپ کے کان و ناک کاٹ دیے، آنکھیں نکال کر شہر کے وسط میں لوگوں کے تماشا کے لیے کھڑا کر دیا۔ اس شہر میں جگہ جگہ ستون کھڑے تھے، جن پر بیٹھ کر لوگ ان کا تماشا بنا رہے تھے۔ بادشاہ بھی تماشا دیکھنے کے لیے محل سے نکلا اور ایک مینارہ پر شہر کے دیگر عمائدین شہر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چنانچہ جب آپ کا مثلہ کیا جانے لگا تو آپ نے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی کہ

''الٰہی! تو مجھ کو ان پر مسلط فرما دے۔''

رب تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی اور پھر صحیح وسالم فرما کر حکم دیا کہ شہر کا وہ مینارہ جس پر بادشاہ و دیگر لوگ بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں، اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، جس سے وہ سب لوگ ہلاک ہو گئے اور آپ کی غدار بیوی پر خدا تعالیٰ نے بجلی گرادی، جس سے وہ بدبخت جل کر خاکستر ہو گئی۔

پہاڑ ہل گیا

جعفر صادق محمد الیافر سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک دین دار شخص تھا جس کا معاملہ اللہ کے ساتھ اچھا تھا اور اس کی ایک عورت تھی جو نہایت خوب صورت تھی، وہ دین دار شخص باہر جاتا تو گھر کا دروازہ باہر سے مقفل کر کے جاتا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کسی جوان مرد سے اس کی بیوی کی آنکھ لڑ گئی، وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے مگر باہمی معاملات کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی، عورت نے کسی ذریعے سے باہر کے تالے کی ایک کنجی بنوالی اور اس نوجوان کو بھجوادی۔

اس نوجوان کا اس عورت کے پاس اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ رات اور دن میں جب بھی اس کو موقع ملتا وہ دروازے کا تالا کھول کر اس کے پاس آجاتا۔ عورت کے شوہر کو اس آمد و رفت کی عرصہ دراز تک خبر نہ ہوئی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کا شوہر چونکہ ایک عابد و زاہد شخص تھا تو اس کو خود بخود یہ احساس ہوا کہ اس کی عورت اس سے کچھ کنارہ کشی اختیار کرنے لگی ہے، چنانچہ اس نے اس خدشہ سے عورت کو مطلع کر دیا اور کہا۔

''مجھے اسی وقت اطمینان ہو سکتا ہے جبکہ تو اپنی

عفت وعصمت پر حلف اٹھالے گی۔ عورت اس پر راضی ہوگئی اور کہنے لگی۔

''جب آپ کا جی چاہے مجھ سے حلف لے لیجیے۔''

جس شہر کا یہ واقعہ ہے وہاں ایک پہاڑ تھا اور اس کے قریب ایک نہر بہتی تھی، وہاں جا کر بنی اسرائیل قسم اور حلف اٹھایا کرتے تھے اور جو شخص وہاں پر جھوٹی قسم یا حلف اٹھاتا فوراً ہلاک ہوجاتا۔

میاں بیوی کے درمیان حلف کی بات چیت کے بعد اس کا آشنا اس کے پاس آیا تو اس نے اس سے اپنے شوہر کی بدگمانی اور پہاڑ پر چل کر قسم کھانے کا قصہ سنایا۔ یہ سن کر وہ نوجوان پریشان ہوگیا کہ اب کیا، کیا جائے۔

عورت نے اس کو تسلی دی اور کہا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایسی ترکیب کروں گی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ فلاں دن فلاں وقت میں اپنے شوہر کے ساتھ قسم کھانے کے لیے اس پہاڑ پر جاؤں گی۔ لہٰذا تم بھیس بدل کر اور سواری کا ایک گدھا لے کر شہر کے باہر پھاٹک پر کھڑے ہوجانا اور جب تم ہم دونوں میاں بیوی کو آتا دیکھو تو گدھے کو لے کر ہمارے قریب آجانا۔ میں تمہارے گدھے پر پہاڑ تک جانے کے لیے سوار ہوں گی تو جلدی سے مجھے اٹھا کر گدھے پر سوار کرا دینا۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے؟''

چنانچہ جب حلف اٹھانے کا دن آیا تو اس دین دار شوہر نے اپنی بیوی سے کہا۔

''چلو اس پہاڑ پر چلیں، تاکہ تم وعدے کے مطابق حلف اٹھا کر مجھے مطمئن کرسکو۔''

یہ سن کر وہ جلدی سے کپڑے بدلے بغیر چلنے کے لیے تیار ہوگئی اور کہنے لگی۔ میں پیدل پہاڑ پر نہیں جاسکتی۔

شوہر نے کہا ''چلو شہر کے پھاٹک پر کوئی گدھے والا کھڑا ہوگا۔ اس کا گدھا کرایہ پر لے لیں گے۔''

چنانچہ دونوں گھر سے پیدل چل دیے۔ جب شہر کے دروازے پر پہنچے تو عورت کا آشنا گدھا لیے ہوئے وہاں موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی عورت نے آواز دی۔ ''او گدھے والے ہم تجھ کو نصف درہم دیں گے، کیا تو ہمیں اس پہاڑ تک پہنچا دے گا۔'' وہ بولا ''جی ہاں پہنچا دوں گا۔'' اور جلدی سے گدھا لے کر آیا اور عورت کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر گدھے پر بٹھا دیا اور روانہ ہوگئے۔

آگے آگے گدھا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے عورت کا شوہر اور وہ بہروپیا گدھے والا چل رہا تھا۔ جب پہاڑ آگیا اور گدھے سے اترنے کا وقت آیا تو عورت نے اس بہروپیے کو آواز دی کہ گدھا پکڑ اور مجھ کو اتار دے'' وہ آنے بھی نہ پایا تھا کہ عورت خود بخود گدھے سے گر پڑی اور اس طرح گری کہ اس کا ستر بہروپیے کے سامنے کھل گیا۔

عورت اس کو بناوٹی گالیاں دینے لگی تو یہ بہروپیا بولا کہ ''بیگم صاحبہ میرا اس میں قصور نہیں ہے'' اور اس کو پکڑ کر زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

اس کے بعد وہ پہاڑ پر چڑھے اور جب اس جگہ پر پہنچے جہاں قسم کھائی جاتی تھی تو عورت نے اپنے ہاتھ سے پہاڑ کو پکڑ لیا اور شوہر کی طرف مخاطب ہوکر قسم کھا کر کہنے لگی۔

''جب سے تمہارا اور میرا ساتھ ہوا ہے، تب سے آج تک مجھے سوائے آپ کے اور اس گدھے والے کے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ دیکھا ہے۔'' چونکہ یہ قسم ظاہر میں سچی تھی کیونکہ سوائے اس کے شوہر اور اس بہروپیے کے کسی تیسرے شخص نے نہ اس کو چھوا تھا، اس لیے وہ پہاڑ زور، زور سے ہلنے لگا اور زمین میں دھنس گیا اور بنی اسرائیل اس کو بھول گئے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے، ترجمہ ''اگرچہ ان کفار و مشرکین کی سازشیں ایسی تھیں، جن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائے۔'' (حوالہ بالا)

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

صحرا ظفر .... کالیس گجراں

س ''شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟''

ج ''میں اپنے بچپن سے ہی بہت ذہین تھی، تو یہ بات میری پوری فیملی میں پتا چل گئی تھی کہ صحرا ایکسٹرا اور اوڈ نیری صلاحیتوں کی مالک ہے تو ایک دن میں اپنی پھپھو کے گھر گئی تب میں دوسری جماعت میں تھی تو، ان کے گھر کوئی مہمان لڑکی آئی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ میں شعاع تھا۔ اس نے میرے ٹیسٹ کے لیے املا پوچھنی شروع کر دی۔ میں اس کو فر فر بتاتی گئی وہ کہتی تمہیں کیا انعام دوں۔ میں نے کہا یہ کتاب تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا یہ تمہاری سمجھ کی نہیں ہے کچھ اور ہو، میں نے کہا نہیں اور کچھ نہیں، بہر حال وہ جب واپس گئیں تو مجھے ایک شعاع دے گئیں (ان کے پاس ڈھیر تھا) اب سوچتی ہوں وہ ایک شعاع نہیں حقیقتاً زندگی گزارنے کا ہنر دے گئیں۔ پچھلے سات سال سے اب میں شعاع کی مستقل اور خاموش قاری ہوں۔''

س ''دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟''

ج ''الحمد اللہ صبح کی نماز سے دن کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ عادت ہے جو ہم تینوں بہن بھائیوں کی رگ رگ میں ہے۔ جو کہ ہمارے ابوجی (دادا جی) نے ڈالی ہے۔ میرے دونوں بھائی ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں۔ کاش نے میں بھی حفظ کیا ہوتا۔ ناشتے میں، میں صرف چائے پیتی ہوں پھر گھر کے کام۔ میرا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے ہے۔ گھر میں مویشیوں کی ہر قسم موجود ہے۔ تو فرصت کم ہی ملتی ہے۔ لیکن جب بھی فری ہوتی ہوں پڑھتی ہی ہوں کچھ نہ کچھ۔''

س ''آپ کی خوبیاں؟''

ج ''آہم...... اپنے منہ سے کیا بتائیں۔ بہت ایکٹو، بہت پھرتیلی ہوں، گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر لیتی ہوں۔ میری دوست عظمیٰ کہتی ہے یار تم جس کام کو ہاتھ لگاتی ہو، لگتا ہے وہ ہوا پڑا ہے۔ حد سے زیادہ حساس ہوں، نماز روزے کی پابندی کرتی ہوں۔ سب کے ساتھ اچھے سے پیش آتی ہوں، مہمان نواز ہوں اور اپنوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔''

س ''آپ کی خامیاں؟''

ج ''یہ ہے نا مزے کا سوال، سوچتی بہت زیادہ ہوں۔ کوئی بھی بندہ مجھ سے بات کر رہا ہو، میں بہت توجہ، بہت چاہت سے سنتی ہوں اور جب میں بول رہی ہوں اور کوئی ان سنی کرے تو بہت غصہ آتا ہے۔ ویسے بھی غصے کی بہت تیز ہوں، کوئی اپنا ناراض ہو جائے تو فوراً پہل نہیں کرتی۔ ضدی بہت ہوں، اتنی کہ میڈیکل میں جانا میرا خواب تھا لیکن ایف ایس سی کے بعد ایسی ضد لگائی کہ آگے پڑھا ہی نہیں، میڈیکل تو دور کی بات (بس ایک شخص کی وجہ سے، وہ میرا ہو بھی نہ سکا اور میں اسے آج تک بھی نہ بھول سکی یہ سب سے بڑی خامی ہے)۔''

س ''سالگرہ مناتی ہیں؟''

ج ''نہیں ایسا کوئی رواج ہمارے گھر میں نہیں ہے، اس سال ۲۵ جولائی کو ۲۵ سال کی ہو جاؤں گی لیکن آج تک ایسا کوئی فنکشن نہیں دیکھا۔ ہاں ایک بار عظمیٰ نے کیک گھڑی اور وشز کارڈز بنا کے بھجوائے تھے تو بہت خوشی ہوئی تھی جو آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

شاعری میرا جنون ہے۔ میں خود بھی بہت اچھے اشعار، غزلیں، نظمیں وغیرہ لکھتی ہوں۔ سیکنڈ ایئر میں کالج کمپیٹیشن میں فرسٹ پرائز لیا تھا، اس بیت بازی میں سارے اشعار میرے اپنے تھے۔ کسی ادارے میں بھجوائے ہی نہیں بھی کہ ریجیکٹ نہ ہو جائیں اور نہ ہی اس ڈر سے کبھی خط لکھا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ مجھے ناکامی کی شرمندگی سے خوف آتا ہے۔''

میرے چند اشعار

آج کی شب پھر نہیں سوئی تیرے ہجر میں صحرا
اک اور رات بن گئی گواہ میرے عشق کی

☆☆

کیا ملا تیرے عشق میں سوائے ہجر کے صحرا
اک لذت فراق کی خاطر ساری عمر گنوا دی ہم نے

☆☆

چھوڑ کے جاتے جاتے بس وہ اتنا کہہ گیا صحرا
جو تڑپنے میں مزہ ہے ملنے میں کہاں

☆☆☆

س ''بارش کیسی لگتی ہے؟''

ج ''بارش میں دل بہت اداس ہو جاتا ہے، اچھی نہیں لگتی ہے۔ ہاں اگر زیر مطالعہ کوئی نئی کتاب ہو تو پھر بیٹھی رہتی ہوں بارش میں بھی۔ اب بارش میں افسانے لکھتی ہوں۔''

س ''پسندیدہ کتاب؟''

ج ''ایک مسلمان کی حیثیت سے تو قرآن پاک ہی، لیکن 100 عظیم اسلامی شخصیات کتاب بھی بہت پسند ہے۔''

pklibrary.com

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

چرغہ بریانی

اشیاء:

ثابت مرغی	ڈیڑھ کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
دہی	ڈیڑھ کپ
لیموں	ایک عدد
چاول	ایک کلو

ترکیب:

ثابت مرغی پر کٹ لگالیں۔ نمک لال مرچ، زردے کا رنگ، لہسن، ادرک، سرکہ، دہی، لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں، مرغی پر لگا کر تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

ایک دیگچی میں مرغی ڈال کر پکنے رکھ دیں مرغی کا پانی خشک ہونے پر نکال لیں۔ اس کے بعد تیل میں چرغہ فرائی کرلیں۔ چاولوں کو نمک ملے پانی میں ابال لیں۔ اب چرغے کے بچے ہوئے مسالے میں ابلے ہوئے چاولوں کو مکس کر کے اوپر چرغہ رکھ کر دم پر رکھ دیں۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

ملائی چکن گرین ہانڈی

اشیاء:

چکن	آدھا کلو
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہری مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
کریم	آدھا کپ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

پیالے میں کریم (کریم نہ ہو تو دودھ کی ملائی بھی استعمال کر سکتے ہیں)، پسا ہوا ہرا دھنیا، پسی ہری مرچ، لہسن ادرک، سفید مرچ اور نمک ڈال کر مکس کر لیں۔ چکن کی بوٹیوں کو اس آمیزے میں اچھی طرح ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے چکن کو آمیزے سمیت ڈال کر تل لیں۔ ڈھک کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ چکن گل جائے تیل الگ ہو جائے تو بھون لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

کانٹی نینٹل چکن

ضروری اشیاء:

چکن	ایک پاؤ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
تیل	تین کھانے کے چمچے
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
پسے ٹماٹر	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری پیاز	ایک کھانے کا چمچہ

pklibrary.com

ہری مرچ	ایک عدد
نوڈلز	دو کپ

ترکیب:

نوڈلز ابال لیں کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں کٹا ہوا لہسن اور ہری مرچیں ڈالیں۔ بغیر ہڈی کا چکن پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ اس کے بعد اس میں ریڈ چلی ساس، سویا ساس، ٹماٹو سوس، نمک ڈالیں اور ڈھک کر چھ سے آٹھ منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نوڈلز بچھائیں اس کے اوپر تیار کیا ہوا چکن کا آمیزہ رکھیں، ہری پیاز سے گارنش کر کے مزے دار کونٹی نینٹل چکن سرو کریں۔

تلے ہوئے چنے اور دالیں

ضروری اشیاء:

کابلی چنے	ایک پاؤ
دال مونگ یا دال چنا	آدھا کلو
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
لیموں	دو عدد
چاٹ مسالا	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:

کابلی چنوں اور دال کو الگ الگ بیکنگ پاؤڈر میں ڈال کر رات بھر پانی میں بھگو دیں۔ دوسرے دن چھان کر کسی اخبار یا کپڑے میں بچھا کر خشک کر لیں۔ کڑاہی میں گھی کو تیز آنچ پر گرم کریں۔

گھی جب گرم ہو جائے تو کابلی چنے ڈال کر تلیں۔ چنے جب ہلکے براؤن ہو جائیں تو ایک پیپر میں نکال لیں تاکہ گھی خشک ہو جائے۔ (چنوں میں اپنی پسند کا کلر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔)

اسی طرح دال بھی تلیں پھر چاٹ مسالا، لیموں کا رس، اور نمک ملا کر استعمال کریں۔ اس کو ڈبے میں بند کر کے استعمال کریں۔ مہینوں خراب نہیں ہوں گے۔

لب شیریں

اجزاء:

دودھ	ڈیڑھ کلو
کارن فلور یا ونیلا کسٹرڈ	دو سے تین کھانے کے چمچ
رنگین سویاں	آدھا کپ
چینی	حسب پسند
فروٹ کاک ٹیل	ایک ٹن چھوٹا والا
لال جیلی	ایک پیکٹ
ہری جیلی	ایک پیکٹ
بادام	حسب پسند
پستے	حسب پسند
اخروٹ	حسب پسند
فریش کریم	آدھا کپ

ترکیب:

دودھ کو ابال لیں۔ ابلتے ہوئے دودھ میں چینی اور رنگین سویاں ڈال دیں سویاں پک جائیں تو آدھا کپ ٹھنڈے دودھ میں کارن فلور یا کسٹرڈ گھول کر شامل کریں۔ اور مسلسل چمچ چلاتے رہیں جب کسٹرڈ گاڑھا ہو جائے تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔

ڈیڑھ کپ ابلتے پانی میں جیلی کا پیکٹ الگ الگ ڈال کر اچھی طرح حل کریں اور کسی برتن میں جما لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔

ٹھنڈے کسٹرڈ کو ایک بڑے پیالے میں نکال لیں۔ اس میں کریم مکس کریں۔ اچھی طرح کریم مکس کرنے کے بعد فروٹ کاک ٹیل، بادام، پستہ، اخروٹ سے سجا کر پیش کریں۔

☆☆

pklibrary.com

ادارہ

خوبصورت بنئے

موتی جیسے دانت

صاف چمکتے موتی جیسے دانت ہمارے چہرے کی خوب صورتی اور شادابی میں اضافہ کرتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کسی خوب صورت چہرے کی مسکراہٹ پر پیلے یا گدلے دانت نظر آتے ہیں تو چہرے کی مسکان کہیں کھو جاتی ہے۔

خواتین عام طور پر گھریلو کام کاج میں اتنا الجھ جاتی ہیں کہ دانتوں پر توجہ دینے کو بے مصرف سمجھتی ہیں۔ صاف چمکتے دانت نا صرف ہماری ظاہری خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں، بلکہ ہماری صحت کے لیے بھی بہت ضروری ہیں کیونکہ ہم اپنی غذا کو چبانے کے لیے ان ہی دانتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ گندے اور میلے دانت جراثیم سے بھرپور ہوتے ہیں جو نہ صرف ہماری غذا کو آلودہ کرتے ہیں، بلکہ ان سے پیدا ہونے والی بدبو بھی ہمارے پیاروں کو اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

دانتوں کی صفائی اور چمک کے لیے ذیل میں کچھ آسان سی تراکیب درج ہیں۔

ضروری نہیں کہ مہنگے ٹوتھ پیسٹ ہی ہمارے دانتوں کی صفائی کر سکتے ہیں، روزانہ صبح اور رات سونے سے قبل ذرا سے لاہوری نمک سے دانت صاف کیجیے۔

آدھا چمچہ سرسوں کے تیل میں تھوڑا سا نمک ملا کر رات کو دانتوں پر اچھی طرح لگا کر سو جائیں اور صبح اچھی طرح کسی ٹوتھ پیسٹ یا نمک سے دانت صاف کریں اس سے دانت سفید ہو جاتے ہیں۔

ایک چمچہ کھانے کا میٹھا سوڈا، تھوڑا سا نمک اور سہاگہ ملا کر کسی بوتل میں رکھ لیں۔ روزانہ اس سے دانت صاف کریں، دانتوں کی پیلاہٹ دور کرنے کے لیے مفید ہے۔

لیموں کے چھلکے سکھا کر پیس لیں اور اس میں نمک ملا لیں، روزانہ اس سے دانت صاف کریں۔ دانت چمک اٹھیں گے۔

لکڑی کے کوئلے کو باریک پیس کر اس میں تھوڑا سا نمک ملا لیں اور کسی بوتل میں بھر لیں۔ دانتوں کی صفائی کے لیے بہترین منجن ہے۔

دانتوں کی صفائی کے لیے ایک مجرب نسخہ اور سنت رسول مسواک ہے۔ صبح شام استعمال کریں یہ دانتوں کی صفائی اور مضبوطی کے لیے بہت مفید ہے۔

دانتوں کے ساتھ ساتھ، مسوڑوں کی ورزش بھی دانتوں کی مضبوطی کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے لیے دانت، منجن سے صاف کریں یا برش کریں انگلی سے اپنے مسوڑوں کو بھی صفائی کے انداز میں صاف کریں۔ چھوٹے بچے، جن کی عمر پانچ، چھ برس یا اس سے کم ہے اپنی نگرانی میں دانت صاف کروائیں اور کوشش کریں کہ ان کے ٹوتھ پیسٹ میں فلورائیڈ کی مقدار کم سے کم ہو۔ کیونکہ اس کی زیادہ مقدار دانتوں کی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

عام طور پر اشتہاروں میں دکھایا جاتا ہے کہ برش، بھر بھر کر ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں، درحقیقت ایک مٹر کے دانے کے برابر پیسٹ بھی آپ کے دانتوں کی صفائی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔

☆☆